قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

مئی 2018 قیمت 15₹

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

پانچویں عالمی کانفرنس کی تصویری جھلکیاں

اردو دنیا

ماہنامہ

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:20،شمارہ:05،مئی 2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

غلام نبی خیال — محی الدین زور کشمیری 8

کور اسٹوری

پانچویں عالمی اردو کانفرنس — حقانی القاسمی 11

نقد و نگاہ

جنوبی ہند کے عصری اردو ادب میں علاقائی اثرات — مہ نور زمانی بیگم 28

احمد یوسف اپنے افسانوں کے آئینہ میں — ایم نسیم اعظمی 32

پیغام آفاقی کی کتابوں کے انتساب — ثروت خان 36

لوک ادب: تحفظ اور بازیافت — یوسف رام پوری 38

مئی کے ماہ و انجم

اختر شیرانی کی رومانی شاعری — محمد نصر اللہ خان 41

مجنوں گورکھپوری کی افسانہ نگاری — ثاقب عمران 43

اردو زبان و ادب اور ٹیگور — عبدالرزاق زیادی 46

لسانی رشتے

ملیالم اور اردو — ریاض احمد 49

نیا آسماں نئے ستارے

سیماب اکبرآبادی کی تصنیف 'دستورالاصلاح' — مقیم احمد 52

عنوان چشتی کی غزل گوئی — اسما 55

سلسلۂ صحافت

اردو ادب کے فروغ میں ٹی وی کا حصہ — منظور احمد ملا 57

سائنس

تجاذبی لہریں — انیس الحسن صدیقی 61

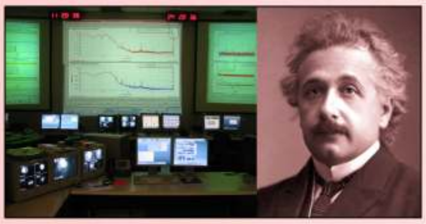

کمپیوٹر

ونڈوز 7 کو موافق بنانا 64

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 69

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ 78

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 80

ہماری بات

کتابوں میں ماضی کی تہذیب، تاریخ، آداب زندگی اور دیگر چیزیں محفوظ ہیں۔ کتابوں سے ہی تہذیبوں نے ارتقائی سفر طے کیا ہے اور سائنسی، سماجی، تکنیکی ترقیات بھی کتابوں ہی کی دین ہیں۔ کتابوں میں حیات کی حرارت بھی ہے اور کائنات کا شعور بھی۔ کتابوں سے تہذیب کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مہذب معاشرے میں کتابوں کی اہمیت تسلیم کی جاتی رہی ہے اور مصنّفین کو اعلیٰ مقام دیا جاتا رہا ہے مگر ہمارے عہد کا المیہ یہ ہے کہ ہم کتابوں سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ مادّی معاشرے میں کتابوں سے جس طرح رشتہ ٹوٹا ہے وہ یقیناً صرف معاشرت کے لیے نہیں بلکہ تہذیب وثقافت کے لیے بھی تشویشناک ہے۔ یہ مفکرین اور دانشوروں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے مفکرین اور دانشور کتابوں کی طرف لوگوں کو راغب کرنے کے لیے مختلف طرح کے ذرائع استعمال کررہے ہیں۔ کتاب میلوں کا انعقاد، کتاب شناسی کے پروگرام اور کتاب سے جڑی ہوئی دیگر تقریبات اِسی سلسلے کی کڑی ہیں۔

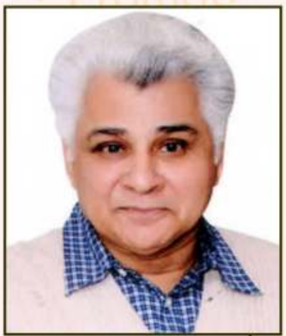

قومی اردو کونسل نے بھی کتابوں سے عوام وخواص کا رشتہ جوڑنے کے لیے کئی طرح کے طریقے استعمال کیے ہیں۔ مفید اور کارآمد کتابوں کی اشاعت کے علاوہ موبائل وین کے ذریعے جہاں ہندوستان کے طول وعرض میں کتابوں کی تشہیر اور فروخت کا سلسلہ جاری ہے وہیں کونسل ہر سال ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کتاب میلے کا انعقاد کرتی ہے اور اس کے لیے خاص طور پر ان علاقوں کو شامل کیا جاتا ہے جہاں زبان وادب کے شیدائیوں کی کثرت ہے۔ مگر کتابوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے شائقین بہت سی اہم کتابوں کے مطالعے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کونسل کتاب میلے میں ہندوستان بھر کے ناشرین کو مدعو بھی کرتی ہے اور یہ ناشرین مختلف موضوعات پر اپنی کتابوں کا ڈِسپلے کرتے ہیں۔ اِس طرح کتابوں کی رسائی ان عام قارئین تک بھی ہوجاتی ہے جو کتابوں کے لیے دور دراز علاقوں کا سفر کرتے ہیں مگر کتابوں کے حصول میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں صرف ایک کتاب کی جستجو میں لوگ میلوں کا سفر طے کرتے تھے، لائبریریوں کی خاک چھانتے تھے۔ اچھی اور عمدہ کتابوں کے لیے وہ ہر طرح کی اذیتیں برداشت کرتے تھے مگر اب ٹیکنالوجی کی وجہ سے اتنی سہولت ہوگئی ہے کہ اب گھر بیٹھے نادر ونایاب کتابوں کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی نے کتابوں کے حصول کے راستے آسان کردیے ہیں۔ ہند اور بیرونِ ہند بہت سی ویب سائٹس ہیں جن پر ہر ذوق اور سطح کی نادر ونایاب کتابیں موجود ہیں۔ علوم وفنون اور ادبیات کا بیش قیمت ذخیرہ محفوظ ہے۔ رسائل وجرائد کی ایک بڑی تعداد بھی ہے۔ یہ سب فیض ہے اس ٹیکنالوجی کا جس کی وجہ سے اب ساری دشواریاں سہولتوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ قومی اردو کونسل نے بھی eKitaab کے ذریعے ان مطبوعات تک رسائی کی راہ آسان کردی ہے جن کے حصول میں قارئین کو پہلے بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ قومی اردو کونسل نے ایک ایسا اردو ای پب ریڈر تیار کیا ہے جس پر کونسل کی کتابیں ای پب فارمیٹ میں آسانی کے ساتھ ڈاؤن لوڈ کرکے پڑھی جاسکتی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ان کتابوں تک ہندوستان سے باہر رہنے والوں کی رسائی آسان ہوجائے گی۔ این سی پی یو ایل کی تقریباً ہزار سے زائد کتابیں نستعلیق خط میں لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ کونسل نے اس ایپ میں بہت ساری ایسی چیزیں شامل کی ہیں جو دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔ اس ایپ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ذولسانی ہے اور اس میں الفاظ کے معانی دیکھنے کی بھی سہولت ہے۔ اس میں آن لائن سہ لسانی لغت (اردو ہندی اور انگریزی) بھی ہے۔ متن کا سائز گھٹا اور بڑھا بھی سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت ساری خوبیاں ہیں، یقیناً اس سے صرف ہندوستان کے اردو داں طبقے کو ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں مقیم اردو کے شائقین کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ کونسل کی یہ کوشش ایسی ہے جس کی ستائش بہت سے اربابِ فکر ونظر نے کی ہے مگر کونسل کی منزل صرف یہی ایپ نہیں ہے بلکہ اس سے آگے بھی بہت سے مقامات ہیں جو کونسل طے کرنا چاہتی ہے۔ کونسل عصری ٹیکنالوجی کی تمام تر سہولیات کا استعمال اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اس سلسلے میں یقیناً ماہرین کے مشورے اور تجاویز پر بھی غور کیا جائے گا اور اردو زبان وادب کے فروغ کی جتنی بھی ممکن شکلیں ہوسکتی ہیں ان کو بروئے کار لایا جائے گا۔ امید ہے کہ اردو دنیا اس ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کرے گی اور قومی اردو کونسل کی اس کاوش کو ستائش کی نگاہ سے دیکھے گی۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

✍ 'ہماری بات' میں آپ نے اس بار ہمارے دل کی بات کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔ بقول غالب:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اردو زبان و ادب کے فروغ کا سفر تو بے شک تدریسی ذرائع کے ساتھ ساتھ مشاعروں، مذاکروں، سیمناروں اور لسانی مظاہروں کی صورت میں جاری و ساری ہے لیکن اردو کا مسئلہ جوں کا توں آج بھی دوراہے پر سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہوا ہے۔ خاص طور پر بقول آپ کے ان علاقوں میں جو اردو کے لیے زرخیز ہیں مگر وسائل کی دسترس اور مسائل کے حل سے محروم ہیں۔ مانا کہ اردو پڑھائی لکھائی مساجد کے مکتب صغریٰ سے شروع ہوتی ہے اور ہائی اسکول کے اسناد اور کالج کی ڈگریوں تک پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کا لبادہ اوڑھ کر اردو کے علم بردار ٹیچر لکچرر اور پروفیسر کی صورت میں محض تنخواہیں اور وظائفی سطح تک رسائی حاصل کرکے نیم مردہ ہو جاتی ہے۔ اور بیچاری اردو اس موڑ پر بھی اپنے ڈھیر سارے مسائل لیے حسرت کی نظروں سے اپنے نام نہاد ہمدردوں کو تکتے ہوئے یہ امید لیے بیٹھی ہے کہ یہ لوگ اس کی امید بر لائیں گے۔

اس ضمن میں کافی سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کتابوں کا مطالعہ تو قریب قریب دم توڑ چکا ہے مگر نگار اردو Social Media سے تو آج بھی جڑی ہوئی ہے۔ اب ہمارا فریضہ ہے کہ اردو اداروں، انجمنوں اور اردو تنظیموں کو Computerized کرکے اردو کے فروغ کو عالمی سطح سے جوڑیں اور اس کی پرورش و پرداخت کو ایک نیا موڑ دیں۔

تازہ شمارے کے انتخاب نگارشات میں شمس بدایونی

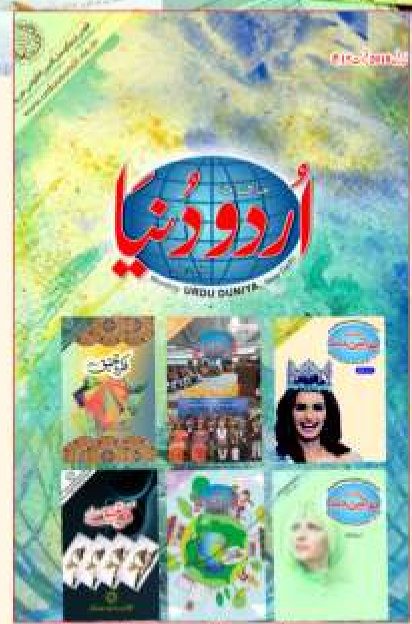

کی سرسید شناسی، شمع اختر کاظمی کی واجدہ تبسم کی معتوب افسانوی شخصیت پر خیال آرائی کے علاوہ رضوانہ پروین کی فلمی آئینہ گری، اسلم جمشید پوری کے جائزے 'یادِ رفتگاں' اور نقد و نگاہ کے گوشے مرکوز بصیرت مطالعہ ثابت ہوئے۔

❖ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی، تمل ناڈو

✍ اردو دنیا مارچ کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ تمام مشمولات معیاری نیز معلوماتی ہیں۔ اس ماہ آپ نے اردو معاشرے کو ادبی رواداری کا پیغام دیا ہے۔ بلاشبہ اگر ارباب علم و دانش کے آپسی اختلافات ختم ہو جائیں تو ان شاء اللہ اردو کو درپیش سارے مسائل حل ہو جائیں۔ خدا کرے کہ آپ کی بات اردو والوں کے دلوں میں اتر جائے۔

مذکورہ شمارے میں اسلم جمشید پوری صاحب کا مضمون: '2017 کا فکشن اور فکشن تنقید' خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فنی نقطہ نظر سے حقائق پر مبنی بڑا ہی وقیع جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ مثالی جائزہ موصوف کی دروں بینی نیز اعلیٰ ادبی اقدار کا مظہر ہے۔ اردو دنیا علمی ادبی تحقیقی مجلّہ ہے جو اردو کی آبیاری کا اہم فریضہ انجام دے رہا ہے۔ یہ سب کونسل کی بہترین کارکردگی نیز اعلیٰ خدمات کا ثمرہ ہے۔

❖ **سلیم خان**: ملت نگر، فیض پور، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' مارچ کا شمارہ حسب سابق دیدہ زیب سرورق اور معیاری مشمولات سے مزین ہے۔ اس شمارے میں محترمہ رضوانہ پروین نے ادب و فلم کے تناظر میں شہرۂ آفاق شاعر ساحر لدھیانوی کی ادبی خدمات کا معقول جائزہ لیا ہے اور موصوف کی انفرادیت کی خط کشی کی کہ ساحر نے اپنی شاعری میں کہیں بھی اپنے تخلص ساحر کا استعمال کرکے اپنے غرور کو ہویدا نہیں کیا ہے۔ محمد مستمر کا مضمون نفسیاتی تغیرات کے سماج و ادب پر پڑنے والے مختلف اثرات کی جاندار و شاندار نشان زدگی کرنے والا ہے۔ اس محنت طلب و سنجیدہ مقالے میں اگر اثرات کی مثالیں اور زیادہ ہوتیں، تو مزید بہتر ہوتا۔ فقط لسانی سطح پر 'ذہن و دماغ' جیسے مترادف الفاظ کا تصرف درکار نہ تھا۔ اسی طرح ص 45 پر ہیملٹ اور شیکسپیر' کا ادب' درج کرنا یکسر غلط اس لیے ہے، کیونکہ ہیملٹ 'تو شیکسپیر کے ایک مشہور ڈرامے کا نام ہے۔ ویسے اس مقالے میں نفسیات سے متعلق 'فوق الانا' (Super Ego) کی مانند صحیح اصطلاحات سے ایک عام قاری کی واقفیت میں اضافہ ہوگا۔

اگر کسی بھی کتاب کے تبصرے کی مثال دیکھنی ہو، تو مرتبہ محترمہ رضیہ پروین کی اکبر الٰہ آبادی کی حیات و شاعری پر مبنی کتاب 'تلاش' کی بابت ڈاکٹر ریحان حسن کا تجزیہ تحقیقی و دیدنی ٹھہرتا ہے۔ اس میں درج کیا گیا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی کوٹھی کا نام اسی شاعر نے رکھا تھا، جبکہ اکبر الٰہ آبادی کے اپنے دولت خانے کا نام 'عشرت منزل'

تھا، اسی کا ترجمہ کر کے نہرو جی نے 'آنند بھون' نام رکھ کر قومی یک جہتی کا ایک ثبوت فراہم کیا تھا۔

اس شمارے میں نئی دہلی میں منعقد مشاعرے میں شعرا کے پیش کیے گئے تمام تر اشعار اگرچہ معیاری ہیں، تاہم سریندر شجر کے اشعار سبق آموز ہیں۔

پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے اشعار

آسماں اتنی بلندی پہ جو اتراتا ہے
بھول جاتا ہے، زمیں سے ہی نظر آتا ہے

اور

لہراتی بل کھاتی چڑیا ہوا سے کہتی لگتی ہے
اڑنے پر آؤ تو دنیا کتنی چھوٹی لگتی ہے

کلی طور پر ایک ہی شمارے میں گویا بموجب ضرب المثل 'کوزے میں سمندر بند' کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک: کوٹھی نمبر A-201، گلی نمبر A-18، گورو نانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' مارچ کا رسالہ مئو سے خریدا۔ ڈاکٹر حنیف ترین سے غلام نبی کمار نے جو انٹرویو لیا ہے، بہت بہتر ہے۔ بنگال میں اردو صحافت مضمون بہت معلوماتی ہے، عبدالحی صاحب نے عالمی کتاب میلے کے کل ہند مشاعرے کی روداد اشعار کے حوالے سے جو پیش کی بہت اچھی ہے۔ لائبریری کی اہمیت کے سلسلے میں اداریہ کافی اچھا ہے، مبارکباد قبول فرمائیں۔

انصار احمد معروفی: مئو، اتر پردیش

'اردو دنیا' مارچ 2018 اپنی سابقہ آن بان کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ اس میں اردو کے فروغ کے لیے سنجیدگی سے معمولی مسائل پر بھی غور کرنے کی مستحسن دعوت دی گئی ہے۔ اس کے لیے ہمیں فرداً فرداً یہ سمجھانا پڑے گا کہ جو الفاظ جو مکالمے آپ ادا کر رہے ہو وہی اردو ہے جو ہندوستان کی اپنی زبان ہے۔ ہندوستان کی میراث ہے اور المیہ یہ ہے کہ آپ اس کا نام تک لینے سے کتراتے ہیں۔ آپ بول تو سکتے ہیں پر لکھ نہیں پاتے۔ مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی پر بڑا اچھا مضمون لکھا گیا ہے لیکن اس ضمن میں دشواری یہ ہے کہ لڑکیوں کی بہت حفاظت کرنی پڑتی ہے اور یہ ذمے داری متعلقہ خاندان اور کامل سماج پر عائد ہوتی ہے۔ ساحر لدھیانوی پر اس لحاظ سے اچھا مضمون ہے کہ یہ زبان و بیان اور ادبیات کے تناظر میں لکھا گیا ہے مگر اپنے اختصار کی بنا پر یہ تشنہ لگتا ہے۔ پروفیسر وہاب قیصر نے عہد آصف جاہی میں سائنس اور ٹیکنالوجی، تحقیق و ترقی کے تناظر میں درحقیقت بہت عمدہ مضمون تحریر کیا ہے جس میں فلکیاتی مشاہدات سے لے کر کیمیاوی اشیاء کی تیاری جیسے زندگی سے مربوط کوئی نو مسائل کو حل کرنے کے لیے مختلف تجربات و تحقیقات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ پیش کش اور طرز ادا ایسی دلچسپ ہے کہ ایسے خشک مضمون میں دلچسپی آخری لفظ تک برقرار رہتی ہے۔ دل یہ چاہے گا کہ آگے بھی بس پڑھتے ہی رہیں۔ بلاشبہ یہ مضمون حاصل شمارہ ہے۔ عقل دنگ ہے کہ اس مضمون کی اساس کا اتنا مستند ماخذ فاضل مصنف کو آخر کہاں سے دستیاب ہوا۔ اردو تدریس و ٹکنالوجی پر دیا گیا مضمون بہت خوب ہے۔ نئی دہلی کے پرگتی میدان میں منعقدہ عالمی میلے میں کل ہند مشاعرے کی رپورٹ پیش کی گئی ہے۔ رپورٹ مختصر مگر عمدہ ہے لیکن اشعار اپنا رنگ نہ جما سکے۔ خبرنامہ کے ذیل میں لیگل پینل میٹنگ کی روداد درج ہے جس میں پروفیسر ارتضی کریم کا احساس ہے کہ قانونی اصطلاحات کی آسان تفہیم و تعبیر کی ضرورت ہے۔ یہ بیان ماہرین کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

مصطفی ندیم خان غوری: اورنگ آباد، مہاراشٹر

اردو زبان کے ساتھ صرف اس کے فروغ اور بقا کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ بہت سارے اور مسائل پڑے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر ان علاقوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کا مسئلہ ہے جو اردو کے لیے زرخیز تو ہیں مگر ان کے پاس وسائل نہیں۔ یہ بات بالکل سچ ہے۔ حیدرآباد دکن اردو کی بقا اس کی ترقی اور ترویج کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہا۔ پہلی اردو جامعہ 'جامعہ عثمانیہ' دارالترجمہ کا قیام اور اردو سے پیشہ ورانہ کورسس بی یو ایم ایس اور انجینئرنگ کی تعلیم بعید از قیاس ہے۔ اب ان علاقوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کا مسئلہ ہے۔ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نزع کے عالم میں ہے۔ اس شہر اردو سے صرف ایک رسالہ 'سب رس' نکلتا ہے۔ اس کے علاوہ رنگ و بو اور پروانہ دکن ادبی رسالے ہیں۔ خوشبو کا سفر کا اپنا ایک الگ مزاج ہے۔ بلکہ جس طرح سے دہلی سے ادبی معیار کے رسالے 'اردو دنیا' 'فکر و تحقیق' 'خواتین دنیا' 'بچوں کی دنیا' 'ایوان اردو' 'آجکل' 'سائنس' سائنس کی دنیا وغیرہ نکلتے ہیں۔ اس نہج کا کوئی رسالہ نہیں نکلتا۔ قومی اردو کونسل تقریباً سبھی لائبریریوں کو مختلف رسالے اور کتابیں روانہ کرتی ہے وہ عوام کے بجائے صدر یا سکریٹری کی میز پر یا دراز میں رہتے ہیں۔ ہر سال سروے کروائیں کہ کیا لائبریری کے لوگ اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ آپ کی کوششیں لائق تعریف ضرور ہیں مگر ریاستی سطح پر اور ضلعی سطح پر ہمیں اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے کام کرنا چاہیے اس کے لیے ریاستی اردو اکادمیاں، انجمن ترقی اردو آگے آئیں۔ اور اردو کے مسائل کو حل کریں۔

ایم کاویانی نے 'مومن' پر بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ اور جس انداز سے انھوں نے دلیلیں دی ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مومن کو اہمیت دینے کی وجہ کیا تھی۔ اس ماہ کے مشمولات خوب ہیں۔

ڈاکٹر م۔ق۔ سلیم: صدر شعبۂ اردو شاداں کالج، حیدرآباد

'اردو دنیا' کا ہر شمارہ وقت کے ساتھ ساتھ خوش نما اور خوش طبع و ایک منفرد ادبی جریدہ کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے، مجھے ہر مہینے اردو دنیا کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے، کئی دفعہ اپنی آرا سے آپ کو مطلع کرنے کو سوچتا ہوں لیکن کچھ مصروفیات یہ کرنے نہیں دیتی تھیں، لیکن آج وقت نکال کر یہ کام اولین فرصت میں کرنے کا ارادہ کیا، ماہ فروری کے شمارہ میں سولاپور کے اردو کتاب میلے کی روداد عبدالحی صاحب نے اس انداز سے لکھی ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، نظمیں کتاب میلہ اور اردو کتاب میلہ بھی پسند آئیں، جناب فصیح الدین احمد کی تصنیف 'السنہ عالم کے مختلف خاندانوں کا مختصر تعارفی جائزہ' ایک ایسا مضمون ہے جو بہت کارآمد اور قابل تعریف ہے دیگر مشمولات بھی بہترین ہیں، ماہ مارچ کا اردو دنیا بھی اپنی ادبی آب و تاب برقرار رکھے ہوئے ہے۔ خاص کر ڈاکٹر حنیف ترین صاحب سے انٹرویو، سرسید کے خطابات، واجدہ تبسم پر مضمون اور ساحر لدھیانوی ادب اور فلم کے آئینہ میں دیگر سارے مشمولات بھی قابل مطالعہ و قابل تعریف ہیں، مجھے ہر مہینہ رسالہ باقاعدگی سے موصول ہوتا ہے، ہر رسالے کا اداریہ بھی بہت خوب اور غور طلب ہوتا ہے جو آپ کی لگن اور کاوشوں کا غماز ہے، آپ نے جو اردو دنیا کا خاص اردو نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے اس کے لیے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس

میں کامیابی عطا کرے۔ آمین، ویسے اردو دنیا کا ہر شمارہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی اردو زبان کے تئیں یہ محنت و لگن اور کاوشیں ان شاء اللہ ضرور بار آور ہوں گی، یہ میرا یقین ہے۔

رفیق ابراھیم پر کار: مقام پوسٹ کرجی، اشیت محلہ، رتنا گیری

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ 'اردو دنیا' دستیاب ہوا۔ میرے ذریعے لیے گئے انٹرویو 'معروف نغمہ نگار یوگیش سے ایک ملاقات' میں کمپیوٹر کی وجہ سے ایک غلطی نظر آئی۔ صفحہ 12 کے دوسرے کالم میں تیسری سطر میں کلیان جی آنند جی کا 'ہنستا ہوا نورانی چہرہ' شائع ہوگیا ہے جبکہ یہ نغمہ 'ہنستا ہوا نورانی چہرہ' لکشمی کانت پیارے لال کی موسیقی میں ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس انٹرویو کے لیے ممبئی اور سارے ہندوستان سے فون اور میسیج مبارکباد کے موصول ہوئے جن میں خاص ہیں بلراج بہل رائے پور چھتیس گڑھ، ڈی ایس گورونک دار جلنگ، مصطفےٰ احمد جموں وکشمیر، نورالبشر اعظم گڑھ، ڈاکٹر شاہد جمیل پٹنہ اور نغمہ نگار ڈاکٹر معظم عزم ممبئی وغیرہ اس سے ہندوستان بھر میں اردو دنیا کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

21 فروری کو یوم عالمی مادری زبان کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس کی مناسبت سے اردو دنیا کا سرورق بہت خوبصورت بن پڑا ہے۔ سرورق پر بہت سی زبانوں کے رسم الخط کو دیکھ کر اچھا لگا جن میں دیوناگری، بنگلہ، پنجابی، گجراتی، تمل، تیلگو اور عربی کے رسم الخط نمایاں ہیں۔ کئی زبانوں نے دیوناگری رسم الخط کو اپنا لیا ہے جیسے ہندی، میتھلی، مراٹھی وغیرہ لسانیات پر ایک مضمون السنۂ عالم کے مختلف خاندانوں کا جائزہ، فصیح الدین صاحب کا بہت اچھا ہے جو کہ میں بھی کئی زبانوں سے واقفیت رکھتا ہوں اس وجہ سے لسانیات پر جو مضامین ملتے ہیں اس کو شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس سے نئے دریچے وا ہوتے ہیں لسانیات پر کچھ اور مضامین پڑھنے کی تشنگی باقی رہ گئی۔ صرف ہندوستان کی زبانیں اور رسم الخط پر ایک بھرپور مضمون اگر ہو تو شائع کریں۔ مادری زبان پر اداریہ بھی اچھا لگا۔ مادری زبان کی اہمیت پر اداریے میں اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے اور روزی روٹی سے زبان کو جوڑنے کی بات تو بہت اہم ہے اس پر پیش رفت ہونی چاہیے۔ قومی اردو کونسل کا اکیسواں کل ہند اردو کتاب میلہ عبدالحئی صاحب نے بڑی محنت سے تیار کیا ہے۔ چھوٹی بڑی ساری باتوں کا احاطہ کیا ہے۔ ہمارے اپنے شہر بھیونڈی کا کتاب میلہ ابھی تک نظروں کے سامنے ہے۔ اردو کتابوں کی فروخت

کا ریکارڈ پڑھ کر پتہ چلا کہ ہمارا شہر بھیونڈی، مہاراشٹر خریداری کے حساب سے دوسرے نمبر پر ہے۔ ایک کروڑ بارہ لاکھ روپے کی کتابیں یہاں خریدی گئیں۔

صدر عالم گوھر: 1138، اعظمی نگر، نالا پار بھیونڈی، مہاراشٹر

'اردو دنیا' فروری 2018 کا شمارہ ہاتھوں میں آیا۔ پڑھ کر دل مسرت سے لبریز ہوگیا۔ تمام تر مضامین کافی دلچسپ ہیں۔ مجلّہ کی خوبصورت طباعت، سرورق خوب اچھے لگے اور مضامین کافی پسند آئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب طرز ادیب وخطیب۔ میں جا رہا ہوں میرا انتظار مت کرنا انور جلال پوری، مولانا عبدالسلام ندوی، اخبار 'وکیل' امرتسر اور انٹرویو اور ہماری بات چیت، بہت ہی معیاری ہیں۔

مسعود اشرف منظور عالم: جامعہ امام ابن تیمیہ، بہار

اردو دنیا کا شمارہ ملتے ہی دل میں عجیب سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ 'ہماری بات' ہمیشہ کی طرح لاجواب اور دلچسپ ہے۔ 21 فروری کو 'یوم عالمی مادری زبان' منایا گیا لیکن اس دن کو کس طرح مناتا ہے؟ اسکولوں میں کون سی سرگرمی ہونی چاہیے؟ سماج اور معاشرے میں اس دن کی اہمیت اور افادیت کس طرح اجاگر کرنا چاہیے؟ مادری زبان کی بقاء اور نئی نسل میں اپنی زبان کے تئیں دلچسپی اور لگاؤ کس طرح برقرار رکھا جائے؟ ان تمام باتوں کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔

یوگیش جی کا انٹرویو بہترین رہا۔ 5 صفحات کے باوجود تشنگی باقی رہی۔ ان کے دوست ستیہ پرکاش 'ستو' کی دوستی پر رشک آیا۔ سولا پور کا اکیسواں کل ہند اردو کتاب میلہ کامیاب رہا۔ عبدالحئی صاحب نے روداد ایسی قلم بند کی کہ سارے مناظر سامنے آگئے۔ تصاویر اور تاثرات سے گماں ہوتا ہے ہم خود وہاں موجود ہوں۔ علی عباس حسینی ایک عمدہ افسانہ نگار ہیں۔ اس شمارے میں اور بھی بہت سارے افسانوں اور تخلیقات کو جاننے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کا ایک نیا پہلو خیال انصاری نے پیش کیا۔ شاہد حسین صاحب کے 'دبستان لکھنو اور اردو ڈراما' میں 'پری' اور 'پری خانہ' اصطلاح کی معلومات پسند آئی۔ اس مضمون میں واجد علی شاہ کی ڈرامائی سرگرمیاں اور تصانیف کی عمدہ اور جامع معلومات دستیاب ہوئیں۔ راس لیلا اور رہس کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ سید آغا حسن امانت لکھنوی کا واقعہ بھی کافی دلچسپ رہا۔

اخبار 'وکیل' کی آج بھی ضرورت ہے تاکہ قانون اور معلومات عامہ سے آگاہی ہو سکے۔ اوم پرکاش سونی سے گذارش ہے کہ اخبار 'وکیل' امرتسر کے جو شمارے دیمک کا رزق بن رہے ہیں انھیں اسکین کر کے محفوظ کرلیں اور شوشل میڈیا پر شیئر کر دیں۔ رؤف خیر صاحب نے خداداد خاں مونس کی شخصیت اور ادبی خدمات پر کافی اچھا مضمون لکھا ہے۔ قطعہ، تاریخ اور فن ابجد پر جامع بات لکھی ہے۔ نئی نسل کے تعلق سے جو فکر انھیں ستا رہی ہے وہ سچ میں دُکھی کرنے والا احساس ہے۔ اس سمت سوچنا ہوگا۔

2 جنوری 2018 کو انور جلال پوری کے انتقال کی خبر سن کر صدمہ ہوا۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین! موصوف ناظم مشاعرہ کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان اور شاعر بھی تھے۔ محمد یاسین گنائی صاحب نے 'پھولوں' پر بہترین اشعار کو منتخب کیا ہے۔ مقصود احمد انصاری نے فنون لطیفہ پر جو ہندوستانی رقص کی معلومات کو جمع کیا ہے وہ بڑا عرق ریزی والا کام ہے۔ طالب علموں اور اساتذہ کو ایک جگہ ہی تمام طرز رقص کے تعارف اور کیفیات مل جائیں گی۔

محمد شاہد رضا صاحب نے NGO'S کے تصور پر اور ان کی خدمات کی فراہمی پر اطمینان بخش روشنی ڈالی ہے۔ جہاں غیر سرکاری تنظیمیں سماجی خدمات اور سماجی تبدیلی کر رہی ہیں وہیں دوسری طرف کچھ فرضی NGO'S صرف فنڈ جمع کر کے اپنا الو سیدھا کر رہی ہیں۔ ایسے کتنے NGO کو حکومت نے بند کر دیا تھا۔ کمپیوٹر کی ونڈوز کی قسط وار معلومات Basic functions اور بنیادی باتیں سمجھنے میں مدد کر رہی ہیں۔ یہ اردو دنیا کی ایک بہت اچھی پہل ہے۔

نوشاد علی ریاض احمد: 416، بدھا کالونی کرلا ممبئی

محی الدین زور کشمیری

کشمیری میری منکوحہ اور اردو محبوبہ ہے

غلام نبی خیال

ہم عصر دور میں 'کشمیریات' کے سب سے بڑے تر جمان ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک معتبر قلم کار اور دانشور غلام نبی خیال کی پیدائش سرینگر کے ایک گنجان علاقے حول میں 4 مارچ 1939 کو ہوئی۔ ان کا خاندان کشمیر کی روایتی دستکاری پشمینہ سازی کا کاروبار کرتا تھا، لیکن غلام نبی میر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے ، اس لیے وہ اپنے خیالات کا بھر پور اظہار اُردو، کشمیری اور انگریزی میں کرنے لگے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد انہیں ریڈیو کشمیر سرینگر اور جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سر ینگر میں نوکریاں مل گئیں، لیکن وہ زیادہ دیر تک ان نوکریوں پر ٹک نہ سکے اور پہلے کشمیر کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اس کے بعد صحافت کے میدان میں آتے گئے ، جہاں ریاستی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کام کر کے نام حاصل کیا۔ پرائیویٹ طور پر جموں و کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔ اے اُردو کیا۔

کشمیر یونیورسٹی میں جب ماس کمیونکیشن یعنی صحافت کا شعبہ منظور الامین کی سربراہی میں قائم کیا گیا، تو خیال صاحب کو وہاں وزیٹنگ پروفیسر رکھا گیا۔ خیال صاحب کل وقتی طور پر قلم کار ہیں اور ایک ساتھ متعدد زبانوں پر ماہرانہ دست رس انہیں حاصل ہے۔ مختلف چینلز سے وہ وابستگی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسٹیج پر آکر اپنی تقریر کے ذریعے علم و ادب کے نئے نئے دروازے واکرتے ہیں۔ ان کے مضامین مقالے اور ادب پارے تواتر سے ملکی اور بین الاقوامی رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کم از کم ہر سال ان کی ایک کتاب منصّہ شہود پر آجاتی ہے۔ خیال صاحب کو مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے بڑے بڑے انعامات اور اعزازات سے نوازا۔ برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال نے ڈاکٹر رفیق احمد بانڈے کو غلام نبی خیال کی ادبی خدمات کے موضوع پر اُردو میں Ph.D کی ڈگری تفویض کی۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوچکاہے۔ خیال صاحب پر کئی مضامین لکھے گئے ، اُمیدہے کہ ان کی کشمیری اور انگریزی خدمات پر بھی آگے جامعات میں تحقیقی و تنقیدی کام ہوگا۔ فی الحال یہاں پیش ہے ،ان سے روبرو ایک مکالمہ:

محی الدین زور کشمیری: اپنی ادبی زندگی کی شروعات اور اس پس منظر کے بارے میں جانکاری دیجیے، جو آپ کی تحریروں کے محرکات بنے۔

غلام نبی خیال: میری اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1954 سے ہوا اور یہ سفر اب تک جاری ہے۔ اس دوران میں نے اردو، کشمیری اور انگریزی میں بتیس تصانیف تخلیق کیں، جن میں سے کئی ایک کو انعامات واعزازات سے نوازا گیا ہے، جن کی تعداد دو درجن کے قریب ہے، مگر ان میں سے صرف ساہتیہ اکادمی (1975)، جموں وکشمیر سرکار کے سب سے بڑے اعزاز (2013) اور بہار اردو اکادمی (2013) کے انعام کا ذکر خصوصیت کا حامل ہے۔

م ز ک: آپ شروع شروع میں ترقی پسندی کے زبردست حامی رہے۔ یہاں تک کہ اس موضوع کے حوالے سے آپ کی ایک مایہ ناز تصنیف انگریزی زبان میں بھی ہے اور آج بھی کہیں کہیں آپ کی تحریروں میں وہی احتجاج کی زیریں لہر ہمیں نظر آجاتی ہے، مگر کبھی کبھار آپ کے یہاں نرم لہجہ بھی نظر آجاتا ہے۔ آپ کی ترقی پسندی باقی لوگوں سے یا اس کے بنائے گئے سانچے سے کیوں مختلف ہے۔ کیا آج کے دور میں ترقی پسندی کی کوئی معنویت ہے یا ایسی چیزیں بے معنی ہی ہیں۔

غلام نبی خیال: میری ادبی زندگی کا آغاز ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستگی کے ساتھ ہی ہوا، لیکن جیسا کہ اسے چند تنقید برائے تنقید کرنے والوں نے سیاست سے وابستہ کیا۔ وہ غلط تاویل ہے۔ ترقی پسندی ادب کو

انسانی زندگی سے قریب تر کر کے اسے یہ عندیہ دیتی ہے کہ زندگی جاودانی اور لا زوال ہے، جبکہ موت اس کے سامنے ہیچ ہے۔ موت ایک حقیقت ہے، مگر زندگی نہیں ہے۔ ترقی پسندی کا فلسفہ موت پر زندگی کو ترجیح دیتا ہے، کیونکہ زندگی فنا نہیں ہوتی۔ یہ ہر حال میں موجود رہتی ہے۔ سرما کی آمد کے ساتھ درختوں سے پھل پھول غائب ہوجاتے ہیں اور چھوٹے پودوں کا تو نام ونشان تک مٹ جاتا ہے، مگر آمدِ بہار کے ساتھ ان میں زندگی کی حرارت پھر سے پیدا ہوتی ہے اور پیڑوں کی برجستگی اور شادابی بار دگر جلوہ نما ہوجاتی ہے۔ یہی ترقی پسندی ہے اور میں آج بھی اسی گام پر عمل پیرا ہوں۔ ثانیاً یہ کہ کشمیر میں جو اہل قلم اس تحریک سے وابستہ رہے، صرف وہی نام کما سکے۔ ان کے بعد کسی اور شاعر یا ادیب کو ایسا شہرہ یا قبول عام نصیب نہیں ہوسکا۔

م ز ک: اکثر و بیشتر ادیب کسی ایک زبان میں لکھتے ہیں۔ دوسری زبان کو یا تو وہ شجرِ ممنوعہ سمجھتے ہیں، یا اس معاملے میں وہ اپاہج بن جاتے ہیں، مگر آپ کے ہاں اُردو، انگریزی اور کشمیری کا توازن ہمیشہ برقرار رہا، اس کے پیچھے کیا راز ہے۔

غلام نبی خیال: میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ایک ادبی تخلیق کار، جس زبان میں اپنے جذبات اور محسوسات کو پُر اثر انداز میں بیان کر سکے اُسے اظہارِ خیال کے لیے اُسی زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن خیال رہے کہ اظہار ایسا ہو کہ بقول غالب:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پھر بھی میری نظر میں خیالات کا برمحل اظہار مادری زبان میں ہی ہوسکتا ہے۔ میں اردو میں بھی لکھتا ہوں، کیونکہ یہ ہماری محبوب زبان ہے اور اس کی دل نشینی اور خوبصورتی سے انکار کفر ہے۔ میں یہاں فیض کا ایک مقولہ اپنے انداز میں پیش کر کے کہوں گا کہ کشمیری میری منکوحہ اور اردو محبوبہ ہے۔ میں

غلام نبی خیال کی مطبوعات

اردو: 1: خیابانِ کشمیر 1998، 2: کاروانِ خیال۔ 1998، 3: فغانِ کشمیر۔ 1999، 4: اظہارِ خیال۔ 2003، 5: فکرِ خیال 2007، 6: چنار رنگ۔ 2010، 7: خیالات۔ 2004، 8: خیالِ قلم۔ 2014، 9: کشمیر کی وادی (والٹر لارنس کی کتاب کا ترجمہ، اردو کونسل۔نئی دہلی)۔ 2014، 10: کشمیر، دھوپ اور چھاؤں میں (ٹنڈیل بسکو کا ترجمہ، اردو کونسل۔نئی دہلی)۔ 2015، 11: شبنم کا آتش کدہ۔ 2016، 12: جہانِ خیال۔ 2016 (مزید: غلام نبی خیال ایک مطالعہ، از ڈاکٹر رفیق احمد بانڈے) 2016

کشمیری: 13: لولکہ پرتو (پرتوِ عشق)۔ 1959، 14: رباعیاتِ عمر خیام۔ 1961 (تین ایڈیشن)، 15: پرا گاش (نورِ سحر)۔ 1962، 16: پوئیٹکا (ارسطو کی کتاب کا ترجمہ)۔ 1962، 17: ویور (سمتر انندن پنت کی نظموں کا ترجمہ)۔ 1962، 18: سام نامہ۔ 1962، 19: زنجورہ بند ساز (ساز زنجیر۔زنداں نامہ) 1963، 20: سون ادب۔ 1963، 21: محمود گامی۔ 1963، 22: کاشُر نثر (کشمیری نثر کی تاریخ، اوتار کشن رہبر کے ساتھ)۔ 1967، 23: گاشری مُنار (ساہتیہ اکادیمی ایوارڈ 1975) 1973، 24: اکہ نندن۔ 1974، 25: میڈیا (یوری پیڈیز کے ڈرامے کا ترجمہ)۔ 1998، 26: قلم پارہ۔ 2003، 27: گلزارِ خیال۔ 2003، 28: الہام۔ 2004، 29: مونوگراف آف اختر محی الدین۔ 2012

انگریزی: 30۔ لیوز آف چنار (ریاستی کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ۔ 2012) 2009

31: پروگریسو لٹریری موومینٹ ان کشمیر۔ 2011

صحافت

مدیر : کونگ پوش (کشمیری ادبی رسالہ)۔ 1955

مدیر : رسالہ گل ریز۔ 1961

بانی مدیر : ہفت روزہ وطن (پہلا کشمیری اخبار۔ 68-1965

مدیر و مالک : اقبال (ہفت روزہ اور روزانہ)۔ 75-1968

مدیر اعلیٰ : وویس آف کشمیر (انگریزی ہفت روزہ) 7 مئی 2003 سے لے کر آج تک۔۔۔۔

جموں و کشمیر نمائندہ: انڈیا ٹوڈے (نئی دہلی)، السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (بمبئی)، ٹائم میگزین، سنڈے میل (نئی دہلی)، گجرات سماچار (احمد آباد)، نوائے وقت اور نیشن (پاکستان)، وویس آف امریکہ (نئی دہلی)، گارڈین (لندن)، سٹیٹسمین (نئی دہلی)۔

انعامات و اعزازات

1: ساہتیہ اکادیمی ایوارڈ۔ 1975، 2: جموں و کشمیر کلچرل اکاڈیمی انعام۔ 1974، 3: انٹرنیشنل ایسے کمپٹیشن ایوارڈ۔ وارسا، پولینڈ، 1968، 4: العرب میگزین ایوارڈ بین الاقوامی شعری مقابلہ۔ 1972، 5: اکھل بھارتیہ ناگری پرچارنی سبھا ایوارڈ۔ کلکتہ، 1976، 6: جرنلسٹس ویلفیئر فاؤنڈیشن ایوارڈ، نئی دہلی، 1982، 7: ملک راج صراف ٹرسٹ ایوارڈ برائے صحافت، جموں، 1989، 8: لل دید فاونڈیشن ایوارڈ، سرینگر، 2000، 9: شاندار کارگی ایوارڈ از دوردرشن کیندرا، چندی گڈھ، 2006، 10: فاضل کشمیری میموریل ایوارڈ، سرینگر، 2007، 11: بخشی میموریل ایوارڈ، سری نگر، 2007، 12: ہرموکھ کشمیر کمیٹی انعام۔ 2009، 13: جموں و کشمیر اردو اکیڈیمی ایوارڈ، 2010، 14: Leaves of Chinar کو بہترین کتاب کا ایوارڈ از طرف سٹیٹ کلچرل اکیڈیمی۔ جموں، 2012، 15: خلعتِ فاخرہ۔ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، 2013، 16: دستارِ فضیلت، ریڈیو کشمیر سری نگر، کشتواڑ صوبہ جموں، 2013، 17: اعزاز من جانب کشمیر کلچرل سوسائٹی، سرنگر۔ 2013، 18: این، جی، او ''آواز'' کی طرف سے راج بیگم یادگاری ایوارڈ۔ 2014، 19: بہار اردو اکیڈیمی ایوارڈ برائے بہترین کتاب۔ پٹنہ، 2014، 20: ریاست جموں و کشمیر کا سرکاری انعام۔ سری نگر۔ 2014

21: حلقہ اربابِ ذوق سوپور کشمیر کا اعزاز۔ 2015، 22: شفیع شیدا میموریل ایوارڈ۔ 2017

انگریزی میں بھی لکھتا ہوں تا کہ میرے جو مقالات اور مضامین کشمیر کی تاریخ، ثقافت، میراث، ادب اور شعریات سے تعلق رکھتے ہیں، وہ غیر کشمیری دنیا تک بھی پہنچ سکیں۔

م ز ک: آپ نے ادبیات کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی، یہاں تک کہ غیر ادبی اصناف کے ساتھ ساتھ آپ نے تاریخ اور دیگر موضوعات پر بھی لکھنے میں کافی دلچسپی لی۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ ایک ہی فیلڈ کا ماہر بنو، جبکہ آپ نے ہر کسی چیز کا مزہ لے لیا۔ یہ سارا کیسے ممکن ہوسکا۔

غلام نبی خیال: ادیب یا شاعر کے زورِ قلم کو میں صرف ودیعتِ الٰہی ہی مانتا ہوں۔ مزید برآں قلم کار کے

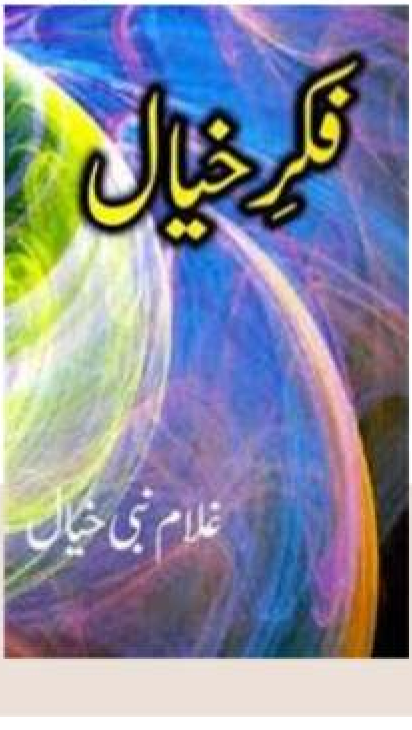

لیے بھر پور مطالعہ انتہائی لازم ہے اور یہ مطالعہ محض شاعری یا افسانہ پڑھنے تک محدود نہ رہے، بلکہ اس میں تاریخ، لسانیات، عمرانیات، مذہب اور فلسفے کا شامل ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ گوئٹے نے کہا ہے کہ ''اگر آپ نے گذشتہ دو ہزار سال کی تاریخ نہ پڑھی ہو، تو آپ صرف آج کے لیے جی رہے ہیں۔ کل کے دن کا آغاز آپ کو از سر نو کرنا ہوگا۔''

م ز ک: آپ اصل میں ایک صحافی (پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے) ہیں، مگر آپ نے وقتی اور سستی صحافت کا ساتھ کبھی نہیں دیا، البتہ آپ ہمیشہ سنجیدہ صحافت کی طرف مائل رہے، جس کی وجہ سے آپ صحافت میں کوئی کمرشل Establishment قائم نہ کر سکے۔ چونکہ آپ کی صحافتی تحریریں ہمارے پاس موجود ہیں، جبکہ عام صحافتی تحریروں کو دوسرے ہی دن ردی کی ٹوکری میں ڈالا جاتا ہے۔ غرضیکہ کمرشیل صحافت پر آپ نے ادبی صحافت کو کیوں ترجیح دے دی، جس کی وجہ سے آپ کو بہت سارے خسارے کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

غلام نبی خیال: صحافت دراصل ایک مقدس پیشہ، بلکہ یوں کہیے کہ ایک مشن ہے۔ اس پیشے میں انسان کا مافی الضمیر اور اس کا ذہنی اور فکری رجحان واشگاف ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ ایمانداری سے کوشش کی کہ اس میدان میں اُترنے کے بعد، جو میں دیکھوں اور محسوس کروں، وہی کچھ قلم بند کروں۔ میں نے آج تک سیکڑوں رسائل و جرائد، اخبارات اور نشریاتی اداروں کے لیے کالم لکھے اور رپورٹیں تیار کیں، لیکن آج تک میری کوئی بھی رپورٹ کسی بھی حلقے کی طرف سے جھٹلائی نہیں گئی۔ یہ سرخروئی بس اللہ کا کرم ہے۔

م ز ک: آپ اس وقت پیری میں ہیں اور اللہ کے کرم و فضل سے نئے نئے موضوعات پر لکھ رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے نوجوان لوگ چاہے وہ پروفیسر س ہوں یا اسکالرس وہی درسی ڈھنگ کی تالیفات پر مضامین جیسے میر، غالب، اقبال، پریم چند، سرشار وغیرہ زیادہ سے زیادہ منٹو، عصمت چغتائی، کرشن چندر، قرۃ العین وغیرہ پر لکھ رہے ہیں۔ دوسری طرف چند مٹھی بھر لوگ انگریزی یا عالمی ادب سے کچھ تحریکات، رجحانات اور نظریات کے بارے میں پڑھ کر یا ان کے خیالات کا چربہ اُتار کر بڑے بڑے بقراط ہونے کا دعوا کرتے ہیں۔ ان باتوں کو مدِ نظر رکھ کر کیا آپ آج لکھے جا رہے ادب خاص کر اُردو تحقیق وتنقید کی صورت حال سے مطمئن ہیں۔

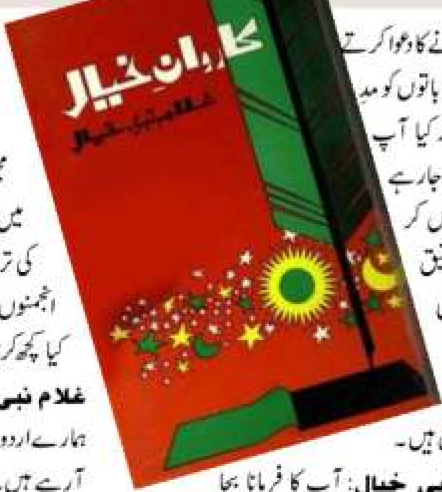

غلام نبی خیال: آپ کا فرمانا بجا ہے۔ آئے دن بالخصوص رسائل و جرائد میں جو ادبی مضامین لکھے جا رہے ہیں، ان میں کوئی جدت شاذ ہی نظر آتی ہے۔ میر ہو یا غالب، اقبال ہو یا فیض، ان کے حوالے سے کوئی نئی بات سامنے نہیں آتی۔ بس پرانی باتوں کو از سر نو کھنگال کر نئی نئی اصطلاحوں اور انداز کلام سے سجایا جاتا ہے۔ یہ صورت حال اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ مقالہ نگار اور تجزیہ کار مطالعے سے دور بھاگتے ہیں اور ان کی تحریریں بھی سطحی رنگ کی حامل ہوتی ہے۔ اس سے اردو کی کوئی سنجیدہ خدمت نہیں ہو پا رہی ہے۔ اسی طرح اردو اخبارات، نشریاتی ادارے بھی اردو کی بیخ کنی کرتے نظر آرہے ہیں۔ ملک کے اردو ٹیلی وژن چینلز برائے نام اردو سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں ای، ٹی، وی اردو، 4 ٹی وی، منصف ٹی وی، گلستان نیوز اور سرینگر کا دور درشن شامل ہیں۔ اصل میں ان اداروں میں وہ لوگ کام پر لگائے گئے ہیں، جو اردو سے نابلد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سے نشر ہونے والے پروگرام یا تحریر کردہ خبریں اور اداۓ گرامر، تذکیر و تانیث اور تلفظ کی غلطیوں سے بھری ہوتی ہیں، کیونکہ یہ نام نہاد صحافی پیشہ ورانہ طور پر اردو زبان سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔ کشمیر سے شائع ہونے والے اردو اخباروں کا بھی یہی حال ہے، کیونکہ ان کے مدیران میں سے کسی ایک نے بھی باقاعدہ طور پر اردو کی تعلیمی سند حاصل نہیں کی ہے، جس کے لیے یہاں کوئی تدریسی ادارہ بھی موجود نہیں ہے۔ نتیجتاً ان کے اداریے اور خبریں اغلاط سے بھری ہوتی ہیں۔

م ز ک: کیا آپ اُردو زبان و ادب کی مجموعی صورت حال اور ریاست جموں وکشمیر میں اس کی موجودہ پوزیشن سے مطمئن ہیں۔ اس کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں مختلف اداروں، انجمنوں اور سرکار کی الگ بات ہے، ہمیں ذاتی طور پر کیا کچھ کرنا چاہیے۔

غلام نبی خیال: جی نہیں۔ میں مطمئن نہیں ہوں۔ ہمارے اردو والے صرف غیر معیاری شاعری کرتے نظر آرہے ہیں۔ اس سے آگے ان کی نظر جاتی ہی نہیں۔ میں ایک مقامی اردو شاعر کا نام لیے بغیر ذکر کروں گا، جو پورے ساٹھ ستر سال سے اردو میں شاعری کر رہا ہے، لیکن میں دعوے سے کہوں گا کہ آج تک اس کا ایک بھی ایسا شعر میری نظروں سے کبھی نہیں گذرا، جس کا میں میر یا غالب یا فراق یا فیض کے کسی بھی شعر سے تقابل کر سکوں۔ ملک کی اردو شاعری اور نثر کا بھی کم وبیش یہی حال ہے۔

م ز ک: بیشتر قلم کاروں کو اپنے معاصرین سے چشمک رہتی ہے اور نو وارد لوگوں کو وہ ہیچ اور رنگروٹ نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا لائحہ عمل کیا رہتا ہے۔

غلام نبی خیال: ادبیات کی دنیا میں چشمک کوئی منفی عمل نہیں۔ انشا اور مصحفی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ البتہ اس میں شائستگی اور تہذیب واخلاق کا التزام ضروری ہے۔ کیونکہ اگر سنجیدہ قلم کار ہی بازاری زبان کا استعمال کرتے رہیں، تو انھیں میں کون سا نام دوں معلوم نہیں۔

م ز ک: دنیا میں ''قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی'' اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے سب سے بڑا ادارہ ہے۔ کیا آپ ان کی خدمات سے مطمئن ہیں اور ان کے رسالے 'اُردو دنیا' کے ذریعے آپ اُردو عالمی برادری کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔

غلام نبی خیال: ادارہ اچھا کام کر رہا ہے، جس کی تعریف کیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔ اردو دنیا کو تو میں دنیا کا بہترین ادبی اور ثقافتی جریدہ سمجھتا ہوں، جس کی مثال مجھے ہندو پاک میں کہیں نظر نہیں آتی۔

■

Dr. Mohiuddin Zore Kashmiri
Sr. Asstt. Prof. Urdu
Govt Degree College Magam
Budgam- 193401 (Kashmir)
Cell.:9149773980
Ghulam Nabi Khyal
15-Rawalpora Housding Colony
Srinagar - 190005 (Kashmir)
Cell:9419005909

کور اسٹوری

حقانی القاسمی

اردو زبان و ثقافت اور موجودہ عالمی مسائل

پانچویں عالمی اردو کانفرنس کی روداد

اردو 'اشوکا' ہوٹل تک پہنچ جائے گی ——

بہتوں کی طرح میرے لیے بھی حیرت کی بات تھی کہ ایک گری پڑی کہلانے والی زبان یعنی ریختہ کو یہ رتبہ بلند کیسے مل گیا۔

مگر اس حیرت میں ہم اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اردو 'اشوکا' نہیں 'آکاش' کی بھی زبان ہے۔ خلا باز راکیش شرما سے جب پوچھا جاتا ہے کہ ہندوستان کیسا لگ رہا ہے تو وہ اپنے جذبات کو بیان کرنے کے لیے جس زبان کا سہارا لیتے ہیں وہ اردو ہی ہے۔ وہ علامہ اقبال کے ایک مصرع سے جواب دیتے ہیں کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اور ویسے بھی اردو ماضی میں شاہی قصور و محلات، درباروں اور قلعہ معلی کی زبان رہ چکی ہے۔ اسے بادشاہوں اور شہنشاہوں کی صحبت نصیب رہی ہے۔ اس کی درویشی میں بھی عجب شہنشاہی ہے۔ اس بے علاقہ، بے مکان زبان کی ہر جگہ ایک نئی شان ہے۔ یہ تو اس چراغ کی طرح ہے جو ہر جگہ اپنی روشنی بکھیرتا ہے۔ وسیم بریلوی کا ایک مشہور شعر شاید اسی حقیقت کی عکاسی کر رہا ہے۔

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

اردو نے اپنی بے مکانی کے باوجود ہر ایک علاقے میں اپنا گھر بنا لیا ہے۔ یہی وہ سخت جان زبان ہے جو صحراؤں کو گلستاں میں بدلنے کی قوت رکھتی ہے۔ جس نے کتنے دشت کو گلزار کیا، کتنے ویرانوں کو آباد کیا۔ اس زبان میں اتنی کوملتا اور کشش ہے کہ ہر کوئی اس کی زلفوں کا اسیر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گلی کوچوں، بازاروں سے جنم لینے والی اردو زبان بہتوں کی جان جاناں بن گئی ہے۔ اس لیے اگر یہ اشوکا تک پہنچ گئی تو اس میں تعجب و حیرت کی کوئی بات نہیں۔ افسوس کی بات صرف اتنی سی ہے کہ اردو کلاس روموں سے نکلتی جا رہی تھی۔ اشوکا تک اردو کا پہنچنا اردو کی اپنی داخلی قوت کا اظہار ہے اور کلاس روموں سے اس کا نکلنا ہماری داخلی کمزوری، کوتاہی، بے حسی کا مظہر۔ خوش کن بات یہ ہے کہ اردو کی گونج صرف اشوکا نہیں بلکہ دنیا کے بہت سے عالیشان ہوٹلوں میں بھی سنائی دینے لگی ہے۔ ہر جگہ وہ اپنی خوشبو اور جلوے بکھیر رہی ہے اور یہی جلوہ دی اشوک ہوٹل بینکویٹ ہال ڈپلومیٹک انکلیو، چانکیہ پوری، نئی دہلی 110021 میں بھی کو دیکھنے کو مل رہا تھا۔

24 مارچ 2018

2018 کی وہ 24 تاریخ تھی، مہینہ بھی وہی، مقام بھی وہی جو چوتھی عالمی اردو کانفرنس کا تھا۔ صرف موضوع بدلا ہوا تھا۔ پچھلی کانفرنس کا موضوع 'ہندوستان اور بیرونی ممالک میں اردو زبان و ادب کا منظرنامہ' تھا تو پانچویں عالمی اردو کانفرنس کا عنوان 'اردو زبان و ثقافت اور موجودہ عالمی مسائل' تھا اور اس موضوع کا انتخاب بھی انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں 6 ستمبر 2017 کو منعقدہ میٹنگ میں مقتدر ہستیوں نے کیا تھا۔ ان میں ممتاز ناقد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، شاہد مہدی (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی)، پروفیسر طارق منصور (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ (سابق ڈائرکٹر قومی اردو کونسل)، پروفیسر اعجاز علی ارشد (سابق وائس چانسلر مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی پٹنہ)، جناب عزیز برنی (سابق گروپ ایڈیٹر، روزنامہ راشٹریہ سہارا،نئی دہلی)، جناب امتیاز کریمی (ڈائرکٹر، اردو ڈائریکٹوریٹ پٹنہ)، پروفیسر عین الحسن (شعبۂ فارسی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی) پروفیسر قدوس جاوید (سابق پروفیسر کشمیر یونیورسٹی)، جناب کیول دھیر (لدھیانہ)، ڈاکٹر قاسم خورشید (پٹنہ) اور سید فیصل علی (نئی دہلی) کے علاوہ پروفیسر ارتضیٰ کریم (ڈائرکٹر قومی اردو کونسل) اور پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال کے نام شامل ہیں۔ یہ موضوع یقینی طور پر عصر حاضر سے ہم آہنگ تھا اور موجودہ تناظر میں اس موضوع پر مکمل گفتگو کی ضرورت بھی تھی۔ اشوک آڈیٹوریم میں اسی موضوع پر دانشورانِ ادب و ثقافت کو اظہار خیال کرنا تھا۔

24 تاریخ کی صبح کو اشوک ہوٹل آڈیٹوریم دن میں بھی قمقموں سے روشن تھا۔ ہر طرف اردو زبان کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آتش گل سے پورا ماحول دہک رہا ہو۔ مجھے اس آڈیٹوریم کے خواب ناک پس منظر سے فلمی نغمہ نگار سمپورن سنگھ گلزار کی یہ نظم سنائی دے رہی تھی۔

یہ کیسا عشق ہے اردو زباں کا
مزا گھلتا ہے لفظوں کا زباں پر
کہ جیسے پان میں مہنگا قوام گھلتا ہے
یہ کیسا عشق ہے اردو زباں کا...
نشہ آتا ہے اردو بولنے میں
گلوری کی طرح ہیں منہ لگی ساری اصطلاحیں
لطف دیتی ہے حلق چھوتی ہے اردو تو،
حلق سے جیسے مے کا گھونٹ اُترتا ہے
بڑی ارسٹوکریسی ہے زباں میں
فقیری میں نوابی کا مزہ دیتی ہے اردو
اگرچہ معنی کم ہوتے ہیں اردو میں
الفاظ کی افراط ہوتی ہے
مگر پھر بھی بلند آواز پڑھیے تو
بہت ہی معتبر لگتی ہیں باتیں
کہیں کچھ دور سے کانوں میں پڑتی ہے اگر اردو
تو لگتا ہے کہ دن جاڑوں کے ہیں
کھڑکی کھلی ہے
دھوپ اندر آ رہی ہے
عجب ہے یہ زباں اردو
کبھی کہیں سفر کرتے

سارے جہاں میں دھوم اردو زباں کی ہے: غیر ملکی مندوبین

ڈاکٹر عبداللہ (امریکہ)

کیرن گریس روفل (کناڈا)

جاوید دانش (کناڈا)

صبیح بخاری (دبئی)

نورامروہوی (امریکہ)

مہتاب قدر (جدہ)

احمد اشفاق (قطر)

عتیق انظر (قطر)

اگر کوئی مسافر شعر پڑھ دے میر و غالب کا
وہ چاہے اجنبی ہو یہی لگتا ہے وہ میرے وطن کا ہے
بڑے شائستہ لہجے میں کسی سے اردو سن کر
کیا نہیں لگتا کہ ایک تہذیب کی آواز ہے اُردو

اور یقیناً تہذیب کی یہی آواز اس پورے ماحول میں سنائی دے رہی تھی اور لگ رہا تھا جیسے اردو حسن مجسم بن کر ہمارے سامنے آکھڑی ہوئی ہو اور اپنے جاذب نظر اور دل کش پیکر سے ہر کسی کو مسحور کر رہی ہو۔

اشوک آڈیٹوریم کا جو Ambience تھا وہ مکمل طور پر اردو کے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ اردو کی نفاست، لطافت اور نزاکت پوری طرح ماحول میں رچی بسی تھی کہ سوچ رہا تھا کہ کونسل گلدستے کی اس منزل تک کتنی خاردار راہوں سے ہوکر پہنچی ہے اس میں کتنے رت جگے، کتنی ریاضتیں، کتنی اذیتیں اور مشقتیں شامل ہیں اس کا اندازہ ہر کسی کو نہیں ہوسکتا۔ تین دن کی اس کانفرنس تک پہنچنے کے لیے کونسل تقریباً تین مہینے سے تیاریوں میں جٹی ہوئی تھی۔ موضوع کا انتخاب، ماہرین کی میٹنگ، مندوبین کے ناموں کی تلاش، موضوع کی مناسبت سے افراد کی جستجو۔ کانفرنس کے لیے ان کی منظوری حاصل کرنا، پھر کسی کا انکار، کسی کا اقرار، مجبوریاں، مسائل، پالیٹکل کلیرنس غرضیکہ ان اذیت بھرے مرحلے طے کرنے کے بعد کانفرنس کے انعقاد کی وہ گھڑی آئی تھی۔

نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ہر کوئی اپنے کام میں منہمک تھا اور شاید انہی ریاضتوں اور محنتوں کا ثمرہ تھا کہ اشوک ہوٹل میں کسی طرح کی بے ترتیبی نظر نہیں آرہی تھی۔ ہر چیز بالکل اردو کی طرح سلیقے اور قرینے سے سجی ہوئی تھی۔

اشوک آڈیٹوریم میں لوگوں کا ہجوم تھا اور افتتاحی اجلاس کے مہمانان کرام کا بے چینی سے انتظار ہورہا تھا۔ جن کی آمد سے بزم کی رونق بڑھ سکتی تھی وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے شاید وقت پر نہیں آسکے۔ وقت پر نہ آنا یا دیر سے آنا اکثر بڑے لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ مجھے منیر نیازی کی ایک پیاری سی نظم یاد آگئی:

ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں

سارے جہاں میں دھوم اردو زباں کی ہے : غیرملکی مندوبین

مقصود انور (قطر)

محمد غلام ربانی (بنگلہ دیش)

ڈاکٹر رحمت علی (ماریشس)

عنایت حسین عیدن (ماریشس)

محمود الاسلام (بنگلہ دیش)

شہاب الدین احمد (قطر)

ڈاکٹر محمد ناصر الدین (بنگلہ دیش)

مسز حفصہ (بنگلہ دیش)

یہ عوامی زبان اشرافیائی انداز بیاں رکھتی ہے اور اردو کی یہی اشرافیت اشوکا میں بھی محسوس ہورہی تھی۔

آڈیٹوریم بالکل اردو کے روپ اور رنگ میں ڈھلا ہوا تھا۔ کہیں سے اجنبیت نہیں محسوس ہورہی تھی۔ اسٹیج پر گلدستے سجے ہوئے تھے۔ لوگ محو حیرت تھے مگر میں یہ

کونسل کے تمام عملے کو اس گھڑی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ان کے چہروں پر مسرت کی لکیریں تھیں اور جوش و ولولہ بھی۔ اونچے درجے کے افسران سے لے کر وہ افراد بھی جنھیں نچلے درجے کے ملازمین کہا جاتا ہے سب اپنی اپنی ذمے داریاں ادا کرنے میں مصروف تھے۔ کسی

ضروری بات کہنی ہو کوئی وعدہ نبھانا ہو
اسے آواز دینی ہو اسے واپس بلانا ہو
ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں
مدد کرنی ہو اس کی یار کی ڈھارس بندھانا ہو
بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو

ڈاکٹر اودت راج ممبر پارلیمنٹ کا پر جوش استقبال کرتے ہوئے

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں
بدلتے موسموں کی سیر میں دل کو لگانا ہو
کسی کو یاد رکھنا ہو کسی کو بھول جانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں
کسی کو موت سے پہلے کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ اس کو جا کے یہ بتانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں...
بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔ انتظار کی شدت اور تیزی سے گزرتا وقت ۔ ایسی حالت میں قومی اردو کونسل کے

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے: ہندوستانی مندوبین

کیول دھیر (لدھیانہ)

پروفیسر غضنفر (دہلی)

ناشر نقوی (پٹیالہ)

شبنم حمید (الہ آباد)

کندن لال کندن (دہلی)

پروفیسر کلیم ضیاء (ممبئی)

اطہر فاروقی (نئی دہلی)

شاہد لطیف (ممبئی)

اردو ہے جس کا نام: ہندوستانی مندوبین

مظفر حسین سید (دہلی)

صفدر امام قادری (پٹنہ)

پروفیسر سجاد حسین (چنئی)

پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی (علی گڑھ)

انور ظہیر (گجرات)

سید احمد قادری (گیا)

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری (میرٹھ)

ڈاکٹر امام اعظم (کولکاتہ)

ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کا پریشان ہونا فطری تھا۔ وہ مضبوط اعصاب کے مالک ہیں اسی لیے ان کی جبیں پر کوئی شکن نظر نہیں آئی کہ ان میں ہمت سے حالات کو بدلنے کی قوت ہے، موجِ حوادث سے لڑنے کی طاقت ہے۔ ورنہ ایسی صورت میں تو کمزور قوی والوں کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرف سے بولنے کی مناہی تھی مگر ان کا Enthusiasm (مجھے اردو میں اس سے زیادہ پر جوش اور پر قوت لفظ نہیں ملا) انھیں بولنے سے روک نہیں پا رہا تھا۔ داخلی اور خارجی دباؤ کے باوجود انھوں نے بڑی ہمت سے مائک سنبھالا اور اس طرح کانفرنس کے افتتاحی سیشن کا سفر شروع ہوا۔ میں ان کا چہرہ پڑھ رہا تھا اور میری آنکھوں میں زیب غوری کا یہ شعر یاد آ رہا تھا

سب مجھے رونق بزم سمجھا کیے
میرے اندر کوئی شخص روتا رہا

اسٹیج پر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ سابق ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، کیرن گریس رفل (کناڈا)، پروفیسر اظفر شمسی (پٹنہ)، پروفیسر بیگ احساس (حیدرآباد)، ڈاکٹر عبداللہ (امریکہ) وغیرہ موجود تھے۔ مہمانان کا گلدستے سے استقبال کیا گیا اور تعارفی کلمات کہے گئے۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کی مرتب کردہ دو کتابوں 8 جلدوں پر مشتمل 'کلیات خواجہ احمد عباس' کی پہلی جلد اور چوتھی عالمی اردو کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ 'اردو زبان و ادب: ہند اور بیرونِ ہند' کے اجرا کے علاوہ قومی اردو کونسل کا تیار کردہ eKitaab اور ای لائبریری ویب سائٹ کا اجرا بھی کیا گیا۔ eKitaab کونسل کا پرانا خواب تھا جو شرمندہ تعبیر ہو رہا تھا۔ ایک اہم کام جس کا انتظار برسوں سے تھا۔ کونسل کی فخریہ پیش کش اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ ایسا پہلا اردو مفت ای بب ریڈر ہے جو نستعلیق خط میں کئی امتیازی خصوصیات کے ساتھ فراہم کیا گیا ہے۔ کتابچے میں درج تفصیلات کے مطابق اس ریڈر پر کونسل کی کتابیں ای۔پب فارمیٹ میں آسانی کے ساتھ ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھی جا سکتی ہیں۔ ایک مرتبہ کتاب ڈاؤن لوڈ ہو جانے کے بعد مطالعہ کے لیے انٹرنیٹ ضروری نہیں۔ ایپ (App) کے چند امتیازی پہلو مندرجہ ذیل ہیں:

- ذولسانی ایپ (اردو/انگریزی)
- نستعلیق خط میں فراہمی
- آئی پیڈ، آئی فون، اینڈرائیڈ فون اور ڈیسک ٹاپ سے مطابقت
- گلوبل لنگویج سپورٹ (آر، ٹی، ایل بیج پروگریشن)
- لفظ و معنی دیکھنے اور تلفظ کے اشارے
- انٹرایکٹیو فہرست کی مدد سے مطلوبہ باب تک رسائی
- آن لائن سہ لسانی لغت (اردو/ ہندی/ انگریزی) کی سہولت

- مطالعے کا اسٹیٹس دیکھنے کی سہولت
- ڈے/نائٹ موڈ آپشن (پہلے سے موجود بیک گراؤنڈ تھیم کو بھی اپنی پسند کے اعتبار سے منتخب کرنے کی سہولت)
- الفاظ اور کتابیں تلاش کرنے کی سہولت
- متن کا سائز بڑھانے/گھٹانے کی سہولت
- اسکرین کی روشنی بڑھانے/گھٹانے کی سہولت
- متن کو نمایاں (Highlight) کرنے کی سہولت
- وضاحتی نوٹ اور بک مارک لگانے کی سہولت (bookmark and Annotation)
- فلپ موڈ یا کلک -فلپ موڈ کے ذریعے صفحہ پلٹنے کی سہولیات
- ایڈ فری ایپ
- کتاب شیئر کرنے کی سہولت

اس پروجیکٹ کے ٹیم لیڈر جناب اجمل سعید (اسسٹنٹ

اردو ہے جس کا نام: ہندوستانی مندوبین

ابوذر ہاشمی (کولکاتہ)

سہیل انجم (دہلی)

ڈاکٹر دبیر احمد (کولکاتہ)

رام واسودیو پنڈت (ممبئی)

راشد انور راشد (علی گڑھ)

ڈاکٹر تنویر حسین (دہلی)

امان اللہ ایم بی (چنئی)

شعیب رضا خاں وارثی (نئی دہلی)

ساجد حسین (نئی دہلی)

احمد جاوید (پٹنہ)

ڈاکٹر زاہد الحق (حیدرآباد)

ڈاکٹر الطاف حسین (کشمیر)

ایجوکیشن آفیسر این سی پی یو ایل) اور اس کے ٹیکنیکل کمیٹی کے ارکان میں: پروفیسر ایم یو بخاری، کمپیوٹر سائنس ڈپارٹمنٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، جناب جسجیت سنگھ، جوائنٹ ڈپارٹمنٹ، دہلی یونیورسٹی، دہلی، جناب مرزا رجیل بیگ، کمپیوٹر سائنس ڈپارٹمنٹ، جامعہ ہمدرد، دہلی جیسی شخصیتیں شامل تھیں۔ اس پروجیکٹ کو بیشتر لوگوں نے سراہا اور قومی اس اعتبار سے فکرانگیز اور معنی خیز تھا کہ یہ غیر نصابی تھا اور موضوع کی مناسبت سے مسائل کا دانش ورانہ انداز میں تجزیہ کیا گیا تھا۔ انھوں نے موضوع کی تمام جہتوں کو سمیٹتے

وہ عطردان سا لہجہ میرے بزرگوں کا: اجلاس کے صدور

ڈاکٹر معراج میر (کشمیر)

پروفیسر اعجاز علی ارشد (پٹنہ)

پروفیسر عتیق اللہ (دہلی)

پروفیسر بیگ احساس (حیدرآباد)

نند کشور وکرم (دہلی)

قاضی عبیدالرحمن ہاشمی (دہلی)

قدوس جاوید (کشمیر)

پروفیسر صغیر افراہیم (علی گڑھ)

خواجہ عبدالمنتقم (دہلی)

امتیاز احمد کریمی (پٹنہ)

عبدالقیوم انصاری (پٹنہ)

پروفیسر اظفر شمسی (پٹنہ)

ڈائریکٹر DAC-C، (GIST)، پونے، مہاراشٹر، جناب سید محمد احمد، چیف ٹکنالوجی آفیسر، لاریب ٹیکنالوجیز، دہلی، جناب عمران غنی۔ سینئر سسٹم اینلسٹ، کمپیوٹر سائنس اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اس اہم پروجیکٹ کے لیے اجمل سعید کو سندِ تحسین سے سرفراز بھی کیا۔

ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ نے کلیدی خطبہ دیا۔ یہ خطبہ ہوئے بہت سے سوالات بھی قائم کیے اور اردو کی افادیت اور معنویت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہمیں اس زبان کی معنویت کو برقرار رکھنا ہے تو ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ

زبان ماڈرنائزیشن کی طرف بڑھ رہی ہے اور عالمی لسانی تحریک کے ساتھ رواں دواں ہے۔ انھوں نے اردو کے درخشاں ماضی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ماضی سے اتنا پیار نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارا مستقبل ہی مخدوش ہوجائے۔ اس لیے ماضی سے زیادہ اس کے مستقبل پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ نے اس موضوع کو ایک نیا ڈائمنشن دیا اور یہ بھی بتایا کہ کانفرنس قومی اردو کونسل کے مینڈٹ کا ایک حصہ ہے۔ اس کا مقصد علمی اور ادبی مباحث پر گفتگو سے زیادہ بیرون ممالک سے ثقافتی اور ادبی رابطے کو استحکام بخشنا اور اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کو ایک نئی جہت عطا کرنا ہے۔ اس کانفرنس کا ادبی اور ثقافتی معاملات سے زیادہ خارجہ پالیسی سے تعلق ہے اس لیے غیر ملکی مندوبین کی شرکت اور ان کا زبان و ادب اور عالمی مسائل کے تعلق سے اظہار خیال ہی اس کانفرنس کے انعقاد کے جواز کے لیے کافی ہے۔

کناڈا کی کیرن گریس رفل (کناڈا) جب مائک پر آئیں تو انگریزی میں اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے اردو کی گلوبل ریڈرشپ کے حوالے سے باتیں کیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو ای پب کونسل کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مجھے اس وقت لگا کہ وہ انگریزی میں بھی اردو بول رہی ہیں کیونکہ محبت کے لہجے میں کوئی بھی زبان بولی جائے وہ مجھے اردو ہی لگتی ہے۔

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ پروفیسر بیگ احساس نے

وہ عطر دان سا لہجہ میرے بزرگوں کا: اجلاس کے صدور

منوری بیگم (تمل ناڈو)

جاوید حیات (پٹنہ)

سید فیصل علی (دہلی)

ڈاکٹر سیما صغیر (علی گڑھ)

قاسم خورشید (پٹنہ)

رضا حیدر (دہلی)

ڈاکٹر مشتاق احمد (دربھنگہ)

ڈاکٹر نریندر (ہریانہ)

اردو زبان دنیا کو درپیش مسائل کا حل دے سکتی ہے یا نہیں۔ اگر اردو والے موجودہ عالمی مسائل کا جواب نہیں دے سکے تو اردو تو چھوڑیے خود اردو والے بھی نہیں رہ پائیں گے۔ انھوں نے یہ بات بھی بہت پر زور انداز میں کہی کہ اردو ادیبوں اور اردو اخبارات کو اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف کیا کر رہے ہیں۔ وہ مظلوموں کے مسائل کو کتنی شدت اور زوردار انداز میں ابھار رہے ہیں۔ انھوں نے ایک بڑی اہم بات یہ بھی کہی کہ اگر ہم عالمی طاقت بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں تو اردو ہی یہ خواب پورا کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ نے اپنے کلیدی خطبے میں یہ بھی کہا کہ اس بدلتی دنیا میں اردو زبان اپنے تہذیبی اور تاریخی کردار کو موثر طور پر ادا کر رہی ہے اور عصری ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہوکر اس زبان نے اپنا دائرہ کار کافی حد تک وسیع کر لیا ہے۔ اب یہ

سلیقے سے ہواؤں میں خوشبو گھول سکتے ہیں: ناظمین اجلاس

جناب انجم عثمانی

ڈاکٹر مشتاق احمد قادری

ڈاکٹر اشفاق احمد عارفی

ای پب اردو کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہر ٹیکنالوجی کا ساتھ دینے کا دم خم رکھتی ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانیں ختم ہوگئی ہیں مگر اردو باقی ہے۔ ہم نے کمپیوٹر کو اردو سے ہم آہنگ کیا۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ گلوبلائزیشن میں اردو کہاں کھڑی ہے۔ کیا اردو کے امکانات باقی ہیں۔ انھوں نے گلوبلائزیشن کی وجہ سے تہذیب وثقافت پر مرتب ہونے والے اثرات پر بھی گفتگو کی اور کونسل کی اس کاوش کو بھی سراہا کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کے طول وعرض میں سمینار کی بہار آگئی ہے اور اب چھوٹے چھوٹے علاقوں میں بھی سمیناروں کا انعقاد ہونے لگا ہے یہ صرف اور صرف کونسل کا فیض ہے کہ اس طرح کے جلسے اور سمینار پورے ملک میں ہو رہے ہیں جن میں اردو زبان کے مسائل اور امکانات کے حوالے سے گفتگو کی جا رہی ہے۔ پروفیسر اظفر شمسی نے اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اب قومی کونسل کی ای پب کے ذریعے ہم دنیا کی ہر تخلیق کو لیپ ٹاپ میں قید کر سکتے ہیں اور اس کا طویل مدتی اثر ضرور سامنے آئے گا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے بھی قومی اردو کونسل کے اہم کارنامے ای پب کی ستائش کی اور اسے اردو زبان وادب کی تاریخ کا ایک قابل ستائش قدم قرار دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کو اس کی شدید ضرورت تھی اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس ضرورت کی تکمیل قومی اردو کونسل جیسے اہم ادارے کے ذریعے ہوئی۔ اس افتتاحی سیشن میں موضوع کے بیشتر زاویوں کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر ارتضی کریم نے یہ واضح کیا کہ اردو زبان وادب میں انسانوں کے بنیادی مسائل پر بیش قیمت مواد موجود ہے۔ انھوں نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

”اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے تمام انسانی مسائل اور متعلقات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ انسانی حیات وکائنات سے جڑا ہوا کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے کچھ نہ لکھا ہو۔ چاہے وہ غربت کا مسئلہ ہو، تشدد کا ہو، ہجرت کا ہو، مذہبی ثقافتی کشمکش کا ہو یا جنسی امتیازات کا ہو، ماحولیات سے جڑا ہوا مسئلہ ہو، ہر وہ مسئلہ جس سے انسان دوچار ہوتا ہے اردو زبان وادب میں اس کے تعلق سے مختلف سطحوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ خاص طور پر انسانوں کے بنیادی حقوق کے حوالے سے اردو زبان میں بیش قیمت مواد موجود ہے۔ اردو کا پورا مزاج جمہوری اور سیکولر رہا ہے اس لیے میں یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں کہ حقوق انسانی کا منشور اردو زبان میں لکھی گئی شاعری اور فکشن سے تیار کیا جا سکتا ہے اور یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ آج کے متصادم ماحول میں اردو زبان وادب نے جس طرح امن ویکجہتی، اتحاد ویگانگت اور محبت واخوت کا پیغام دیا ہے یہ اس زبان کا اختصاص اور ما بہ الامتیاز ہے۔ اس زبان نے تمام تر مذہبی امتیازات اور تعصبات کے خلاف احتجاج کیا اور یہی زبان ہے جس نے اپنے آغاز سے ہی مزاحمتی رویہ اختیار کیا ہے۔ دنیا میں کہیں بھی ظلم وتشدد ہو، جبر ونا انصافی ہو، معاشی، سماجی، سیاسی استحصال ہو اس زبان نے آواز بلند کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو زبان وادب میں لکھے گئے شہ پارے پوری دنیا میں احتجاج اور مزاحمت کی نگاہ سے بھی دیکھے جاتے ہیں۔ یہی اردو شاعری ہے جس نے مذہبی نرگسیت اور ادعائیت کے خلاف آواز بلند کی۔ میر تقی میر نے یہ شعر کہا:

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اور غالب نے یہ کہا:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

مذہبی تعصبات سے ماورا یہی انسانی احساس ہے جو پوری اردو شاعری کی روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر مینائی نے کہا:

سانولی دیکھ کے صورت کسی متوالی کی
ہوں مسلمان مگر بول اٹھوں جے کالی کی

اردو شاعری نے ہمیشہ فرقہ واریت، مذہبی تعصب کے خلاف آواز بلند کی۔ مذہبی اور ثقافتی کشمکش کے خلاف احتجاج کیا۔ مدحت الاختر کا ایک خوبصورت شعر ہے:

مسجد کی اذاں ہو کہ شوالے کا گجر ہو
کس میں مرے جذبات کا اظہار نہیں ہے

اسی طرح انسانی زندگی سے جڑے ہوئے اور بھی مسائل ہیں۔ اس میں بھی اردو زبان وادب کا انداز عالمی اور آفاقی رہا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات ہوں یا خوف وتشدد کا ماحول، اردو زبان نے ہر ایک مسئلے پر جمہوری اور انسانی احساس کو ہی اپنے اظہار میں جگہ دی ہے۔

بشیر بدر کا یہ شعر دیکھیے:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

اس شعر کی معنویت پر غور کیا جائے تو کتنا بڑا پیغام ہے ان لوگوں کے لیے جو مذہب، ذات اور فرقے کی بنیاد پر

ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے

بستیوں کو ویران کرتے ہیں۔ اسی پس منظر میں راشد صدیقی کا ایک اچھا شعر ہے:

ساری بستی ہماری جلا دی گئی
بے گناہی کی کیسی سزا دی گئی

رئیس منظر کا یہ شعر دیکھیے:

کون نکلے گھر سے باہر کون دیکھے کیا ہوا
میرا ہمسایہ ہے خود میری طرح سہما ہوا

بھوک ہو یا غربت یہ آج کی زندگی کا بڑا مسئلہ ہے۔ اردو میں بھی نہ صرف اس پر شاعری کی گئی ہے بلکہ بہت سے شاہکار افسانے بھی لکھے گئے ہیں۔ غربت کا مسئلہ ایک عالمی مسئلہ ہے، ان لوگوں کا مسئلہ ہے جن کی زندگی میں ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں۔ جاں نثار اختر نے اس تعلق سے بہت ہی معنی خیز شعر کہا ہے:

شرم آتی ہے اس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارا ہی نہ ہو

اسی طرح ایک اور شعر ہے:

جئیں گے کیسے بھلا لوگ ایسی بستی میں
کہ جس میں بھوک کی فصلیں اُگیں زمینوں سے

پوری اردو شاعری عالمی مسائل سے بھری ہوئی ہے۔ اردو کا فکشن بھی انہی عالمی مسائل سے معمور ہے۔ پریم چند کے 'گئودان' کے علاوہ قرۃ العین حیدر کا ایک ناول 'آگ کا دریا' دیکھا جائے تو اس میں معاصر انسانی کائنات سے جڑے ہوئے سارے عالمی مسائل کا بیان موجود ہے۔ چاہے وہ تہذیبی کشمکش کا مسئلہ ہو، چاہے اقتصادی بحران کا، غربت کا ہو، جنسی اور نسلی امتیاز کا ہو اس ایک ناول میں تمام اہم عالمی مسائل سمیٹ لیے گئے ہیں۔ انتظار حسین کا ناول 'آگے سمندر ہے'، عبداللہ حسین کا 'اداس نسلیں' یا اس طرح کے اور بھی ناول ہیں جن میں ہماری زندگی کے بیشتر مسائل کا بیان ہے۔

ماحولیاتی آلودگی بھی ایک اہم موضوع ہے اس پر بھی اردو زبان و ادب میں بہت اچھی شاعری ہوئی اور افسانے لکھے گئے ہیں۔ نیر مسعود کا افسانہ 'مار گیر' اسی مسئلے پر ہے۔ جہاں تک خواتین کے حقوق اور اختیارات کا مسئلہ ہے تو رشید جہاں، عصمت چغتائی اور دیگر افسانہ نگاروں کے علاوہ پیغام آفاقی کا ناول 'مکان' تانیثی احتجاج کا ایک پر اثر بیانیہ ہے۔ پانی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ غضنفر نے اپنے ناول 'پانی' کے ذریعے اس مسئلے پر بڑی عمدہ گفتگو کی ہے۔ اس طرح دیگر اصناف میں بھی تمام عالمی مسائل کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ خاص طور پر مذہبی شدت پسندی کے خلاف اردو میں بہت وافر سرمایہ ہے۔"

تقریروں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ بی جے پی کے ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر اُدت راج کی آمد سے ماحول میں تھوڑی سی حرارت اور بڑھ گئی۔ انھوں نے اس موقعے پر بہت ہی خوبصورت بات کہی کہ جذبات اور احساسات کے اظہار کے لیے اردو سے بہتر کوئی اور زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ شاید اردو سے اسی محبت کی وجہ سے وہ اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر اس عظیم کانفرنس میں شریک ہونے آئے تھے جہاں مختلف بیرونی ممالک کے مندوبین کے علاوہ ہندوستان کے مستند اور موقر دانشور اور ادبا موجود تھے جن کی موجودگی ہی کسی کانفرنس کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ وہاں موجود ہر کوئی آفتاب و ماہتاب تھا اور یہ اس کانفرنس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل تھی کہ سامعین میں بھی قومی اور بین الاقوامی شہرت کے حامل افراد موجود تھے۔ نہایت خوبصورتی کے ساتھ ایک مرحلہ طے ہوا اور پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال کے کلمات تشکر پر اس مرحلے کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد پھر ایک نیا مرحلہ درپیش تھا۔ ہندوستان اور بیرون ممالک سے آئے ہوئے مندوبین سے نہایت ہی اہم موضوع پر دانشورانہ اور عالمانہ خطاب سننے کے لیے سامعین کی بھیڑ جمع تھی۔ موضوع چونکہ بہت اہم تھا اس لیے سامعین ہمہ تن گوش تھے۔ موضوع کے تعلق سے اطہر فاروقی، صفدر امام قادری، شبنم حمید، امان اللہ ایم بی، شعیب رضا خاں وارثی کے علاوہ بنگلہ دیش کے محمد ناصر الدین اور محمد غلام ربانی نے پرمغز مقالے پڑھے۔ ان مقالوں میں موضوع کی مختلف جہتوں کے حوالے سے بہت اہم باتیں کہی گئی تھیں۔ مجلس صدارت کے ارکان پروفیسر جاوید حیات، قاسم خورشید، عبدالقیوم انصاری، مظفر حسین سید، ڈاکٹر سیما صغیر نے ان تمام مقالہ نگاروں کو مبارک باد دی اور کہا کہ قومی اردو کونسل کے مجوزہ اس موضوع کے حوالے سے نہ صرف قومی بلکہ عالمی مسائل سے آگہی کی صورت پیدا ہوئی ہے اور ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ اردو عشق و عاشقی کی زبان نہیں ہے بلکہ عالمی مسائل کے احساس و اظہار کی زبان ہے۔ اردو بدلتے ہوئے حالات میں ایک علمی زبان کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے جس کی تمنا بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کی تھی۔ مقالہ خوانی کا یہ سیشن ڈاکٹر اشفاق عارفی کی نظامت میں آگے بڑھ رہا تھا اور وہاں بیٹھے ہوئے سامعین معتبر دانشوروں کے خیالات سے محظوظ ہو رہے تھے۔ یہ سلسلہ تھما تو پھر ایک اور سلسلے کی شروعات ہوئی۔ یہ وہ سلسلہ تھا جس کا سامعین کو بہت بے تابی سے انتظار تھا۔ جیسے ہی اسٹیج پر ممبئی کی مشہور گلوکارہ محترمہ اندرا نائک براجمان ہوئیں تو آڈیٹوریم کا سماں بالکل بدل گیا۔ بہت

یہ کیسا عشق ہے اردو زباں کا

سے مضمحل اور پژمردہ چہروں پر بھی خوشیوں کی لکیریں ابھر آئیں۔ گویا مردہ جسموں میں نئی جان سی پڑ گئی ہو۔ اندرا نانک نے جب اپنا سر اور تال چھیڑا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ لوگ جھومنے لگے۔ اندرا نانک کے صوفیانہ کلام میں جو سرمستی تھی اس میں لوگ ڈوبتے گئے اور پھر وقت کیسے گزر گیا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔

اس بار کشش کا مرکز وہ اسٹینڈی بھی تھے جن پر میر وغالب، نظیر، سیماب وغیرہ کے خوب صورت اشعار درج تھے۔ ان میں لالہ فلک چند کا یہ شعر بھی تھا:

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

مجھے لگا کہ اردو زبان شاید اسی الفت اور خوشبوئے وفا سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلا تفریق مذہب وملت سبھی اس زبان سے بے پناہ عشق ومحبت کرتے ہیں۔ بلکہ بہت سے لوگ تو جنوں کی حد تک اس زبان کے دیوانے ہیں اور جب تک یہ جنوں اور دیوانگی قائم ہے یہ زبان مر نہیں سکتی.....

25 مارچ 2018

دوسرا دن: موضوع وہی تھا، صرف مقام بدل گیا تھا۔ کانفرنس اشوک آڈیٹوریم سے اسکوپ آڈیٹوریم لودھی روڈ، نئی دہلی 3 منتقل ہوگئی تھی۔ پچھلے سال بھی اسی آڈیٹوریم میں دانشوروں، ادیبوں، فنکاروں کا ایک جمگھٹا تھا اور اس سال بھی کم وبیش وہی کیفیت تھی۔ پہلے سیشن کا آغاز ہوا جس میں ساجد حسین (دہلی)، کیول دھیر (لدھیانہ)، راشد انور راشد (علی گڑھ)، شاہد لطیف (ممبئی)، انور ظہیر (گجرات)، ڈاکٹر سید احمد قادری (گیا)، امام اعظم (کولکاتا)، مقصود انور (قطر)، ڈاکٹر عبداللہ (کناڈا) نے اپنے مقالات پڑھے۔ 'اردو کی نظمیہ شاعری میں عالمی مسائل' کے حوالے سے دیال سنگھ کالج کے استاد ساجد حسین نے ن م راشد جیسے عظیم شاعر کو مرکز ومحور بناتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں آمریت اور جمہوریت پر بھی گفتگو کی۔ اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ، انسانی اخلاق کی پاسداری اور انسان دشمن طاقتوں سے لڑنے کے تعلق سے باتیں کیں۔ مشہور افسانہ نگار کیول دھیر نے اس موقعے پر جنگ کے متعلق ایک افسانہ پڑھا جس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں۔ جنگ مسائل کو جنم دیتی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر راشد انور راشد نے 'عصمت چغتائی کے افسانوں میں تانیثی مسائل' پر مقالہ پڑھتے ہوئے یہ کہا کہ تخلیقی اظہار کی سطح پر جنس کی تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ تخلیقی فنکار کا مخصوص زاویہ نظر اہمیت رکھتا ہے۔ اقدار کی آفاقیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ انھوں نے مرد اساس معاشرے میں عورت کے انفرادی وجود پر بھی گفتگو کی۔ رشید جہاں کے باغیانہ تیور اور عصمت چغتائی کی انفرادی حیثیت کو انھوں نے اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ عصمت چغتائی نے تانیثی مسائل کو وسیع تر تناظر میں پیش کیا ہے۔ مرد اساس معاشرے میں عورت کا وجود حاشیے پر تھا۔ عورت تعلیم سے محروم تھی۔ عصمت کو بھی نت نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ باغی عصمت نے روایتی جکڑبندیوں سے آزادی حاصل کی۔ بغاوت کی آواز بلند کی اور اپنے افسانوں میں اسی رویے کا اطلاق کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ عورت کا انفرای تشخص عصمت کا بنیادی مسئلہ ہے۔ عورتوں کی صورت حال، مردوں کی نگاہ عنایت سے تبدیل نہیں ہوسکتی۔ عورتوں کو خود آگے آنا ہوگا۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی کے ایڈیٹر شاہد لطیف نے موجودہ عالمی حالات اور اردو صحافت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جہاں اردو صحافت کے وسائل میں حیران کن اضافہ ہوا ہے وہیں دوسری طرف مسائل بھی بڑھے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جس ٹیکنالوجی نے ہمیں آسانیاں بہم پہنچائی ہیں وہی ہمارے لیے غارت گر بھی ہے۔ انھوں نے خبر اور پروپیگنڈہ کے فرق پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ غیرملکی ایجنسیاں اپنے مفادات کے تحت خبریں پروستی ہیں۔ ایسے میں اردو اخبارات نے فلاح انسانیت کو مدنظر رکھا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ اردو اخبارات نے کبھی بھی انسانیت کے خلاف نہیں لکھا۔ اردو اخبارات کا فلاح انسانیت پر عقیدتاً ایقان ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ گلوبلائزیشن کے تعلق سے اردو نے اپنا حق ادا کیا۔ عالم کاری کے جہاں فوائد ہیں اس کے نقصانات بھی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ معاشی نظام کے تسلط کے خلاف اردو اخبارات نے آواز اٹھائی۔ انور ظہیر نے 'اردو شاعری اور امن عالم' کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے ساحر لدھیانوی کے تصور امن اور آزادی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو نے ہمیشہ امن وآشتی کا پیغام دیا ہے۔ جنگ کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ ناانصافی، جبر و استحصال کے خلاف اردو ہمیشہ متحرک رہی ہے۔ انھوں نے ساحر کے فلمی نغموں میں امن کے حوالے پر بھی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر سید احمد قادری گیا نے 'اردو افسانے میں پانی کی قلت' کے مسئلے پر اپنا گراں قدر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے پانی کے مسئلے کو بڑا اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ براہ راست انسانی زندگی سے جڑا ہوا مسئلہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ پانی قدرت کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ پانی سماجی وراثت ہے۔ بند بوتل اور منرل واٹر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پانی کے سوداگروں نے امیروں کو منرل واٹر دیا اور غریب اب گندہ پانی پینے پر مجبور ہے۔ انھوں نے پریم چند سے لے کر آج تک کے نئے افسانہ نگاروں کے

یہاں پانی کے مسئلے پر لکھے گئے افسانوں کا جائزہ لیا۔ اس مضمون کو بہت زیادہ پسند کیا گیا کہ یہ بالکل ایک نئے زاویے پر مبنی تھا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو لکاتا کیمپس کے ریجنل ڈائرکٹر اور مجلّہ 'تمثیل نو' دربھنگہ کے اعزازی ایڈیٹر ڈاکٹر امام اعظم نے اکیسویں صدی میں اردو زبان کی عالمگیر مقبولیت پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے مختلف ممالک سے شائع ہونے والے اردو اخبارات اور رسائل کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اردو عالمی رابطے کی زبان ہے۔ قومی یک جہتی اور اتحاد کا نشان اور یہ اظہار کا بہترین مرقع ہے۔ قطر کے مسعود انور نے موجودہ عالمی تناظر میں اردو زبان کے حوالے سے گفتگو کی اور اس کے تولیدی عمل سے تخلیقی اطوار تک کا مکمل جائزہ لیا۔ امریکہ کے ڈاکٹر عبداللہ نے شمالی امریکہ میں خواتین شعرا کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ خواتین شعرا نے جن موضوعات کو منتخب کیا ہے وہ مرد شعرا سے مختلف ہیں۔ خواتین نے صرف عورت کے جسم میں ہونے والی

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو: مشہور گلوکارہ اندرا نائک صوفیانہ کلام پیش کرتے ہوئے

تبدیلیوں کو ہی موضوع نہیں بنایا بلکہ ماحولیات پر بھی اچھی شاعری کی ہے۔ انھوں نے شمالی امریکہ کی خواتین شاعرات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں کی خواتین مینو پاز، کلوننگ، استحصال، عصمت دری، تہذیبوں کا تصادم، صارفیت اور گلوبلائزیشن سے پیدا ہونے والی کیفیت، امن عالم جیسے موضوعات پر بھی شاعری کر رہی ہیں۔

اس سیشن کی مجلس صدارت میں پروفیسر صغیر افراہیم، عتیق انظر، محمود الاسلام، رحمت علی، مہتاب قدر، رضا حیدر اور احمد اشفاق تھے۔ ان صدور نے تمام مقالات پر اظہار خیال کیا۔ ماریشس کے رحمت علی نے اس موقعے پر صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان پوری دنیا میں اپنا پرچم بلند کر رہی ہے۔ انھوں نے یہ بھی خوش کن اطلاع دی کہ فرانسیسی لغت میں ہر سال اردو الفاظ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ معروف ادیب و شاعر مہتاب قدر نے قاری کی کم ہوتی ہوئی تعداد پر تشویش کا اظہار کیا تو احمد اشفاق نے کہا کہ اردو سے مایوس و ناامید ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مقبول شاعر و ادب عتیق انظر نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ قبروں پر کتبے ہندی میں لکھے جا رہے ہیں۔ صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پروفیسر صغیر افراہیم نے بہت پرمغز خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج کے اس دور میں مزاحمت نہیں مفاہمت کی ضرورت ہے اور ہندو مسلمان دو کردار نہیں ہیں۔ انھیں بلا وجہ الگ الگ کرداروں میں دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اردو زبان اتحاد اور یگانگت کی زبان ہے اور یہی اس کی مقبولیت کی بھی دلیل ہے ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی کی نظامت میں اس سیشن کا سلسلہ ختم ہوا اور اس کے بعد کے سیشن کا آغاز ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ پروفیسر بیگ احساس، مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور معروف نقاد پروفیسر اعجاز علی ارشد، ممتاز ڈرامہ نگار جاوید دانش، معروف ناقد ڈاکٹر صفدر امام قادری اور ہریانہ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر نریندر جیسی معتبر شخصیات کی صدارت اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر مشتاق قادری کی نظامت میں ہوا۔ اس سیشن میں پروفیسر ناشر نقوی (پٹیالہ)، احمد اشفاق (قطر)، کندن لال کندن (دہلی)، سہیل انجم (دہلی)، پروفیسر غضنفر (دہلی)، پروفیسر سجاد حسین (چینئی)، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی (علی گڑھ)، مظفر حسین سید (دہلی) نے مقالات پیش کیے۔

ناشر نقوی نے 'اردو مراثی میں عالمی مسائل' کے عنوان سے پرمغز مقالہ پڑھا اور عالمی مسائل پر مربوط گفتگو کی۔ انھوں نے پروفیسر وحید اختر کے کربلا تا کربلا پر خصوصی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جدید مرثیہ نگاری میں موضوعات کے حوالے سے وحید اختر ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے عصر نو سے کربلا کو جوڑتے ہوئے آج کے کرب و بلا کو بھی پیش کیا۔ احمد اشفاق نے 'اردو شاعری میں ہندوستانی تارکین وطن' پر گفتگو کرتے ہوئے تنہائی کا احساس، کرب اور ہجرت پر مبنی اشعار کے حوالے سے یہ واضح کیا کہ ہجرت کی وجہ سے مہجری ادب وجود میں آیا اور یہ یقیناً ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ کندن لال کندن نے 'رباعیات میں عالمی مسائل' پر مقالہ پڑھتے ہوئے یہ واضح کیا کہ صرف رباعیات نہیں اردو کی دیگر اصناف میں بھی عالمی مسائل کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ وائس آف امریکہ کے نمائندہ مشہور صحافی سہیل انجم نے 'عالمی مسائل اور اردو اخبارات' کو اپنا محور بنا کر اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں بتایا کہ سرسید کے زمانے ہی سے اردو رسائل و اخبارات میں عالمی مسائل کو جگہ دی جاتی رہی ہے۔ سرسید نے باضابطہ طور پر بین الاقوامی واقعات اور حالات پیش کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات میں ہمیشہ عالمی مسائل کو ترجیحی طور پر شائع کیا گیا ہے اور اس باب میں اردو اخبارات کا امتیاز یہ ہے کہ یہ ملک کے مفادات کو مقدم سمجھتے ہیں۔ پروفیسر غضنفر علی نے 'حاشیائی ادب' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ حاشیائی طبقات کا مسئلہ ان کی بقا اور وجود کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ آج یہ بحث چل رہی ہے کہ جو دلت نہیں وہ دلت ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حاشیے کے کرب کو مرکز محسوس نہیں کر سکتا۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ ادیب اگر حساس ہے تو زندگی حاشیے پر ہو یا مرکز میں،

اردو ہے میرا نام میں خسرو کی پہیلی: 'میں اردو ہوں' ڈرامے کا خوبصورت منظر

محسوس ضرور ہوگی۔ اس موقعے پر پروفیسر سجاد حسین نے 'اردو سفرناموں میں طنز و مزاح'، قمرالہدیٰ فریدی نے 'اردو داستانوں میں عالمی مسائل' اور مظفر حسین سید نے 'مذہبی مفاہمت اور سرسید احمد خاں' کے حوالے سے مقالات پیش کیے۔ یہ تمام مقالات اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم تھے۔ بیشتر مقالہ نگاروں نے بہت سے اہم نکات کی طرف اشارے کیے جن پر مزید گفتگو ہوسکتی ہے۔

شام میں عالمی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعر نور امروہوی نے کی جو امریکہ سے تشریف لائے تھے اور نظامت کے فرائض قاسم خورشید نے انجام دیے۔ اس مشاعرے میں پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر غضنفر، پروفیسر کلیم ضیا، کندن لال کندن، نریندر کمار، جاوید دانش، مہتاب قدر، شاہد لطیف، مقصود انور، احمد اشفاق، ڈاکٹر عبداللہ، عتیق انظر، اعجاز اسد، مجاہد فراز، وجے تیواری، شعیب رضا فاطمی اور محترمہ صبا عزیز جیسے معتبر شعرا نے اپنے کلام بلاغت نظام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

26 مارچ 2018

دن بدلتا ہے تو تصویر بھی بدل جاتی ہے۔

مگر 26 مارچ کی تصویر تقریباً ویسی ہی تھی۔ لوگوں کا ویسا ہی ہجوم تھا۔ غیرملکی اور ملکی مندوبین کی ایک بڑی تعداد ہال میں موجود تھی۔ پہلے سیشن کا آغاز ہوا جس کی مجلس صدارت میں قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی (دہلی)، خواجہ عبدالمنتقم (دہلی)، عنایت حسین عیدن (ماریشس)، سید فیصل علی (سابق گروپ ایڈیٹر، راشٹریہ سہارا، دہلی)، امتیاز احمد کریمی (ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ)، ڈاکٹر مشتاق احمد (مدیر 'جہان اردو' دربھنگہ) جیسی معتبر شخصیتیں شامل تھیں۔ نظامت کے فرائض انجم عثمانی انجام دے رہے تھے۔ اس سیشن میں احمد جاوید (ریزیڈنٹ ایڈیٹر 'انقلاب' پٹنہ)، ڈاکٹر تنویر حسین (استاد شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری (صدر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)، ڈاکٹر رحمت علی (ماریشس)، پروفیسر کلیم ضیا (ممبئی)، ڈاکٹر الطاف حسین (کشمیر)، ڈاکٹر محمود الاسلام (بنگلہ دیش)، ڈاکٹر زاہدالحق (حیدرآباد)، مسز حفصہ (بنگلہ دیش)، ڈاکٹر دبیر احمد (کولکاتا)، عتیق انظر (قطر)، مہتاب قدر (جدہ)، ابوذر ہاشمی (کولکاتا)، رام واسودیو پنڈت (ممبئی) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ احمد جاوید نے 'مذہبی اور لسانی شدت پسندی اور نقل مکانی' کے حوالے سے گلوبلائزیشن کی پیدا کردہ پیچیدگیوں اور ثقافتی تہذیبی تصادم اور مذہب و ثقافت کو لاحق خطرات کے حوالے سے پرمغز گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ کامیو اور سارتر نے نجات دیدہ و دل کی راہ دکھانے کی ذمے داری بخوبی ادا کی تھی۔ مگر کیا ہمارے عہد کے ادیبوں کو اپنی ذمے داریوں کا احساس ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ادیبوں نے اپنی ذمے داریاں ادا کی ہوتیں تو آج دنیا کی حالت اتنی بدتر نہ ہوتی۔ ڈاکٹر تنویر حسین نے اردو کی طنزیہ شاعری میں عالمی مسائل' کے حوالے سے مقالہ پڑھتے ہوئے طنزیہ شاعری میں ان تمام مسائل کا احاطہ کیا جو انسانی حیات و کائنات سے جڑے ہوئے ہیں۔ اسلم جمشید پوری نے 'اردو اور عصری ٹیکنالوجی' پر بہت ہی پرمغز گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں انٹرنیٹ کا استعمال برق رفتاری سے ہو رہا ہے۔ عصری ٹیکنالوجی میں اردو

موومن نے سجائی مرے خوابوں کی حویلی: شیریں اور دلکش زبان کی ڈرامائی پیشکش

پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال اظہار تشکر کرتے ہوئے

نے کافی ترقی کی ہے۔ اس کے معیار و وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے بہت سارے اخبارات و رسائل اور اشاعتی اداروں کا حوالہ دیا اور کہا کہ یہ تمام رسائل نہ صرف عصری ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں بلکہ عصری تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال رہے ہیں۔ رحمت علی نے 'اردو ڈرامے میں زندگی کے مسائل' پر گفتگو کی۔ جبکہ پروفیسر کلیم ضیا نے 'فلموں میں امن و یکجہتی' کے تعلق سے اپنا مقالہ پڑھا۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ پہلے ہندی فلموں میں قومی یکجہتی اور امن کو ملحوظ رکھا جاتا تھا مگر اب رواداری اور امن کا تصور ختم کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو زندہ رکھنے میں فلم کا بہت اہم کردار ہے۔ الطاف حسین نے 'اردو اور کشمیری زبان کا تہذیبی و لسانی رشتہ' پر گفتگو کرتے ہوئے کشمیر میں اردو اخبارات و رسائل اور شعرا کا ذکر کیا اور یہ بھی واضح کیا کہ کشمیر کے زیادہ تر تخلیق کار اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور اردو اور کشمیری میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ محمود الاسلام نے 'بنگلہ دیش میں اردو کے فروغ میں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کا جائزہ' لیتے ہوئے کہا کہ وہاں کے مختلف اداروں میں اردو زبان و ادب نہ صرف زندہ ہے بلکہ تابندہ ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی اور راج شاہی یونیورسٹی میں اردو شعبے میں چار سو سے زائد طلبہ ہیں۔ وہاں سے اردو میں تحقیقی مجلّات بھی شائع ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر زاہد الحق نے 'تصوف اور امن عالم' پر نہایت پرمغز اور اثر انگیز مقالہ پڑھا اور یہ واضح کیا کہ تصوف نے ہمیشہ امن اور یکجہتی کی تعلیم دی ہے اور صوفیائے کرام نے اتحاد و یگانگت کو فروغ دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ رام واسودیو پنڈت نے 'اردو شاعری میں دلتوں کے مسائل' پر اپنا مقالہ پڑھا اور دلتوں کے درد سے لوگوں کو واقف کرایا۔ مسز حفصہ نے 'ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو کی تدریس' کے حوالے سے مقالہ پڑھتے ہوئے وہاں کے نصاب اور وہاں کے ادبا اور شعرا کا مبسوط تذکرہ کیا اور مختلف اصناف کے حوالے سے وہاں کے ادیبوں اور دانشوروں کی خدمات کا احاطہ کیا۔ اس مقالے سے بہت سی ان شخصیات کے نام ذہن میں روشن ہو گئے جنھیں شاید اردو ادب کے صفحات میں جگہ نہیں مل سکی ہے۔ ڈاکٹر دبیر احمد نے 'اردو شاعری میں تصوف کے عناصر' پر مقالہ پڑھا اور تصوف کے تعلق سے بہت ہی سیر حاصل گفتگو کی۔ عتیق انظر نے 'ادب مہجر' پر روشنی ڈالی اور اپنے مقالے میں کہا کہ اردو ہندوستان کی وہ زبان ہے جو تمام برادران وطن کو کشمیر سے کنیا کماری تک متحد رکھنے کی طاقت رکھتی ہے۔ یہ خلیجی ممالک میں رابطے کی بڑی زبان ہے۔ یہ امن و محبت کا پیغام دیتی ہے۔ یہ زبان محبت کی تہذیب سکھاتی ہے۔ یہ رواداری کی تعلیم دیتی ہے۔ آدمی سے انسان بناتی ہے۔ معاملات کی اخلاقیات سکھاتی ہے۔ اردو کی فطرت میں محبت، اتحاد اور مساوات ہے۔ مہتاب قدر نے 'اردو شاعری کے حوالے سے امن اور تصوف' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ امن ہر شخص کی ضرورت ہے۔ امن کے قیام کے لیے بزرگوں، صوفیوں اور سنتوں نے کافی کوششیں کی ہیں۔ انسانی تکریم، محبت کے گیت اور بھائی چارگی کے نغمے سے معمور اردو زبان نے ہر دور میں امن کا پیغام دیا ہے۔ ابوذر ہاشمی نے 'جنگ، ایٹم بم، اور اردو افسانے' پر پرمغز مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ بہت سارے افسانے ایٹمی جنگ کی تباہیوں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں اور اردو افسانوں میں ہمیشہ انسانی اخلاقی اقدار کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو کے فنکاروں کا رویہ ہمیشہ جنگ اور تشدد مخالف رہا ہے۔ اردو میں تشدد مخالف بیانیے کی موجودگی اس کا واضح ثبوت ہے۔ مجلس صدور میں سے خواجہ عبدالمنتقم نے قومی اردو کونسل کے وسیع تر ہوتے دائرے اور مقالہ نگاروں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو عالمی کونسل برائے فروغ اردو زبان کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اردو صرف گل و بلبل، جام و مینا کی زبان نہیں ہے۔ اس میں سماجی، معاشی اور دیگر اہم امور کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرزا غالب نے بہت پہلے حقوق انسانی کی بات کی تھی اور سیکولرزم کا تصور بھی غالب کے زمانے میں موجود تھا۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل نے قانون اور حقوق انسانی پر معتبر کتابیں شائع کی ہیں جبکہ اردو میں قانون کی طرف کم دھیان جاتا ہے۔ دیگر صدور میں سے ڈاکٹر مشتاق احمد اور عنایت حسین عیدن نے بھی اظہار خیال کیا اور قومی اردو کونسل کی منعقدہ کانفرنس اور اس کے موضوع کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کا دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے ہندوستان سے دنیا کے بیشتر علاقوں تک کا سفر بڑی خوبصورتی کے ساتھ طے کیا ہے۔ اب کوئی بھی علاقہ اردو کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ اردو کا جس طرح آفاقی تناظر ہے اسی طرح اردو کو ایک عالمی مقام بھی حاصل ہوتا جا رہا ہے۔

اس سیشن کے بعد اختتامی اجلاس کا آغاز ہوا جس کی مجلس صدارت میں کیرن گریس روفل (امریکہ)، ڈاکٹر معراج میر (وائس چانسلر سینٹرل کشمیر یونیورسٹی)، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ (سابق ڈائرکٹر قومی اردو کونسل دہلی)، پروفیسر عتیق اللہ (سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)، قدوس جاوید (سابق صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی)، نند کشور وکرم (دہلی)، منوری بیگم (معروف

شام سخن: ہند اور بیرون ہند کے شعرائے کرام

سماجی کارکن تمل ناڈو) جیسی شخصیتیں تھیں۔ ان تمام شخصیات نے کانفرنس کے موضوع، اس میں پیش کردہ مقالات اور قومی اردو کونسل کی حسن کارکردگی کے حوالے سے باتیں کیں۔ مندوبین نے کونسل کے حسنِ انتظام کو سراہا اور یہ واضح کیا کہ کانفرنس کا مقصد ایک دوسرے کے افکار و نظریات سے استفادہ کرنا ہے۔ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کو سمجھنا ہے اور اسی مقصد کے تحت اس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے کانفرنس بہت کامیاب رہی کہ غیر ملکی مندوبین اور ہندوستانی ادبا اور عوام سے ایک بہتر رابطے کی صورت نکلی اور ایسے ہی رابطوں سے زبان و ادب کے فروغ کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ اسی طرح کے رابطوں سے اردو نے ارتقائی سفر طے کیا ہے۔ اگر رابطوں کا یہ سلسلہ نہ ہوتا تو اردو ایک خاص خطے اور علاقے تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی۔ سینٹرل کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر معراج میر نے اردو کے تئیں اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اس وقت بیدار ہونے کی شدید ضرورت ہے ورنہ اردو کا وجود مٹ جائے گا۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ ٹیکنالوجی کے منفی اثر کو ہمیں پازیٹو ڈائمنشن دینا ہے تبھی ہم آج کے عصری چیلنجز کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ممتاز ناقد پروفیسر عتیق اللہ نے اس کانفرنس کو ایک ادبی میلے سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ایک دوسرے کے خیالات سے ہم نے استفادہ کیا اور یہ اوپن انڈیڈ ہوتا ہے۔ یہ دور کثیر العلومی دور ہے۔ علم کی وحدتیں اور حدود ختم ہو گئی ہیں۔ اطلاعات کی زیادتی، بازارکاری، صارفیت کے محور پر ہمارا سماج گردش کر رہا ہے۔ ایسے میں ہمیں بہت زیادہ سنجیدگی کے ساتھ صورت حال پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بزرگ افسانہ نگار اور عالمی ادب کے مدیر نند کشور وکرم نے کہا کہ تقسیم سے قبل ہند و پاک کے تمام اسکولوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی تھی اور ہندی صرف عورتوں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کے اساتذہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دیتے جس سے اردو کا دائرہ، تعلیم اور تدریس کی سطح پر سمٹتا جا رہا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے موضوع کی معنویت اور اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ آج کا اردو ادب فرسودگی کا شکار نہیں ہے وقت کی نبض پر اردو کا ہاتھ ہے اور اب ادبی زاویے سے زیادہ سماجی اور ثقافتی زاویے سے گفتگو کی گنجائش ہے۔ تمل ناڈو کی محترمہ منوری بیگم نے کہا کہ اردو قیامت تک زندہ رہنے والی زبان ہے۔ انھوں نے اردو میں ابتدائی تعلیم دینے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تمل ناڈو جیسے علاقے میں جو غیر اردو علاقہ ہے۔ 30 اضلاع میں سے 10 اضلاع میں اردو بولی جاتی ہے اور وہاں پانچ سو (500) سے زائد اردو کے اسکول ہیں اور کئی کالجز ہیں جہاں اعلیٰ سطح پر اردو کی تعلیم و تدریس اور تحقیق کا انتظام ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے اس موقعے پر کہا کہ جس مقصد کے لیے اس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا اس میں کونسل کو مکمل کامیابی ملی ہے کیونکہ یہ کانفرنس اردو کا اعلان نامہ ہے اور یہ حکومت کے منشور کے مطابق

ذرا سی شام ہونے دو: مشاعرے میں اپنا کلام سناتے ہوئے

اعجاز اسد (سری نگر)

صبا عزیز (نوئیڈا)

شعیب رضا فاطمی (دہلی)

وجے تیواری (بھوپال)

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو : سامعین کا ایک منظر

ہے۔ اس کے ذریعے ہماری خارجہ پالیسی کو ایک نئی جہت ملے گی۔ یہ کانفرنس پوری دنیا کو یہ پیغام دینے میں کامیاب ہے کہ ایک ایسا ملک جہاں اکثریت غیر اردو داں طبقے کی ہے وہاں بھی یہ زبان آٹھویں شیڈول میں شامل ہے۔ اس کانفرنس میں جو تین بڑے موضوعات طے کیے گئے تھے۔ زبانوں کے مسائل اور عالم کاری، تصوف اور امن عالم، معاصر دنیا اور اردو زبان و ادب۔ ان تینوں موضوعات کے ذریعے اردو کونسل ہندوستان کے بڑے مقاصد کی تکمیل کر رہی ہے اور یہ بتا رہی ہے کہ اردو صرف کلاس روم یا شاعری تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ سماجیات، اقتصادیات اور دیگر علوم و موضوعات تک پھیلا ہوا ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے تمام مندوبین اور مہمانان کرام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ معاصر دنیا میں انسانی حیات و کائنات سے جڑے ہوئے تمام اہم مسائل اردو زبان و ادب کے شعور و احساس کا حصہ رہے ہیں۔ گلوبلائزیشن نے جن مسائل کو جنم دیا ہے ان مسائل کی تفہیم و تعبیر کے لیے اردو زبان میں وافر مواد موجود ہے۔ اردو نے علاقائی یا قومی مسائل نہیں بلکہ عالمی مسائل کو اپنی تخلیقی فکر و دانش کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اپنے ملک اور مٹی سے اردو زبان کی بہت ہی گہری وابستگی رہی ہے۔ ہمارے ادیبوں نے ہندوستان کے مشترکہ تہذیبی اقدار کی بقا کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ اس کانفرنس کے ذریعے یہی پیغام عام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اختتامی اجلاس کے بعد ایس این لال کا لکھا ڈرامہ 'میں اردو ہوں' پیش کیا گیا جس کے ہدایت کار اطہر نبی لکھنؤ ہیں۔ اس ڈرامے نے ناظرین کا دل موہ لیا۔ اس ڈرامے میں اردو کے آغاز و ارتقا کی ڈرامائی پیشکش نے بہت سے لوگوں کو جذباتی بنا دیا۔ اس ڈرامے میں جن لوگوں نے کردار ادا کیے ان کی تمام ناظرین نے بے حد ستائش کی۔ یہ ڈرامہ اتنا دلنشیں اور خوبصورت تھا کہ ہر ایک کی نگاہ اردو کے اسی رخ جمال پر ٹھہری گئی... ڈرامہ دیکھ کر اقبال اشہر کی ایک پیاری سی نظم ذہن میں گونجنے لگی:

اردو ہے مرا نام میں خسرو کی پہیلی
میں میر کی ہمراز ہوں غالب کی سہیلی
دکن کے ولی نے مجھے گودی میں کھلایا
سودا کے قصیدوں نے مرا حسن بڑھایا
ہے میر کی عظمت کہ مجھے چلنا سکھایا
میں داغ کے آنگن میں کھلی بن کے چنبیلی

اردو ہے میرا نام میں خسرو کی پہیلی

غالب نے بلندی کا سفر مجھ کو سکھایا
حالی نے مروت کا سبق یاد دلایا
اقبال نے آئینۂ حق مجھ کو دکھایا
مومن نے سجائی میرے خوابوں کی حویلی

اردو ہے میرا نام میں خسرو کی پہیلی

ہے ذوق کی عظمت کہ دیئے مجھ کو سہارے
چکبست کی الفت نے مرے خواب سنوارے
فانی نے سجائے مری پلکوں پہ ستارے
اکبر نے رچائی میری بے رنگ ہتھیلی

اردو ہے میرا نام میں خسرو کی پہیلی

اجمل سعید سند تحسین سے سرفراز

'ई-किताब' ऐप लॉन्च, पढ़ सकेंगे उर्दू की किताबें

पांचवां विश्व उर्दू सम्मेलन सोमवार तक चलेगा

NOW, ACCESS URDU POETRY ON E-KITAB AAP

AGE CORRESPONDENT
NEW DELHI, MARCH 24

The 5th World Urdu Conference, which kicked off here on Saturday, would discuss the effort for the promotion of Urdu language globally. The tree day conference is being organised by the National Urdu Development Council. On the first day of the conference an "e-kitaab" app was launched on which all the books of the council will be available and can be easily read and downloaded. Urdu scholars, poets, journalists and those familiar with the Urdu language are participating in the conference. While speaking on the occasion, Iritija Karim, Director of the National Council for Promotion of Urdu Language...

New app to let Urdu enthusiasts access books, magazines

New Delhi: Those interested in Urdu can now access some of the famous works of literature, philosophy and culture on their phones and laptops. The National Council for Promotion of Urdu Language (NCPUL) on Saturday launched a first ever ePub book reader — 'eKitab' — where users can access books and magazines from the online library of NCPUL and soon from the Sahitya Akademi.

The director of NCPUL said that for people who reside outside India, there are not enough options for learning Urdu and staying connected with it. "But with this new app over 1,100 books and magazines from NCPUL library can be downloaded and read in both English and Nastaleeq script," he said. These include the complete works of literary writers like Munshi Premchand, Meer Taqi Meer, Mirza Ghalib, Balwant Singh, Akbar Allahabadi, and even the works of famous poets and critics like Gulzar.

पांचवां विश्व उर्दू सम्मेलन शुरू, ई-किताब एप लांच

'دی ٹائمز آف انڈیا' 'دی ایشین ایج' 'نو بھارت ٹائمز' اور 'دینک جاگرن' جیسے انگریزی اور ہندی کے اخبارات نے بھی ای۔پب کی ستائش کی۔

یہ تین روزہ کانفرنس بہ حسن وخوبی نقطہ اختتام تک پہنچی تو منتظمین نے راحت کی سانس لی۔ اس کانفرنس کی کامیابی میں ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے علاوہ پرنسپل پبلی کیشن آفیسر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر ایڈمین کمل سنگھ، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک محترمہ شمع کوثر یزدانی، جونیئر ایڈمنسٹریشن اکاؤنٹ آفیسر محمد احمد، ڈاکٹر کلیم اللہ، شاہنواز خرم، انتخاب عالم، ڈاکٹر فیروز عالم، اجمل سعید، ڈاکٹر عبدالحی، افضل حسین، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری، ڈاکٹر عبدالرشید اور کونسل کے پورے عملے کی شب وروز کی محنت شامل تھی۔

کانفرنس سے جہاں علمی، ادبی، ثقافتی سطح پر بہت سے فائدے ہوئے وہیں ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ بہت سی باتیں جو Logically Incomprehensive ہیں ان کا ازالہ ہوا۔ اردو اور مسلم تشخص کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں دور کی گئیں۔ اردو کے محدود لسانی، لغوی اور علمی دائرے کے تعلق سے جو ایک خیال ذہنوں میں پنپ رہا تھا اس کو بھی دور کیا گیا اور بہت سے نئے نکات سامنے آئے جس سے پتہ چلا کہ اردو زبان کا مستقبل تاریک نہیں بلکہ روشن ہے۔ تقسیم ملک کے بعد جو زبان مٹھی بھر زمین کے لیے بھٹکتی رہی، اب اس کے پاس بہت سی زمینوں کی زرخیزی اور بہت سے زمانوں کے جوہر ہیں۔ یہ سبھی کے لیے خوشی کی بات ہے۔

اطمینان کی بات یہ بھی تھی کہ اس کانفرنس کی خبریں ہندوستان کے طول وعرض سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کے علاوہ انگریزی اور ہندی کے اخبارات اور نیوز پورٹل میں بھی بہت اہتمام کے ساتھ شائع کی گئیں۔ خاص طور پر قومی اردو کونسل کے ای۔پب کے اجراء کی خبر نمایاں طور پر شائع کی گئی اور کونسل کے اس قدم کی ستائش کی گئی کہ اردو اس ڈیجیٹل ایج میں عصری ٹکنالوجی سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوگئی ہے اور یہ اردو کے تابناک مستقبل کی ایک روشن علامت ہے۔ یقینی طور پر اردو اب اس نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے جس پر عالمی زبانیں پہنچ چکی تھیں۔ اردو اور ٹکنالوجی کی اس ہم آہنگی سے اب کامیابی کی نئی عبارتیں لکھی جائیں گی اور اردو کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔

تین دن تک جو مقالے پڑھے گئے ان سے نئے دریچے کھلے، نئے ذر وا ہوئے، ذہنوں میں کچھ نئے چراغ روشن ہوئے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ اردو محبت کا ایک روشن استعارہ ہے اور یہ ہمیشہ روشن ہی رہے گا۔ اس نے تیرگی کو شکست دی ہے، تاریکی کو ماند کیا ہے۔ ذہنوں کو اجالوں کی سوغات دی ہے اس لیے یقین ہے کہ یہ ستارہ کبھی غروب نہیں ہوگا، ہمیشہ پوری دنیا کے ذہنی افق پر اسی طرح روشن رہے گا۔

روشنی کے اسی احساس کے ساتھ پانچویں عالمی اردو کانفرنس کا آغاز ہوا تھا اور اس امید کے ساتھ اس کا اختتام ہوا کہ اردو کی روشنی دور دور تک پہنچے گی۔ ہر سو اجالا ہوگا، ہر طرف محبت کی خوشبو ہوگی کیونکہ اردو اور خوشبو الگ الگ نہیں ہیں دونوں ایک دوسرے کے وجود میں پیوست ہیں۔ شاعروں نے خوب کہا ہے:

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے
(احمد وصی)

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو
(بشیر بدر)

سلیقے سے ہواؤں میں جو خوشبو گھول سکتے ہیں
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اردو بول سکتے ہیں
(نامعلوم)

خوشبو سے اردو زبان کا جو رشتہ ہے وہ کبھی ختم نہیں ہوگا اور یہی خوشبو ہے جس کی وجہ سے اردو ہر دل میں رچی بسی ہوئی ہے۔

■

Haqqani Al-Qasmi
B-145/8, Fourth Floor, Thokar No.:8
Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.:9891726444

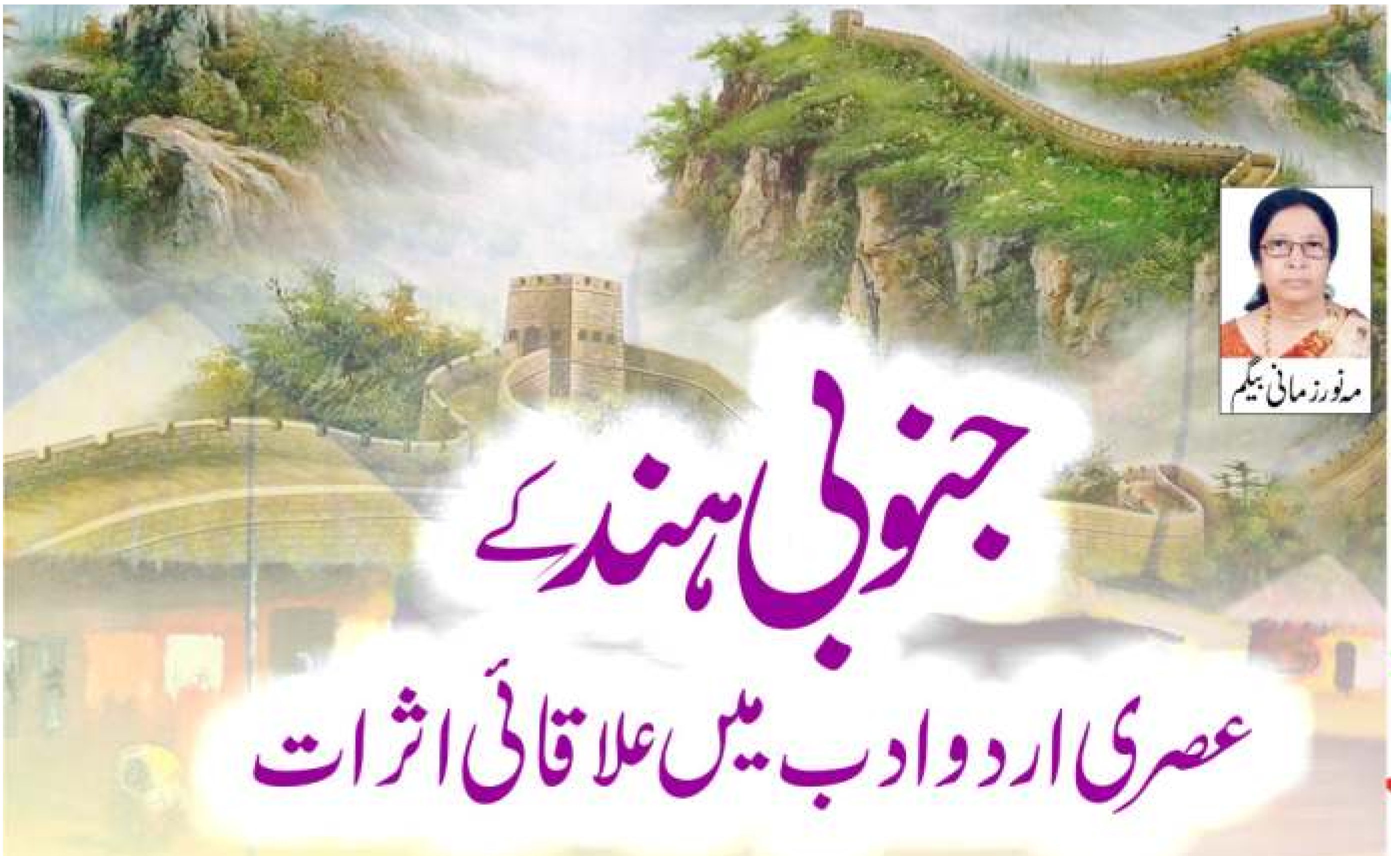

مہ نور زمانی بیگم

جنوبی ہند کے
عصری اردو ادب میں علاقائی اثرات

ادب میں علاقائی اثرات زبان اور مواد دونوں میں ملتے ہیں۔ جہاں تک زبان پر پائے جانے والے علاقائی اثرات کا سوال ہے ان ریاستوں میں کنڑ، تلگو، تمل اور ملیالم ہی نہیں بلکہ مرہٹی زبانوں کے اثرات شروع سے ہی اردو زبان کے ڈھانچے پر اس طرح سے اثر انداز رہے ہیں کہ یہاں بولی جانے والی اردو زبان 'دکنی' کے مخصوص نام سے جانی جاتی ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 1985 سے بہت پہلے ہی جنوبی ہند کے کئی ادباء وشعرا نے معیاری اردو کے استعمال پر پوری قدرت حاصل کرلی تھی۔ چنانچہ پچاسی تا حال کے جنوبی ہند کے اردو ادب میں علاقائی اثرات کی تلاش یہاں کے شعری اور تنقیدی سرمایے میں بے سود ہے۔ اس دور تک کرناٹک اور حیدرآباد میں محمود ایاز، خالد عرفان، مغنی تبسم، سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر سیدہ جعفر وغیرہ کئی احباب کی ادبی تنقیدوں نے شمالی ہند اور پاکستان سے شائع ہونے والے موقر رسائل میں جگہ بنالی تھی لیکن فکشن میں آج بھی علاقائی اثرات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اگر ہم یہاں کے فکشن کا جائزہ لیں تو نہایت خوش کن نتائج سامنے آتے ہیں اور ادب میں علاقائیت کی تلاش کا عمل معتبر محسوس ہونے لگتا ہے۔

درحقیقت علاقائی اثرات ہر ادیب کا اٹوٹ حصہ ہوتے ہیں کیونکہ ادیب معاشرے کا حساس، دردمند اور دوربین فرد ہوتا ہے۔ ادیب وشاعر کا بچپن جس علاقے میں بسر ہوتا ہے اور وہ زندگی بھر جس علاقے میں رہتا بستا ہے وہاں کی زبان اور تہذیب وثقافت کے اثرات اس کے لاشعور میں اس طرح مرتسم ہوجاتے ہیں کہ اس کی تخلیقات میں کہیں نہ کہیں ان کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ادب میں علاقائی اثرات کا وجود ایک ایسا وصف ہے جو اپنے تخلیق کار کے، کسی مخصوص علاقے سے وابستہ ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

تو آیئے میں بات شروع کرتی ہوں شمالی کرناٹک کے شہر ہبلی کے ایک مشہور افسانہ نگار ملاّ عبدالغنی کے ناولٹ 'نقشی کٹورا' سے! یہ ایک ایسا ناولٹ ہے جس میں مصنف نے انتہائی فنکاری کے ساتھ زبان اور مواد دونوں کے اعتبار سے علاقائیت کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کردی ہیں۔ اس میں بظاہر ایک ایسی پاگل عورت کی کہانی ہے جس کے تنے ہوئے خد وخال، چڑھی ہوئی بھوئیں اور لال لال آنکھیں دیکھ کر کوئی بھی عام آدمی اس کے قریب تک نہ پھٹکتا تھا، اور خود اس کے اپنے بچے اس کی جنگجو یانہ اور خونخوار اضطراری حرکتوں کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے۔ ملاّ عبدالغنی نے اس ناولٹ کے پردے میں بیجاپور، ہبلی اور دھارواڑ کی علاقائی معاشرت، زندگی کے شب وروز، تہذیب وثقافت، غربت، عظمت، توہم پرستی، زبان، روزمرہ، کہاوتوں اور چٹکلوں سب کو قلمبند کردیا ہے۔

وہاں پر استاد کو 'جناب' کہا جاتا ہے جیسے کہ ناولٹ میں جناب چھوٹے شاہ، جناب چھوٹے گدگ وغیرہ ہیں، تایا کو 'بڑے باپ' کہا جاتا ہے جو کہ کنڑ 'دوڈ اپا' کا ہو بہو اردو ترجمہ ہے۔ جب 'ہاں' کہنا ہو 'ھوئے' کہا جاتا ہے۔ 'ذ' اور 'ز' کی آواز کو 'ج' کی آواز سے ادا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اور قسم کی لسانی خصوصیات یہاں کی مخصوص دکنی اردو کے مزاج کا حصہ ہیں۔ لہذا شمالی کرناٹک کی اردو زبان کے مخصوص علاقائی اثرات سے مملو اس ناولٹ کے چند اقتباسات ہیں:

''اللہ کاں بسریا چنگا ماں اسے، برس پہلے پکتے ہوئے کھانے میں کنکر مٹی ڈالی، دو برس پچھے بڑے باپ کے نوے اچار جامے کو جلائی، تب بڑے باپ کیتی عاجزی سے پاؤں پکڑ کو بولے تھے ایسا کرو نکو ماں کرکو، انے چھوڑی تو بول۔'' (ص 72)

''وھئے......مجے معلوم...... مچھی کے بچے کو تیرنا شکانا کیا......'' (ص 42)

''میں بلا لے کو جاتوں تمنا کل سال کو...... بولو بھی، نیں تو دیکھو تجرت بھینساں چرانے لگا تمیں کتے۔''

''اجی خالہ اسے جرا دودھ پلاؤ جی، کل سے دودھ نیں پئے جی'' (ص 14)

ملاّ عبدالغنی نے شمالی کرناٹک کی زبان کے اس طرح کے جیتے جاگتے نقوش کے علاوہ جو معاشرتی تصویریں 'نقشی کٹورا' میں پیش کی ہیں اُن کا شائبہ آج بھی دھارواڑ، بیلگام اور بیجاپور کے علاقوں میں نمایاں طور پر

نظر آتا ہے۔ اس ناولٹ میں تعویز، فلیتے، پیروں، شہدوں، حکیموں اور ڈاکٹروں کے آستانوں پر سر جھکانے کا تذکرہ، بھوت پریت اتارنے والوں کا کہا ماننے کے واقعات، نئے رہن سہن کو اپنانے کی طرف بڑھائے جانے والے بے ہنگم اقدامات، اس علاقے میں پائے جانے والے پیشوں کی اونچ نیچ وغیرہ باتوں کو نہایت دلچسپی اور فنکاری کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ محرم میں ادا کی جانے والی رسومات کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں ''لوگ اپنے ہر دکھ کا علاج حضرت بی بی فاطمہ کی عودی کو مانتے تھے۔ چوکی کے سامنے ماتھا ٹیکتے، شرستانگ نمسکار کرتے، عودی کی ایک چٹکی جیبھ پر ڈالتے، گلے پر لگاتے، ماتھے پر ٹیکہ لگاتے، دعائیں دی جاتیں، منتیں مانی جاتیں اور فاتحہ پڑھی جاتی...... بکرے ذبح کر کے کندوری کی جاتی، ہڈے (ڈھائی سیر گڑ ڈھائی سیر مونگ پھلی کا تیل حضرت امام حسین کے نام نذر و نیاز کرنا) دیے جاتے۔'' پھر یہ کہ ''روایت کے مطابق تقریباً ہر مسلمان کے گھر میں پانچویں کو شربت، گھی کے بگھار کی مونگ کی کھچڑی اور سارے بیگن کا سوکھا سالن، تور کی دال یا گوشت کا سالن پکتا، ساتویں کو گھوڑے (ایک میٹھا پکوان) اور گوشت کا سالن اور گھی سے بگھارے چاول اور 'قتل' (یعنی محرم کی نویں تاریخ) کو ملیدہ اور بریانی، نیز نویں کو خاص طور سے مہندر گڑھ کے تقریباً ہر ہندو گھرانے میں محرم کا تہوار منایا جاتا۔ دن بھر روزہ رکھ کر نہا دھو کر لنگاتیوں اور برہمنوں، چھتریوں کے ہاں بھاجی، بیگن، روٹی، پھیکے چاول اور ملیدہ شربت تیار کر کے مغرب کے بعد بی بی فاطمہ کے نام عاشور خانے آکر فاتحہ نہ دلائی جاتی تو ان کے منہ میں کھیل تک اڑ کر نہ جاتی۔ ڈھیڑوں، چماروں، دھوبیوں کے گھر کندوریاں ہوتیں، بکرے کٹتے اور ان کی عورتیں نہا دھو کر دھلے دھلائے کپڑوں میں ملبوس ایک جگہ جمع ہو کر صبح ہی صبح رونا بین کرنا شروع کرتیں، بکرے کو بھی نہلا دھلا کر اس کے پاؤں میں صندل لگایا جاتا، پیشانی پر کُم کُم کی انگلیاں بٹھائی جاتیں اور گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے جاتے......'' (ص 61-62)۔ جنوب میں برسوں سے چلی آرہی قومی یکجہتی کی مستحکم روایات کو مٹانے کی جو کوششیں ہوتی رہی ہیں انھیں بھی ملا عبدالغنی نے بڑی دانشوری کے ساتھ اس ناولٹ میں سمیٹ لیا ہے (صفحہ 145)۔

اسی طرح ہبلی کے ایک اور مشہور افسانہ نگار اثل ٹھکر کے ہاں بھی علاقائیت کی بہت ساری مثالیں مل جاتی ہیں۔ ان کے ایک ڈرامے 'چوتھی دیوار' میں انھوں نے ایک پسماندہ ذات، اس کی بیوی اور اس کے ایک مسلمان دوست کے درمیان گفتگو کو پیش کرتے ہوئے جس زبان کا عکس پیش کیا ہے اس میں علاقائی اثرات کی نوعیت اس طرح ہے:

کملی: لوگن کی نیت جب خراب ہوئی تب ہوئی، مجھے تو بار نیت اچھی ناہیں لاگے ہے۔

کالو: کیوں کا فرک دکھے ہے تیرے کو؟

رجو: (باہر سے) کالو بھیا...(داخل ہو کر) کا بتیارے ہو ہمارا بھاوج سنگ؟

کالو: رجو آ بھئی آ۔ بیٹھ ادھر.....رجو، ایک بات بتا......تو بار جات کا ہے؟ وغیرہ

اوپر جو حوالے میں نے پیش کیے ہیں ان میں زبان کے اعتبار سے تو فنکاروں نے جان بوجھ کر اپنے اطراف واکناف کے علاقائی نقوش ابھارے ہیں لیکن جہاں تک ان کے بیانیہ میں ان کی اپنی زبان کا سوال ہے اس میں بھی کرناٹک کے اکثر فکشن نگاروں کے ہاں علاقائی اثرات کی دلیل کے طور پر کبھی جملوں کی ساخت میں صحت کی کمی نظر آتی ہے تو کہیں 'پر' 'نے' کے استعمال کی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ''انھوں نے اپنے بیٹے کو قریبی محلے کی اسکول کو لے گئے اور داخلہ کرادیا'' اور ''اُس نے ملا گیری کو چھوڑ بیٹھا تھا'' وغیرہ۔

ریاست کرناٹک کے ایک افسانہ نگار منظر قدوسی نے اپنے افسانوں کے مجموعے 'برگ آوارہ' (2010) میں کرناٹک کے علاقے شموگہ کے ایک دیہات کی معاشرتی زندگی کے دلچسپ مرقعے پیش کیے ہیں۔ ان کا افسانہ 'چاوڑی کا درخت' یہاں کی اوہام پرستی کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بچے کٹے 'تالاب کے آگے والے چاوڑی کے نہایت خوشبودار پھول توڑ لاتے تو عورتیں انھیں پہنتی نہیں تھیں بلکہ پتہ چل جائے تو دور سے ہی بھگا دیتی تھیں کیونکہ یہ خیال عام تھا کہ ہر پھول کی خوشبو سے ایک چڑیل لپٹی ہوتی ہے، چونڈے میں پھول لگاتے ہی وہ چڑیل جسم پر سوار ہو جائے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا اس کے تصور سے ہی عورتیں کانپ جاتی تھیں۔ (ص 37)

چاوڑ کیا تھا؟ اس کی بھی تصویر انھوں نے اس میں نہایت خوبی سے کھینچ دی ہے۔ یہ چاوڑ دراصل ایک میدان میں بنی ہوئی چار دیواری کے اندر نصب کیا ہوا سانپ کی مورت والا ایک پتھر تھا، اس گاؤں کے غیر مسلم اسے چاوڑی کہتے تھے۔ اس کے بازو میں جو درخت تھا اس میں سفید پھول لگتے تھے، وہی چاوڑی کے پھول تھے جن کی خوشبو سے سارا ماحول معطر ہو جاتا تھا۔ اک مرتبہ جب راوی کا دوست وزیر، دوستوں کے ساتھ کھڑی دوپہر کے وقت درخت پر چڑھتا ہے اور اتفاقاً نیچے گر پڑتا ہے تو اُس کے گھر پہنچنے کے بعد اس کی ماں یقین کے ساتھ کہتی ہے کہ شیطانوں کے ناچنے کے وقت تم لوگ چاوڑی کے پاس گئے تھے، شیطان نے ہی وزیر کو گرایا ہے۔ وہ پھر اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ چلو جا کر چاوڑی کو کُم کُم لگا آئیں ورنہ سانپ رات بھر کو اسے ستائے گا (ص 38)۔ برس میں ایک مرتبہ یہاں جاترا لگتا، بکرے کٹتے، ڈھول پیٹے جاتے، شنکھ پھونکے جاتے، کھانا پکتا اور خوب دھوم دھڑاکا ہوتا۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جو آج بھی کئی دیہاتوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہر سال ایک مقررہ دن میں 'اُوڑو ہبا' یعنی 'گاؤں کا میلہ' دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور شہروں میں کام کرنے والے ان دیہاتوں کے افراد دفتروں میں چھٹی لگا کر اس میں شریک ہوتے ہیں۔ غرض کہ 'چاوڑی کا درخت' افسانے میں علاقائیت کے مرقع خوبی کے ساتھ منعکس کر دیے گئے ہیں۔ اس میں اندھی عقیدت کو صالح روایت میں بدلنے کا سامان بھی موجود ہے۔ افسانہ نگار نے سماج کی پامال ہوتی ہوئی انسانی قدروں کو نئے راستوں پر ڈالنے کے لیے بھی اس افسانے میں اپنے فن کا استعمال کیا ہے۔

یہ تو رہیں خالص علاقائیت کی مثالیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی فکشن نگاروں کے ہاں جن کی تعداد بیسیوں تک پہنچتی ہے حوالوں اور اشاروں کی صورت میں علاقائی اثرات کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ وہ اپنے مختصر افسانوں میں بنگلور کے پس منظر میں یا کسی اور شہر میں نظر آنے والی معاشرتی قدروں کی پامالی کا احاطہ کر کے قاری کی فکر کو مہمیز کرتے ہیں۔

فرحت کمال، ضیا میر، فیاض قریشی، انیس الحق، جنئی سرور، یحییٰ نسیم، اثر سعید، ضیا کرناٹکی اور فریدہ رحمت اللہ وغیرہ کے افسانوں میں ہمیں کرناٹک کے شہر بنگلور کے یا کسی اور مقام کے پس منظر میں علاقائی اثرات کی اچھی خاصی جھلکیاں مل جاتی ہیں جیسے کہ فرحت کمال کے افسانے 'اجالے کہاں ہیں' اور 'چٹھی پیار کی' میں سٹی مارکیٹ، شیواجی نگر، گوشہ ہسپتال، ودھان سودھا وغیرہ جانے پہچانے مقامات سے بسیں گزرتی ہیں اور افسانہ نگار ان سے وابستہ مسائل کا نقشہ افسانے کہانی کی شکل میں پیش کرتا جاتا ہے۔ اسی طرح قاضی انیس الحق کے افسانوں میں ہری مسجد اور ہوٹل کوشس کی رنگین شامیں وغیرہ کئی باتوں کا ذکر نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

علاقائی اثرات فنکار کی تخلیقی قوتوں کو نئی منزلوں کی طرف رواں دواں کر دیتے ہیں۔ ہر ادیب اپنے اپنے

علاقائی اثرات کو اپنے فن میں سمیٹ کر آگے قدم بڑھاتے ہوئے آفاقیت کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ لہٰذا موضوع اور مواد کے اعتبار سے کئی ادب پاروں میں علاقائیت کا عمل دخل اس طرح سے نظر آتا ہے کہ یہ ادب پارے علاقائی اثرات کی منہ بولتی تصویریں ثابت ہونے کے علاوہ عمدہ معیاری ادب پاروں کے زمرے میں بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا علاقائیت کی حسین فضاؤں میں گذر بسر کرتے ہوئے اگر ایک ادیب یا شاعر غروب آفتاب کی پھولی ہوئی شفق کو سورج کے قتل کی گواہی سے تعبیر کرتا ہے تو اس کی ادبی تخلیق کے ڈانڈے جدیدیت اور آفاقیت سے مل جاتے ہیں اور قاری واہ کہنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ اکثر ہوتا یہی ہے کہ ادباء وشعراء علاقائیت کے نشیب وفراز سے گزر کر آفاقی سوچ کی ضیا سے آسمانوں کی بلندیوں پر اڑانیں بھرنے لگتے ہیں تو شاہکار ادب پارے وجود میں آجاتے ہیں۔

گلبرگہ کے ایک مشہور افسانہ نگار اکرام باگ کے افسانے اس بات کے مظہر ہیں کہ انھوں نے زندگی کی تصویروں میں علاقائی رنگ بھر کر حیات وکائنات کی صداقتوں کو اخذ کرنے کی ایسی کوشش کی ہے کہ ان کے قلم نے آفاقیت کی منزل کو چھولیا ہے۔ اکرام باگ کا افسانہ 'حیات' ایسا ہی ایک افسانہ ہے۔ اس کا راوی اپنے محلے کے گلیاروں میں بسنے والے معذور اور اپاہج افراد کے مشاہدے سے انسان کی جینے کی ہوس کا اندازہ لگاتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اس کی جینے کی ہوس نے ہی شاید روح کی عظمت کا فلسفہ ایجاد کیا ہوگا۔ (ص 13، افسانوں کا مجموعہ 'کوچ')۔ ایک کوڑھی کو پانچ سال سے گھسٹ گھسٹ کر جیتے ہوئے دیکھنے تک جو کہانی علاقائیت کی حدود میں آگے بڑھ رہی ہوتی ہے، آگے چل کر آفاقیت کی طرف 'کوچ' کر جاتی ہے۔ کئی حسی علامتوں کی مدد سے اکرام باگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کے راز نہ تو سماجیات کا پروفیسر جان سکتا ہے، نہ کوئی مذہبی عالم انھیں کھول سکتا ہے، نہ ہی سیاست میں ہر بات کو جائز سمجھنے والا سیاست دان انھیں پہچان سکتا ہے، نہ ہی کوئی سائنس دان ان کی حقیقت معلوم کرسکتا ہے اور نہ ہی یہ کسی مجنوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں، حیات تو ننگی دیواروں، خالی کمروں، کھلی چھت اور سونے فرش والے خالی کمرے کی طرح ہے۔ چنانچہ اکرام باگ کے افسانے اس بات کے مظہر ہیں کہ ادیب زندگی کی تصویروں کو علاقائی رنگوں میں ابھار کر حیات وکائنات کی سچائیاں عیاں کر دیتا ہے اور اپنے ادب پاروں کو آفاقیت کے شاہکار تسلیم کروالیتا ہے۔

ان کے افسانے علاقائیت سے گذر کر فلسفیانہ سوچ وفکر کی آئینہ داری کرتے ہیں، ان میں افسانہ نگار علاقائیت کے نشیب وفراز سے گزر کر آفاقیت کی ضیا حاصل کر لیتا ہے اور آسمانوں کی بلندیوں پر اڑانیں بھر کر عالمی قدروں کا نگارخانہ تخلیق کردیتا ہے۔ علاقائیت کا یہ عمل صرف اکرام باگ کے ہاں ہی نہیں بلکہ پورے ترقی پسند، جدید، مابعد جدید ہر قسم کے ادب میں کسی نہ کسی نہج پر اپنا چہرہ دکھاتا ہے۔ چنانچہ جدید نظموں کی شاعرہ شائستہ یوسف بھی قطب شاہ کے قلعے کے کھنڈروں کا نظارہ کرتی ہیں تو تنہائی کی لذت وکرب کے تجربے سے گزرتی ہیں اور اسے ''قطب شاہی قلعے کے کھنڈرات کی ایک شام'' کے بطور نظم قلم بند کرنے میں سکون محسوس کرتی ہیں۔

اسی طرح کرناٹک کے مشہور شاعر ماہر منصور کی نظم ''کمرشیل اسٹریٹ کی ایک شام'' میں ہمیں علاقائیت سے آفاقیت اور خارج سے باطن کی طرف سفر کرتا ہوا فنکار ملتا ہے۔ نظم ہے:

ہوا ہے قتل ابھی آفتاب تیرہ شکن/ بکھر گئی ہیں ہر یک سمت خون کی لہریں/ یہ رہ گزر ہے یا بہتا ہے نور کا دریا / ادھر اُدھر سے گزرتی ہوئی حسینوں کے/ گداز جسموں سے اٹھتی ہیں بھینی خوشبوئیں/ ہر ایک سمت سے آتا ہوا یہ جم غفیر/ نئی تراش کے ملبوس میں حسیں جوڑے/ چمکتی کاروں میں آ کے یوں اترتے ہیں/ نوازتے ہوں...... قدم رکھ کے...... جیسے دھرتی کو/...... ہر ایک دل میں مچلتا ہے آرزو کا لہو/ ٹھہر گیا ہے سبک گام کارواں حیات/ پڑی ہے پاؤں میں زنجیر دلفریبی کی/ ابھی گلی سے نکلنے کی دیر تھی ماہر/ میرے ضمیر نے چپکے سے یہ کہا مجھ سے/ اسی گلی میں کہیں کھو گیا ہوں...... میں...... ڈھونڈو۔ (ص 38 مجموعہ فاصلہ، ماہر منصور)

جنوب میں گلبرگہ اور حیدرآباد ایسے علاقے ہیں جہاں 1948 میں پولیس ایکشن نے بے انتہا تباہی و بربادی مچائی تھی۔ اس کے اثرات یہاں کے اکثر فکشن نگاروں کے ذہن پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ ان کی تخلیقات میں وقفہ بہ وقفہ ان اثرات کے سائے منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی مالی حالات کے بگاڑ کی صورت میں تو کبھی 'رسی جل گئی پر بل نہیں گیا' کے مصداق احساس برتری کی پیچیدہ بھول بھلیوں میں ان کا عکس ہمیں نظر آجاتا ہے۔ ڈاکٹر بیگ احساس کے افسانے 'نجات' اور 'کھائی' ان اثرات کی نمایاں مثالیں ہیں۔ جیلانی بانو کے افسانوں میں بھی ہمیں ان اثرات کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔ جیلانی بانو کے دور حاضر کے افسانے حیدرآباد کے جدید تر معاشرتی مسائل کا انتہائی فنکاری کے ساتھ احاطہ کرتے ہیں اور اس احاطے میں وہاں کے علاقائی اثرات کی دھوپ چھاؤں آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہے۔ ان کے ایک افسانے 'جنت کی تلاش' میں ایک ایسے مولوی صاحب کو پیش کیا گیا ہے جو سڑکوں پر بھیک مانگنے والے اور جھونپڑیوں میں رہنے والے بے سہارا بچوں کو مسجد کے آنگن میں بٹھا کر مذہبی تعلیم دیتے ہیں۔ ایک دن جب وہ ان بچوں کو دوزخ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ دوزخ آسمان پر ہے، وہاں اندھیرا ہوگا، بھوک لگے گی مگر کھانا نہیں ملے گا، پینے کو پانی نہیں ہوگا، سانپ اور بچھو کاٹنے کو آئیں گے، بچھانے کو بستر ملے گا نہ اوڑھنے کو چادر ملے گی تو ایک بچی اپنی ساتھی رضیہ سے کہتی ہے کہ مولوی صاحب کو معلوم نہیں ہے کہ دوزخ آسمان پر نہیں ہے۔ اس بات پر مولوی صاحب کی ڈانٹ پھٹکار کے بعد مولوی صاحب کی ناراضگی سے ڈر کر وہ بچی روتے ہوئے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے ''میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں مولوی صاحب، جنگم بستی میں ہماری جھونپڑی دوزخ میں ہے۔ رات کو جب ہمارا باوا سیندھی پی کر آتا ہے، اماں کو مارتا ہے تو اماں روتے روتے بولتی ہے 'یہ گھر تو دوزخ میں ہے'' اس کے بعد ایک دوسرا بچہ کہتا ہے '' ہو مولوی صاحب، ہمارا گھر بھی دوزخ میں ہے، آپ بولے نا دوزخ میں اندھیرا ہوگا، کھانا پانی نہیں ملے گا! ہمارے گھر میں لائٹ نہیں ہے۔ چراغ میں تیل نہیں ہوتا تو اندھیرا ہوجاتا ہے۔'' اسی طرح ایک اور بچہ کہتا ہے'' اور بارش ہوتی ہے تو ہماری جھونپڑی میں پانی آجاتا ہے، رات سانپ بھی نکلا تھا۔'' وغیرہ، وغیرہ۔ یہ سب سن کر مولوی صاحب کا سر جھک جاتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ اب کون سا عذاب ہے جس سے ان بچوں کو ڈراؤں۔ غرض کہ یہ افسانہ بڑی خوبی کے ساتھ، کئی علاقائی حقائق کے علاوہ نہ صرف حیدرآباد کی اس حقیقت کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ آج وہاں پر ایک طرف دولت کی ریل پیل نظر آتی ہے تو دوسری طرف ایسے مسلمان خاندان بھی بستے ہیں جن کی زندگی دوزخ کا نمونہ پیش کرتی ہے بلکہ پوری دنیا کے غریبوں کے رستے ہوئے زخموں کا جیتا جاگتا نقشہ پیش کر دیتا ہے۔ اسی طرح جیلانی بانو کی کئی تخلیقات ایسی ہیں جن میں آندھرا پردیش کی علاقائیت کو نہایت سلیقے کے ساتھ منعکس کیا گیا ہے۔ افسانہ بعنوان ''کل رات ہمارے گھر مرزا غالب اور عصمت چغتائی آئے تھے'' میں جیلانی بانو نے بڑے تیکھے انداز میں وہاں کے علاقائی پکوان ''کھٹی

دال اور چاول" کا مذاق اڑایا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا غالب عصمت چغتائی کو "عصمت بی بی!" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو خواتین کے لیے حیدرآباد اور گلبرگہ والوں کا روایتی طرز تخاطب سامنے آجاتا ہے۔

جنوبی ہند کے اردو ادب کو یہاں کے جغرافیائی حالات نے بھی علاقائیت کے اثرات کا ایک انمول نگار خانہ بنانے میں بڑی مدد کی ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کی افسانہ نگار رفیعہ منظور الامین اور تمل ناڈو کے علیم صبا نویدی ایسے فنکار ہیں جن کے افسانوں میں جغرافیائی حالات کے اثرات کے نادر نادر نمونے ملتے ہیں، نادر اس لیے کہ ان فنکاروں نے اپنے دیکھے بھالے مناظر کو اپنے تخیل کی مدد سے ایک نئی حسیت عطا کرکے زبان و بیان کو نیا رنگ و روپ عطا کیا ہے۔ اس کے علاوہ رفیعہ منظور الامین کے افسانوں میں تلنگانہ کے معاشرتی حالات کا احاطہ اس طرح کیا گیا ہے کہ وہاں کے مناظر، اُن کی خوبصورتی، زبان، عوام کے گذر معاش سب کی دلکش عکاسی ملتی ہے۔ مثلاً ایک اقتباس ہے: "اس چھوٹے سے گاؤں کے تقریباً سارے ہی باغیچے کندنا کے باپ بلپا کے تھے۔ پان کے باغیچے جہاں...... چھوٹے بڑے کلی دار پانوں کے پتے کسی بھارت ناٹیم رقاصہ کی خوبصورت ہتھیلیوں کی طرح ہلکی ہوا میں تھرکتے جاتے۔ جب کامگار اپنی انگلیوں میں لوہے کے تیز ناخن پہنے ان پانوں کو ڈنڈی سے کاٹ کر جمع کرتے تو ہمیشہ گیلی رہنے والی زمین میں اُن کے پیر دھنستے جاتے، باغیچے کے اندر گہرے زمردی سائے میں دوسرے ہر رنگ کا احساس مٹ جاتا......... پان کے ان باغیچوں کے کناروں پر سپاری کے ابھرے پتلے بانس نما پیڑ تھے جو ایک دوسرے سے کافی دور، شیوجی کے لمبے ترشول کی طرح ایستادہ اور سیدھے تھے۔ یہ پتلے بنسی نما لمبے لمبے پیڑ اپنے سروں پر سپاری کے ابھرے ٹوکرے اٹھائے کسے کسائے برسوں سے یوں ہی کھڑے تھے۔ ....."ملّی گے ہوگتی؟" (کہاں جا رہی ہو؟) کندنا نے مینڈھ پر کھڑے کھڑے پوچھا۔ وہ نوکری میں بڑے بڑے چیکو جمع کر رہی تھی...... وہ کرناٹک کی سانولی سحر تھی، جس میں کولار کے سونے کا رنگ گھلا تھا۔" (دستک سی در دل پر ص 78-79)۔

اسی طرح تامل ناڈو کے ادیب و شاعر علیم صبا نویدی کے افسانے بھی وہاں کے جغرافیائی اثرات کی ایک بہترین مثال ہیں۔ مدراس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ وہاں پر انگارے برساتی ہوئی تمازت آفتاب، لہریں مارتے ہوئے خوشنما سمندر اور سیاہ فام عوام سے

جنوبی ہند کے اردو ادب کو یہاں کے جغرافیائی حالات نے بھی علاقائیت کے اثرات کا ایک انمول نگار خانہ بنانے میں بڑی مدد کی ہے۔چنانچہ حیدر آباد کی افسانہ نگار فیعہ منظور الامین اور تمل ناڈو کے علیم صبا نویدی ایسے فنکار ہیں جن کے افسانوں میں‌جغرافیائی حالات کے اثرات کے نادر نادر نمو نے ملتے ہیں، نادر اس لیے کہ ان فنکاروں نے اپنے دیکھے بھالے مناظر کواپنے تخیل کی مدد سے ایک نئی حسیت عطا کر کے زبان و بیان کو نیا رنگ و روپ عطا کیا ہے۔اس کے علاوہ رفیعہ منظور الامین کے افسانوں میں تلنگانہ کے معاشرتی حالات کا احاطہ اس طرح کیا گیا ہے کہ وہاں کے مناظر،اُن کی خوبصورتی، زبان، عوام کے گذر معاش سب کی دلکش عکاسی ملتی ہے۔

ہمارا سامنا ہوتا ہے۔ اس علاقے کے پروردہ ادیب و شاعر علیم صبا نویدی کے شعور کو ان علاقائی خصوصیات نے اس طرح متاثر کیا ہے کہ انھوں نے ان سب کو انتہائی خوبی کے ساتھ بے شمار استعاروں اور تلازموں میں ڈھال دیا ہے۔ وہ آفتاب کی تمازت کو جذبات و احساس کی تمازت کا پیکر عطا کرتے ہیں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے وجود کا احساس ان کے شعور پر اس طرح طاری ہے کہ انھوں نے اس کے زیر اثر ریت کا سمندر، دھوپ کا کھولتا ہوا سمندر، چیخوں کا بے کراں سمندر، زندگی کا بے کراں سمندر، اجالوں کا اتھاہ سمندر، وجود کا سمندر اور آکاشی سمندر جیسے استعارے وجود میں لاکر نہ صرف دلچسپی اور جاذبیت کے پہلو پیدا کر دیے ہیں بلکہ سمندر کے تصور کو نئی جہتیں عطا کرکے نئی حسیت کو جنم دیا ہے، یہاں تک کہ وہ ریت کے سمندر کو گرم گرم سانسیں لیتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

ان کے افسانے 'جسموں کی دیوار' کا ایک اقتباس ہے " ہر طرف دھوپ ہی دھوپ تھی، تیز دھوپ، کڑکتی ہوئی دھوپ، دور دور تک دھوپ کا کھولتا ہوا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔" (ص 24، مجموعہ اجلی مسکراہٹ)

علیم صبا نویدی کے ایک اور افسانے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے" چاروں طرف پُونداملی (موگرے) کی خوشبو سے ساحل مدراس کی فضا معطر تھی...... ساحل سے دور، بہت دور افق کے کناروں پر بچھی ہوئی سرخ چادریں سورج کے قتل کی گواہی دے رہی تھیں......"

(افسانہ شناخت ص 60 مجموعہ ہذا)۔

جنوبی ہند کے ادب میں علاقائی اثرات کی جھلکیاں پیپل کے درخت سے وابستہ عقیدت، اس کی چھاؤں، اس کی چھاؤں میں لگائی ہوئی مورتیوں کی پوجا (اکثر فیاض قریشی کے افسانوں میں) وغیرہ کے ذکر میں بھی ملتی ہیں۔ کبھی کبھی تخلیق کار ایسی معلومات بھی فراہم کر دیتے ہیں جو قاری کی واقفیت کے خزانے میں اضافہ کرتی ہیں۔ رفیعہ منظور الامین کا افسانہ 'تنگامنی' (مشمولہ مجموعہ دستک سی در دل پر) اسی نوعیت کا افسانہ ہے۔ اس کے ذریعے کوچین کے ساحل پر بسنے والے مچھیروں کے نشیب و فراز سامنے آتے ہیں تو اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کوچین کے چھ سو سال پرانے کلیسا میں پُرتگیزی سیاح اور جہاز راں واسکوڈی گاما کو دفن کیا گیا تھا اور دفنانے کے صدیوں بعد اس کے تابوت کو قبر سے نکال کر پرتگال پہنچا دیا گیا تھا (ص 15 مجموعہ ہذا)۔ انھوں نے بھی علاقائی مناظر کے زیر اثر بعض نادر تشبیہیں اور سحر انگیز زبان استعمال کی ہے جیسے کہ" طوفانی سمندر اژدھے کی طرح پھنکار رہا تھا" یا یہ کہ" ......اس کی سسکیوں کی آواز جھونپڑے کے باہر تہس نہس کرتی ہوا کے تانڈو رقص میں گم ہوکر رہ گئی" یا پھر" ننّی چُنّی مچھلیاں اس کے جال میں دیدے چمکا رہی ہوتیں" وغیرہ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علاقائی رسوم و رواج اور عقائد کے پردے ہٹائے جاتے ہیں تو علاقائیت کو جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ساتھ جوڑ کر تخلیق کی قدر و قیمت بڑھانے کی کوشش نمایاں نظر آتی ہے (مثلاً آبگینہ، ادھورا پہیہ۔ اکرام باگ)۔ محمد مظہر الزماں خاں اور مجتبیٰ حسین جیسے عالمی شہرت یافتہ فنکاروں نے علاقائیت سے کام لے کر زندگی کے تلخ حقائق کو بہت ہی پیارے اور شگفتہ سے اسلوب میں اس طرح سجا دیا ہے جیسے کہ کونین کی کڑوی گولیوں کو شکر کی چاشنی میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ ادب اور علاقائیت میں ایک اٹوٹ سا رشتہ پایا جاتا ہے اور تنقید کی ریڈیائی لہریں جب ادب پاروں کے باطن کو تلاش کرتی ہیں تو ایک ایسا لمحہ فکریہ بھی جنم لیتا ہے جسے جدید اور آفاقی تخلیقات کے اندر بھی کہیں نہ کہیں علاقائیت کے سوتے ابلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

■

Dr.Mahnoor zamani Begum
No.15, Golden Castle Appt.
Flat No.206, Ganesha Block
Sultanpalya Main Road,3rd Main
Sultanpalya, Bangalore-560032 (Karnataka)

ایم نسیم اعظمی

احمد یوسف اپنے افسانوں کے آئینہ میں

احمد یوسف کا شمار ریاست بہار کے اہم ترین جدید افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ وہ ایک قابل ذکر افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ہی ایک بہترین رپورتاژ نویس اور خاکہ نگار بھی تھے اور اچھے مترجم بھی۔ اس کے علاوہ تنقید، لسانیات اور بہار اردو لغت کی ترتیب و تدوین اور عظیم آباد (پٹنہ) کی قدیم و جدید صحافت پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ وہ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے، راقم کی بھی ان سے دو بار ملاقات رہی ہے، ایک بار گیا میں اور دوسری بار پٹنہ میں۔ ان کے کئی ایک افسانے ماہنامہ 'ادب نکھار' مئو ناتھ بھنجن میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کئی رنگ، اسلوب و انداز اور اظہار بیان سے کام لیا ہے۔ داستانی اسلوب و تمثیل سے بھی کام لیا ہے اور ترقی پسندانہ طریقۂ کار سے بھی استفادہ کیا ہے اور جدیدیت کے رنگ و آہنگ بھی اختیار کیے ہیں اور ان سب کے مجموعی اثرات قبول کرتے ہوئے اپنا مخصوص اسلوب و انداز پیدا کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

احمد یوسف 1930 میں پٹنہ سٹی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام تو سید محمد عثمان احمد یوسف تھا، اور ان کے والد کا نام سید محمد یوسف تھا۔ انھوں نے پہلے پہل اپنا قلمی نام عثمان یوسف اختیار کیا پھر بعد میں صرف احمد یوسف کر لیا اور اسی نام سے مشہور بھی ہوئے۔ انھوں نے 1935 میں کلکتہ مدرسہ میں داخلہ لیا جہاں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1944 میں محمڈن اینگلو عربک اسکول سے میٹرک (دسویں) کا امتحان پاس کرنے کے بعد علی گڑھ چلے گئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1946 میں آئی ایس سی کا امتحان پاس کیا اور وہیں سے بی ایس سی کرنے کے بعد 1949 میں پٹنہ واپس آگئے۔ 1981 میں جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کا امتحان پاس کیا۔ 1986 میں مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے ایم اے اردو کیا اور 1996 میں ڈاکٹر ممتاز احمد کی نگرانی میں 'اردو ناولوں کے کرداروں کا سماجی پس منظر' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کر کے پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی (Ph.D) کی ڈگری حاصل کی۔

احمد یوسف نے زمانۂ طالب علمی میں ہی افسانہ نگاری شروع کر دی تھی ان کا پہلا افسانہ 'پکا ارادہ' کے عنوان سے 1948 میں 'نئی راہ' گیا میں شائع ہوا تھا۔ 'نئی راہ' کا دوسرا شمارہ 1949 پٹنہ سے شائع ہوا تو اس کے دوسرے شمارے میں 'پکا ارادہ' شامل تھا۔ 'وہ ہیں کاریگر' کے عنوان سے ان کا دوسرا افسانہ ہفتہ وار اخبار 'انسانی آواز' پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ 1951 میں کراچی (پاکستان) کے معروف رسالہ 'افکار' میں ان کا تیسرا افسانہ 'مسافر' شائع ہوا، اس طرح ان کی باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں وہ بھی روایتی اور رومانی انداز کے افسانے لکھتے تھے انھوں نے اپنی روایتی بیانیہ تکنک و اسلوب میں اپنا مشہور زمانہ افسانہ 'عبد الرحیم ٹی اسٹال' جیسا شاہکار افسانہ لکھا جو اپنے دور میں کافی مشہور و مقبول ہوا اور آج بھی احمد یوسف کے نمائندہ افسانوں میں سرفہرست تصور کیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ ان کے اس دور کا اہم ترین اور یادگار افسانہ تصور کیا جاتا ہے جب احمد یوسف ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اس کے بعد انھوں نے تقریباً دس سالوں تک بالکل خاموشی اختیار کر لی اور پھر جب دوبارہ افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کے فکر و خیال کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ان کے سر پر بھی جدیدیت، علامت اور تجریدیت کا جادو چڑھ چکا تھا اور جدید انداز کے اچھے اور قابل توجہ افسانے لکھنے میں پھر مصروف ہو گئے تھے۔ اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں وہ خود بھی رقم طراز ہیں۔

''میں نے 1948 میں لکھنا شروع کیا۔ 'پکا ارادہ' میرا پہلا افسانہ تھا جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے آرگن 'نئی راہ' میں شائع ہوا تھا۔ اس پرچہ کا پہلا شمارہ گیا سے شائع ہوا تھا اور دوسرا پٹنہ سے۔ اس زمانے میں میرے علاوہ جناب حسن نعیم، نادم بلخی، خواجہ بدیع الزماں، کلام حیدری، پرویز شاہدی، انیس امام، شکیل الرحمن اور انور عظیم وغیرہ شائع ہو رہے تھے۔''

'پکا ارادہ' مطبوعہ 'نئی راہ' (گیا، پٹنہ) 'کفن' (تہذیب، پٹنہ) 'سرخ پان' اور 'مسافر' (افکار، کراچی)، 'بس یہی کچھ لوگ' (تلاش، دہلی) وغیرہ احمد یوسف کے اہم ترین ابتدائی دور کے افسانے ہیں جو اپنے زمانے میں مشہور و مقبول بھی رہے تھے مگر یہ ابتدائی افسانے جو ان کے کسی بھی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں کیونکہ وہ اس زمانے کے افسانے ہیں جب احمد یوسف انجمن ترقی پسند

مصنفین سے وابستہ تھے اور روایتی اور ترقی پسندانہ قسم کے افسانے لکھا کرتے تھے۔ بعد میں وہ اس سے الگ ہو گئے اور اس دور کے بیشتر افسانوں کو اپنے تخلیق کردہ افسانوں کی فہرست سے بھی خارج کر دیا۔ اور ان کے اپنے ابتدائی افسانہ ہونے سے انحراف کرتے ہوئے اپنے ایک انٹرویو مطبوعہ 'اردو دنیا' نئی دہلی دسمبر 2008 میں یہ کہہ کر لوگوں کو تعجب میں ڈال دیا کہ ان کا پہلا افسانہ 'عبدالرحیم ٹی اسٹال' ہے جو کلام حیدری کے رسالہ 'آہنگ' گیا میں شائع ہوا تھا۔ انٹرویو کے جواب کا اقتباس بھی ملاحظہ ہو۔

''میری پہلی کہانی کلام حیدری کے ماہانہ رسالے آہنگ (گیا) میں 'عبدالرحیم ٹی اسٹال' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ کہانی کا بہت چرچا ہوا۔ افسانہ نگاروں اور نقادوں کی توجہ میری طرف ہوئی، تب سے لے کر آج تک میں برابر افسانے لکھ رہا ہوں۔''

احمد یوسف کے افسانوں کے کل چار مجموعے شائع ہوئے ہیں اور ہر افسانوی مجموعہ بیں افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'روشنائی کی کشتیاں' (1976) دوسرا 'آگ کے ہم سائے' (1980) تیسرا '23 گھنٹے کا شہر' (1984) اور چوتھا و آخری مجموعہ 'رزم ہو یا بزم' (2004) ہے۔ دوسرے افسانوی مجموعہ 'آگ کے ہم سائے' پر اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنؤ) اور تیسرے افسانوی مجموعہ '23 گھنٹے کا شہر' پر بہار اردو اکادمی (پٹنہ) کے انعامات بھی ملے تھے۔ 1995 سے 1998 تک وہ بہار اردو اکادمی (پٹنہ) کے وائس چیئرمین بھی رہے۔ احمد یوسف نے اگرچہ آزادی کے بعد افسانہ لکھنا شروع کیا تھا لیکن انھوں نے بھی اردو کے بہت سارے ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کی طرح ملک کی آزادی، تقسیم، فسادات اور ہجرت کے جانگداز واقعات و حالات کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا جس سے ان کے ذہن و دل پر جو اثرات مرتب ہوئے تھے وہ ان کے افسانوں کے بین السطور میں زیریں لہروں کی طرح محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے بیانیہ افسانے بھی لکھے ہیں اور جدید انداز کے علامتی اور تجریدی افسانے بھی تخلیق کیے ہیں۔ ان کے بہت سارے افسانوں میں تقسیم ملک، ہجرت اور انسانیت سوز فرقہ وارانہ فسادات کی اذیتوں کی جھلکیاں صاف طور سے نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہ سکی ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان کے آس پاس کے حالات، معاشرت اور لوگوں کی زندگیوں کے مختلف پہلو بھی بڑے اچھے اور فن کارانہ انداز میں کہانی کی خوبصورت شکل اختیار کر گئے ہیں جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ترقی پسندی سے متاثر ہو کر افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا اور بعد میں وہ جدیدیت کی طرف مائل ہو گئے تھے لیکن ان کی افسانہ نگاری کے آغاز و ارتقاء میں بنیادی طور پر جو عوامل کارفرما تھے وہ ان کی افسانہ نگاری کو چمکانے اور نکھارنے میں بڑے معاون بن گئے تھے جس سے احمد یوسف کی افسانہ نگاری اور ان کے افسانوں میں بتدریج پیدا ہونے والی وسعت و بالیدگی اور ذہنی و فکری اور فنی پختگی میں بھی ان کے اثرات کی کارفرمائی سے یکسر انکار بہر حال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر وہاب اشرفی بھی رقم طراز ہیں۔

''ابتدائی افسانوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ ترقی پسندی کی ابتدا اور عروج کے زمانے میں احمد یوسف نہ صرف اس تحریک سے وابستہ رہے بلکہ ان کے افسانوں کے خد و خال بھی ترقی پسند عناصر سے بیش از بیش مملو رہے..... احمد یوسف کے بیشتر افسانے کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کی چیرہ دستیوں اور سماج کے استحصالی تیور کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں یہ عنصر خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ وہ موڑ ہے کہ بہار سے سہیل عظیم آبادی پریم چند کی راہوں سے ہوتے ہوئے مارکسی نقطۂ نظر سے سماج کی اقتصادی ناہمواریوں اور بدحالیوں کے افسانے لکھ کر اردو افسانے کی تاریخ میں ایک مستند مقام بنا چکے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے کچھ عرصے بعد احمد یوسف ان کے ہم سفر ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔''

احمد یوسف نے اپنے ابتدائی افسانوں میں نہ صرف ترقی پسند افسانوی ادب سے استفادہ کیا ہے بلکہ ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی باقاعدہ وابستہ رہے ہیں اور ان کے ابتدائی افسانوں میں اس کے گہرے اثرات بھی نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ترقی پسندی سے انحراف اور جدیدیت کی طرف رجحان ہو جانے کے باوجود بھی بہت سے بنیادی اثرات بالکل زائل نہیں ہو سکے اور ان کے بعد کے افسانوں میں بھی ان کی عکاسی باقی رہی۔ عبدالرحیم ٹی اسٹال، 23 گھنٹے کا شہر، وہ ایک شخص، تلوار کا موسم، حسن پور سے، عینک ساز کلارینٹ ماسٹر، چھوٹے گپتا بڑے گپتا، خواب گر خواب شکن، وقت رخصت، تین گھروں کی آبادی، خط منحنی، پرندہ ایک نگار خانے کا، بیں کاریگر، روشنائی کی کشتیاں، سایہ رم آہو، ڈوبتی ابھرتی شام، لالٹین کی روشنی میں، دبے پاؤں، غم زدوں کی بارات، پتھر کی زبان، ہم تھے اور شیر تھا، اس کے بعد، ظلمت کدے میں، قیامت کا دن، ایک منظر سامنے کا، روشنی، مطلع، ایک سے آگے، سنگین کے دو کنارے، نقش ناتمام، چراغ کشتہ، قصہ حجام کے ساتویں بھائی کا، کاغذ آتش زدہ، ایک لٹکتے دن کا آخری جام، شہر میں کوئی نہیں، تجدید جنوں، کاروبار، آنے والا، بلب ایک گزرگاہ کا، گردن ناپنے والے لوگ، قتل گاہ، ملاقاتیں، بجھی ہوئی روشنی، دکھ ہما شما کے، کچھ اس کی زبانی، ایک دن کا حساب، گھر جلانے والے، کچھ عجیب سے روز و شب، ہوا یہ کہ ایک دن، موت، عروجی لمحے، بازار، خاموشی کے حصار میں، بستی ایک نئی ہے، شادکامی کا دوسرا لمحہ، میرا لہو اور ''رزم ہو یا بزم'' وغیرہ ان کے اہم، قابل ذکر اور یادگار افسانے ہیں۔ جن میں کچھ بیانیہ اور کچھ تجریدی اور علامتی قسم کے بھی ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں میں ایسے حالات و ماحول اور فضا ملتی ہے جو آزادی سے قبل کے ہندوستان کی معلوم ہوتی ہے اور جس کے گم ہو جانے کا کرب و افسوس کا بھی احساس ہوتا ہے۔ سماجی، اقتصادی اور تہذیبی استحصال وغیرہ ان کے جن افسانوں کا کلیدی موضوع ہوتا ہے ان میں عموماً سماجی قدروں کی بحالی کے خواہاں نظر آتے ہیں اور غربت و پس ماندگی اور استحصال و جبر کے خلاف احتجاج کناں بھی محسوس کیے جاتے ہیں۔

'عبدالرحیم ٹی اسٹال' احمد یوسف کا انتہائی کامیاب اور مشہور و مقبول افسانہ ہے اور ان کے پہلے افسانوی مجموعہ 'روشنائی کی کشتیاں' میں بھی شامل ہے۔ اس افسانہ میں ایک محدود عہد کے خاتمہ اور اس کی گم ہوتی معاشرتی، اخلاقی اور تہذیبی قدروں اور ایک اہم ترین داستان کھو جانے کے المیے کو بڑے اچھے انداز اور افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں غریب طبقے کے دکھ درد، مجبوریوں، تمناؤں اور حسرتوں کو جس طور سے نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے غریب اور مفلوک حال لوگ کس طرح اپنی محدود سوچ اور دائرے میں رہنے اور زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کی یہ محدود سوچ صرف ان پست تمناؤں کا ہی نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ اس نظام حکومت کے طریقہ کار کی بھی دین ہوتی ہے جو غریبوں کو نسل در نسل غریب بنائے رکھنے کی استحصالی پالیسی پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ افسانہ ہر لحاظ سے اہمیت کا حامل افسانہ ہے اور قاری کو متاثر بھی کرنے والا ہے اس کا ایک مختصر سا اقتباس پیش ہے:

''عبدالرحیم مالک 'عبدالرحیم ٹی اسٹال' آج مر گیا، ہم اسے منوں مٹی کے نیچے دبا کر قبرستان کی تنہائیوں میں چھوڑ کر چلے جائیں گے، گویا ایک داستان ختم ہوئی، ایک

تاریخ کھوگئی، لیکن ہمارے اور اس کے درمیان جو ایک رشتہ تھا، جو محبت تھی، اس کی بھی تو ایک داستان ہے، اس کی بھی تو ایک تاریخ ہے اور وہ بھی تو کہیں دل کی تنہائیوں میں دبی پڑی ہے''۔

'بیں کاریگر' بھی احمد یوسف کا ایک اہم ترین افسانہ ہے۔ اس افسانے میں بیڑی بنانے والے کاریگروں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جو بات بات پر ہنستے اور قہقہے لگاتے ہیں لیکن ان کی ہنسی اور قہقہوں کے درپردہ ان کی لاچاریوں، مجبوریوں اور محرومیوں کا جو درد و کرب ہے اس افسانہ نگار نے جس تہہ داری اور فن کاری سے اس افسانہ میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس سے افسانے کی اہمیت میں اضافہ بھی ہوگیا ہے اور اسے قاری بھی محسوس کرلیتا ہے اور اس سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

''بیں کاریگر جن میں امجد خاں جیسا ساٹھ سالہ بوڑھا بھی تھا اور شریف جیسا بارہ سال کی عمر کا لڑکا بھی۔ جسے فخر سے شیر کہا کرتے تھے اور جس کے بارے میں امجد خاں نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ ماں کے پیٹ سے نکل کر سیدھے بیڑی کے کارخانے میں داخل ہوگیا تھا۔''

یہ افسانہ ہندوستان کے غریب، مزدور اور محنت کش طبقے کی حالت زار اور بچہ مزدوری کی صورت حال کو جس انداز سے اجاگر کرتا ہے اور اپنے موضوع، ماحول، پس منظر سے جو موثر فضا سازی کرتا ہے وہ قابل داد و تحسین ہے۔ ان کا ایک افسانہ 'تلوار کا موسم' بھی ہے۔ یہ افسانہ بھی اپنے موضوع، انداز فکر، تکنک اور اسلوب ہر لحاظ سے ایک اہم اور کامیاب افسانہ بن گیا ہے۔ ذرا درج ذیل اقتباس دیکھیں۔

''آج پھر تلوار خون میں لت پت دکھائی دے رہی ہے۔ اس کی سرد طبعی، اس کی خون آشامی، وقت اور تلوار کے مزاج میں کتنی یکسانیت ہے۔ یہ شہنائیاں، یہ شور، یہ اوپر تلے بچے...... یہ اجاڑ پن، یہ ویرانی، یہ دل کی بربادی، دبے پاؤں کسی نے وقت کی تباہی بدل دی۔ اور یہ جو قبا ہے بے حد تنگ، جگہ جگہ سے مسکی ہوئی۔''

احمد یوسف کے افسانوں میں زندگی کی سچائیاں اور ان سچائیوں میں جو مختلف رنگ ہوتا ہے اور اس رنگ میں جو حقیقت پسندانہ سفاک بے باکی پنہاں ہوتی ہے وہ افسانے کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کو نمایاں کرکے اس کی ادبی اور فنی اہمیت وافادیت میں بھی اضافہ کردیتی ہے۔ 'قتل گاہ' احمد یوسف کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ماضی کی کہانی کو حال میں پیش کرنے کا ایک خوبصورت اور فنی طریقہ کار اپنایا گیا ہے جس سے یہ افسانہ 'قتل گاہ' ماضی کا ایک ایسا منظرنامہ بن گیا ہے جسے حال میں دکھایا گیا ہے اور یہ تاثر دینے کی فن کارانہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ ماضی کی قتل گاہ آج بھی اپنی شکل بدل کر ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ اس افسانہ میں بکائن کا جو پیڑ دکھایا گیا ہے وہ افسانے میں ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے اور افسانے کی بنت میں اس کی مخصوص معنویت سے افسانہ منفرد و ممتاز بھی بن گیا ہے۔

احمد یوسف کے افسانوں اور ان کے افسانوی مجموعوں کے بالترتیب مطالعے سے ان کی فکری فنی اور اسلوبیاتی ارتقا اور ان کے اندر بتدریج پیدا ہوتی پختگی اور بالیدگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کے اولین افسانوی مجموعہ 'روشنائی کی کشتیاں' (1976) میں جو افسانے ہیں ان میں ملک کی آزادی سے قبل اور فوراً بعد کے حالات، تجربات اور مشاہدات کے گہرے نقوش کے ساتھ تقسیم ملک اور تبدیلی آبادی و ہجرت کی کربناکی کے احساسات پائے جاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر یا اس کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں میں سیاسی فریب کاریوں کو بے نقاب کرنے کی فن کارانہ کاوش کا احساس ہوتا ہے نیز تاریخ کی صداقتوں کو افسانوی رنگ دینے کا ہنر پایا جاتا ہے۔ دوسرے افسانوی مجموعہ 'آگ کے ہم سائے' (1980) میں شامل افسانوں میں تقریباً اسی قسم کی صورت حال کے ساتھ بدلتے حالات، سیاسی، سماجی شعور، عصری حسیت اور تاریخی بصیرت کے ساتھ ایک نئے تشکیل ہونے والے سماج اور اس کے معاملات و تقاضے، سماج دشمن عناصر کی بڑھتی ریشہ دوانیوں وغیرہ کے خلاف ایک قسم کی ادبی اور فنی احتجاجی لے ان کے افسانوں میں شامل ہوتی محسوس ہوتی ہے جس سے ان کے افسانوں کی ادبی اور فنی اہمیت مزید نکھرتی اور سنورتی معلوم ہوتی ہے۔ تیسرے مجموعہ '23 گھنٹے کا شہر' (1984) کے بیشتر افسانوں میں اخلاقی پستی، خود غرضی، ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کے المیے، قدروں کی پامالی، ظلم و جبر کے بڑھتے رجحانات اور مشینی زندگی کی کربناکی کا موثر اظہار ہونے کے ساتھ ہی قدیم و جدید کی انوکھی کشمکش اور تصادم اور عصری زندگی کی نت نئی صداقتوں کی نئے انداز میں پیش کش سے ان کے زیادہ تر افسانے جگمگانے لگے ہیں۔ چوتھے افسانوی مجموعے 'رزم ہو یا بزم' (2004) میں شامل افسانوں کا انداز سابقہ تینوں مجموعوں کے افسانوں سے نسبتاً مختلف ہوگیا ہے۔ اس مجموعہ کے افسانوں میں عصری حسیت، سائنس وٹکنالوجی کے فروغ وتوسیع سے معاشرے میں ہونے والی ذہنی وفکری تبدیلیوں۔ ان کے منفی و مثبت اثرات، زندگی کی سرگرمیوں کی تیزی، صارفی کلچر کے بڑھتے اثرات، لوگوں کے اندر بڑھتی جائز و ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرلینے کی ہوس، روحانی، مذہبی اور اخلاقی پستیوں کی بہتات اور ان سب سے پیدا ہونے والی انفرادی اور معاشرتی کمزوریوں کو کہانی کے رنگ وروغن اور زبان و بیان اور اسلوب انداز کے حسن نے بھی ان کے افسانوں کو مزید موثر اور کارآمد بنادیا ہے اور ان کی افسانہ نگاری کا فن اپنے عروج کی منزل پر پہنچتا محسوس ہوتا ہے۔

'32 گھنٹے کا شہر' میں عہد حاضر کی شہری زندگی کی مصروفیت کو افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے اور شہر کی مصروف ترین زندگی کو بڑے معنی خیز انداز میں افسانے کے پیکر میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ اپنے انداز کا ایک عمدہ اور انوکھا افسانہ ہے۔ ''وقت رخصت'' میں دو بھائیوں کی ملاقات کو افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں ایک کا تعلق گاؤں سے ہے اور دوسرے کا تعلق شہر سے ہے۔ اس میں دیہی اور شہری زندگی کے تضادات کو بڑے خوبصورت اور موثر انداز میں ابھارا گیا ہے۔ شہری زندگی کی شدید مصروفیت، عدیم الفرصتی اور دیہی زندگی کی وقت گزاری اور آرام طلبی کی مرقع کشی سے یہ پورا افسانہ شہری اور دیہی زندگی کا ایسا موازنہ بن گیا ہے جس میں دیہات وشہر کی تصویر کشی نے افسانے کو بھی حیرت انگیز بنادیا ہے۔

احمد یوسف نے بیانیہ، علامتی اور تجریدی انداز میں افسانے تخلیق کرکے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ ان کی کامیاب افسانہ نگاری کا ثبوت بن گئے ہیں۔ ان کے بہت سے افسانوں میں ایسے حالات و ماحول اور منظر و فضا کی بھی عکاسی ملتی ہے جو ملک کی آزادی سے قبل کے ہیں۔ جو اس بات کا بھی اشارہ ہیں کہ آزادی سے قبل کے مشترکہ ہندوستان سے انھیں والہانہ محبت تھی اور جس کے ٹوٹنے، بکھرنے اور تقسیم ہوجانے کے المیے سے وہ آج بھی دکھی ہیں اور افسوس کناں بھی ہیں۔ وہ ماضی کی قدروں کے علمبردار بھی ہیں اور اس کی بحالی کے آرزومند بھی ہیں۔ ان کے بعض افسانوں کا بنیادی موضوع معاشرتی ناہمواری اور عدم مساوات، سماجی و معاشی نابرابری اور استحصال بھی ہے۔ 'تین گھروں کی آبادی'، 'تلوار کا موسم'، 'پرندہ ایک نگار خانے کا'، 'خط منحنی' اور 'ورثان' کے ایسے ہی افسانے ہیں جنھیں بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

'روشنائی کی کشتیاں'، 'سایۂ رم آہو'، 'غم زدوں کی

بارات'، 'دبے پاؤں'، 'لالٹین کی روشنی'، 'ہم تھے اور شیر تھا'، 'خاموشی کے حصار میں'، 'پتھر کی زبان'، 'رزم ہو یا بزم ہو' اور اس کے بعد ایسے افسانے ہیں جن میں زندگی کے اہم حقائق کو بڑی باریک بینی اور فنی چابکدستی سے کہانی کا روپ دیا گیا ہے۔ 'سنگین کے دو کنارے'، 'تلوار کا موسم' اور 'تین گھروں کی آبادی' وغیرہ افسانوں میں جنگ و جدال کے پرتشدد ماحول سے انسانی معاشرے پر پڑنے والے منفی اثرات کی موثر انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ 'شادکامی کا دوسرا لمحہ'، '23 گھنٹے کا شہر'، 'میرا لہو' اور 'فرد' وغیرہ ان کے بالکل جدید انداز کے افسانے ہیں جن میں علامتی اسلوب سے کام لیا گیا ہے۔

علامتی افسانوں میں جدیدیت اور تجریدیت کے اثرات کے ساتھ جو جہان معانی پنہاں ہیں اور علامتوں کے انتخاب اور معنی خیز استعاروں کے فنی استعمال میں احمد یوسف نے جس فنی مہارت کے ساتھ بلیغ تلازموں اور نئی امیجری سے کام لیا ہے اس سے ان کے افسانوں کا حسن اور معیار دونوں بڑھ گیا ہے اور ان کے افسانوں میں نئی جان پیدا ہوگئی ہے۔ اگرچہ ان کا بنیادی اسلوب بیانیہ ہے جس میں کبھی کبھی داستانی رنگ، تمثیلی انداز اور علامتی طرز اظہار غالب ہوجاتا ہے مگر ان کا یہ علامتی طرز اظہار بھی بیانیہ سے بالکل الگ نہیں ہو پاتا ہے۔ اور اسی بیانیہ اور علامتی طرز اظہار کی آمیزش سے ان کی افسانہ نگاری میں امتیازی وصف بھی پیدا ہوتا ہے۔ احمد یوسف کے بیانیہ اور علامتی طرز اظہار کی آمیزش کے بارے میں ڈاکٹر وحید اختر بھی رقم طراز ہیں:

''احمد یوسف نے علامتی اظہار کو بیانیہ سے الگ نہیں کیا، اس لیے ان کے یہاں کہانی پن ہے اور چونکہ کہانی پن ہے اس لیے دلچسپی ہے۔ غزل کے شعر کی طرح تو نہیں، لیکن مختصر نظم کی طرح ان کے یہاں ایجاز و رمزیت ہے اور اس لحاظ سے میں ان کے اس مجموعہ 'آگ کے ہم سائے' کو جدید طرز کی کہانیوں کی کامیاب مثالوں میں شمار کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر وحید اختر کی مذکورہ بالا رائے اگرچہ احمد یوسف کے دوسرے افسانوی مجموعہ 'آگ کے ہم سائے' مطبوعہ 1980 کے پیش نظر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی افسانہ نگاری کا اصل اسلوب بھی یہی ہے جو بیانیہ اور علامتی اظہار کی آمیزش سے تشکیل ہوا ہے اور بعد کے افسانوں میں اس میں مزید نکھار پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوع و مواد بھی ان کے ارد گرد کے حالات، واقعات، حادثات، معاملات، مشاہدات یا

احمد یوسف بیسویں صدی کے نصف آخر کے اہم ترین افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان کا اپنا معاشرہ سانس لیتا ہے۔ وہ موجودہ عہد کے پریشان کن، پرپیچ اور ناقابل فہم ترقی یافتہ معاشرے میں روز بروز آتی اخلاقی اور معاشرتی و انسانی گراوٹ کے اظہار و اختلاف سے ایک اچھے اور معیاری و حقیقی انسانی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار بھی کرتے ہیں اور یہی ان کے افسانوں کی فطری تھیم بھی ہے اور فنی حسن بھی۔

تجربات پر ہی منحصر ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زندگی کی سفاک صداقتوں کے اظہار اور معاشرتی و اقتصادی استحصال کے رویوں میں شدت ہوتی ہے۔ جہاں جہاں اور جن جن افسانوں میں خالص بیانیہ اظہار سے کام لیا ہے ان کہانیوں میں داستانی جھلک پائی جاتی ہے لیکن خالص رمزیہ انداز کی کہانیوں میں علامتی سروکار نمایاں ہوتا ہے لیکن ان دونوں کے اشتراک سے ان کے افسانوں کا امتیازی اسلوب تشکیل پاتا ہے اور جن افسانوں میں ان کے امتیازی اسلوب کی کارفرمائی ہوتی ہے ان کی کہانیوں میں تاثیر اور کشش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ ممتاز و منفرد ہوجاتی ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر اظہر پرویز۔

''احمد یوسف کی کہانیاں اپنے انداز سے متاثر کرتی ہیں۔ احمد یوسف کے کردار عام انسانی کردار ہیں، لیکن ان کے یہاں یہ کردار کوئی جامہ پہن لیں وہ اپنے انداز قد سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ احمد یوسف نے اردو افسانے کی روایت کو یقیناً آگے بڑھایا ہے۔ آج کے نئے افسانے کا مطالعہ ان کے افسانے کے بغیر نامکمل ہے۔ احمد یوسف کے فن میں رچاؤ ہے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے...... ان کے یہاں علامتوں کا استعمال معنی خیز ہی نہیں بلکہ خیال انگیز ہے۔''

اردو کی ادبی تحریکوں میں ترقی پسند تحریک سب سے زیادہ بااثر رہی ہے اور دیرپا بھی۔ احمد یوسف نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں اپنی افسانہ نگاری کا آغاز بھی کیا تھا اور ایک عرصہ تک وابستہ بھی رہے پھر وہ جدیدیت کی طرف مائل ہوگئے اور دونوں کے اثرات بھی قبول کیے اور جیسے جیسے ان کی افسانہ نگاری آگے بڑھتی گئی ان دونوں کے اثرات کی آمیزش سے ان کی اسلوبیاتی

انفرادیت نمایاں ہوتی گئی۔ جہاں تک ان کے افسانوں میں کردار نگاری کی بات ہے وہ بھی کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جو کردار تخلیق کیے ہیں وہ افسانے کے موضوع و مواد، اسلوب و تکنک وغیرہ سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہیں۔ انھوں نے عموماً غریب اور عام قسم کے جیتے جاگتے اور متحرک کرداروں سے کام لیا ہے۔ ان کے بیشتر کردار دو وقت کی روٹی، دو گز زمین اور اس پر سر چھپانے کے لیے بے چین ہیں اور یہی عام ہندوستانیوں کی پہلی اور بنیادی ضرورت بھی ہے اور اسی کے لیے وہ سرگرم عمل اور ہراساں و پریشاں بھی رہتے ہیں۔ ان کے کرداروں کے ظاہر سے زیادہ باطن کی اہمیت ہوتی ہے اور اکثر وہ اپنی حرکات و سکنات، اخلاقی پستی و بلندی، رشتوں کی پامالی، قدروں کی شکست و ریخت، عدم انسانیت، مشینی زندگی کے کرب، روشنی و تاریکی، حق و باطل اور قدیم و جدید کی کشمکش و تصادم افسانوں میں بھی جان پیدا کردیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان بھی بڑی موزوں اور مناسب ہوتی ہے۔ اکثر بلیغ جملے، کھٹے میٹھے اور تلخ و شیریں جملوں، لطیف طنز و مزاح اور ان کے اندرون میں موجود زندگی، زندگی کی سچائیوں، معنوی تہہ داریوں اور کرداروں کی داخلی کیفیات ان کی تخلیقی افسانوی زبان، چھوٹے چھوٹے جملوں کے استعمال اور حسب ضرورت لطیفوں اور طنز کے تیر و نشتر اور افسانوں کی بنت وغیرہ نے مل کر ان کے افسانوں میں ایسے ایسے فکری و فنی اوصاف جمع کردیے ہیں کہ ان کے افسانے ان سے جگمگا گئے ہیں اور وہ بیسویں صدی کے اہم ترین اردو افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہوکر اردو کے افسانوی ادبی سرمائے میں اپنے افسانوں سے بہترین اضافے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

احمد یوسف بیسویں صدی کے نصف آخر کے اہم ترین افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان کا اپنا معاشرہ سانس لیتا ہے۔ وہ موجودہ عہد کے پریشان کن، پرپیچ اور ناقابل فہم ترقی یافتہ معاشرے میں روز بروز آتی اخلاقی اور معاشرتی و انسانی گراوٹ کے اظہار و اختلاف سے ایک اچھے اور معیاری و حقیقی انسانی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار بھی کرتے ہیں اور یہی ان کے افسانوں کی فطری تھیم بھی ہے اور فنی حسن بھی۔

■

Dr. M Naseem Azmi
Domanpura, Kasari
Maunath Bhanjan - 221705 (UP)
Mob.:09795384952
Email.: dazmi99@gmail.com

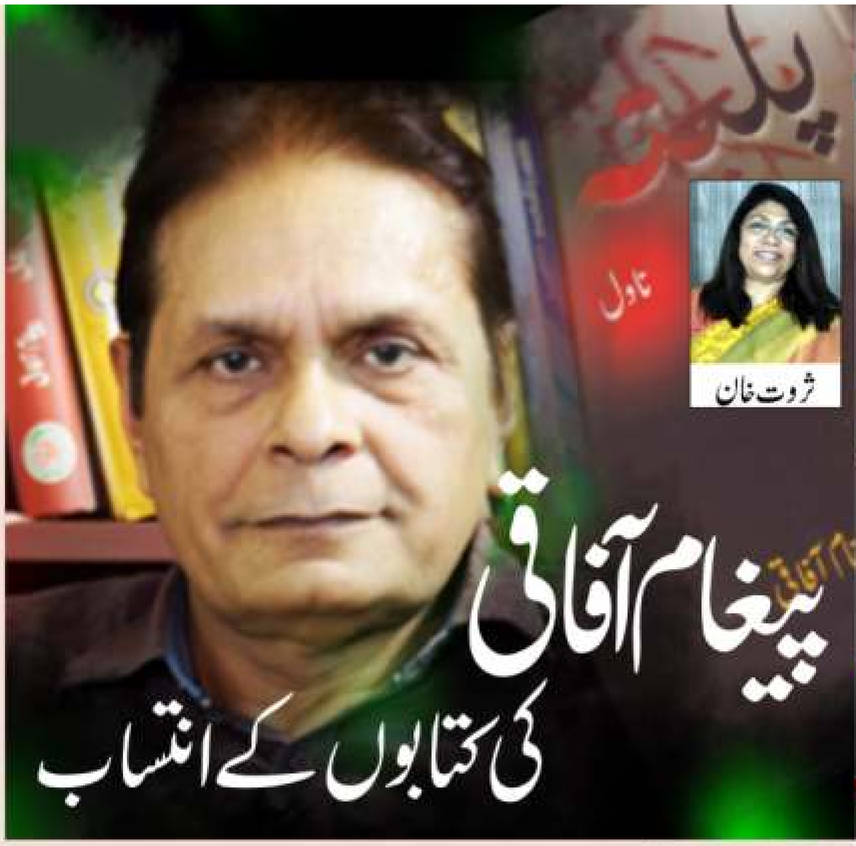

پیغام آفاقی کی کتابوں کے انتساب

ثروت خان

عام روایت ہے کہ تخلیق کار اپنی کتاب کا انتساب اپنے عزیزوں، دوستوں، معاصرین یا اپنے استادوں کی نذر کرتا ہے لیکن کچھ انتساب ایسے بھی ہوتے ہیں جو بڑے معنی خیز، جزوی اور انکشافات کا دریا ہوتے ہیں۔ فکر کا سراغ ہوتے ہیں، بیداری کا در وا کرنے کی کنجی ہوتے ہیں اور ان میں اس قدر معنی پوشیدہ ہوتے ہیں کہ کتاب کی خوبو کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پیغام آفاقی کا دوسرا ناول 'پلیتہ' کا انتساب بھی اسی قسم کا ہے۔ پڑھ کر دل ہل جاتا ہے اور بے ساختہ قلم چل پڑتا ہے تو رکنے کا نام نہیں لیتا۔ معنی در معنی، تہہ در تہہ۔ سارا منظرنامہ۔ سارا عالم، اس کا دھراحل۔ اور پھر ان سب کا حشر!! یہ انتساب ہے:

''بارودی سرنگوں کے نام''

یہ تین الفاظ ہم سے کیا کچھ کہہ رہے ہیں۔ یہ اشارہ ہیں، کنایہ ہیں، رمز ہیں کیا ہیں؟ پڑھتے ہی ذہن میں ایک خوف سا ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ گویا ہمارے اطراف و جوانب بارود کے دھماکوں کی بے ہنگم آوازیں ہیں۔ لوگوں کے جسموں کے چیتھڑے بکھرے پڑے ہیں۔ جلی جلی دھواں دھواں سی گوشت کی 'بو' نے حبس کا عالم پیدا کر دیا ہے۔ انسانیت خطرے میں ہے، حیوان بھی انگشت بدنداں ہو کر انسان کے کرتوتوں پر نفرت کی نظر ڈال کر دور سے سلام کرتے ہیں۔ انتشار و افراتفری کا عالم ہے۔ پولس، فوج، ہتھیار، سیاست، دہشت، شدت پسندی کے گرد عام آدمی، عورتیں، بچے، نوجوان، بوڑھے بوڑھیاں۔ کسی کو چین نہیں، کسی کو سکون نہیں۔ ہر جگہ بارودی سرنگوں کا جال۔ زمین کی تہوں سے لے کر آسمانوں کی وسعتوں تک، پہاڑوں کی بلندیوں سے لے کر سمندر کی گہرائیوں تک۔ ملک کے ملک اڑا دیے گئے۔ کہیں ساڑھے سات لاکھ لوگوں کی زندگیاں پل میں چھین لی گئیں۔ کہیں پورا کا پورا ملک تباہ کر دیا گیا اور کہیں تل تل کر مار ڈالنے کی سازشوں کی گرفت میں چھٹپٹاتے لوگ۔ یتیم بھوکے بچے۔ کسی کی ٹانگ غائب کسی کے ہاتھ۔ آدھا ادھورا ٹوٹا پھوٹا جسم لیے صرف سانسوں کے رحم و کرم پر زندگی کو ڈھوتے ہوئے۔ بہنیں جسم فروشی کو مجبور، مائیں سر پیٹتے ہوئے۔ نہ عدلیہ نہ مقننہ۔ اے خدا، پناہ ہے کہیں؟ پیغام آفاقی سوال کرتے کرتے ہمارے درمیان سے چلے گئے، اپنا 'پلیتہ' چھوڑ کر، مافیا اور درندہ چھوڑ کر۔ ان سب کے انتساب، انسانیت کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ ان سب تخلیقات کو اگر ہاتھ بھی لگایا تو گویا دھماکے ہوں گے۔ ان کے انتساب ہی ہمیں بتا دیں گے دیکھیے۔ ''آپ اور آپ کی دنیا، آپ اور آپ کا وجود، آپ اور آپ کے کارنامے۔ آپ سب کو کس مقام پر لے آئے ہیں۔'' سوالات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ 'بارودی سرنگوں کے نام' گویا سمندر کے تلاطم میں قدم رکھنے کا سراغ۔ جہاں فراغت اور پناہ جیسے الفاظ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ انسان نے انسان کے لیے ہی تباہی کی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔ جرم، زیادتی، فوقیت، غرور، انا، سیاست اور اس کا مکر جال۔ سب بارودی سرنگیں ہی تو ہیں۔ یہ وہ راستے ہیں جہاں قدم قدم پر بارودی سرنگوں کا سامنا کرنا لازمی ہے جہاں تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اخلاق کی تباہی، عزت و شرافت کی تباہی، محبت و شفقت کی تباہی، اتفاق و اتحاد کی تباہی۔ گویا مثبت عمل پر منفی رویوں کی سیج بچھا دی گئی ہے۔ شعور و ادراک کی باتیں بے معنی، محبت اور عشق کی باتیں بے معنی، اخلاق اور خلوص کی باتیں بے معنی، مروت و اخوت کی باتیں بے معنی۔ تپتی دھرتی، تپتا آسماں، تپتے لوگ، تپتی کائنات جس کے لیے 'کن فیکون' فرمایا گیا تھا، اسی نے اپنی تباہی کا سامان جمع کر لیا۔

جس ڈال پر بسیر کیے ہوئے ہے، اُسی ڈال کو کاٹنے میں لگا ہے۔ جنگ و جدل، جبر و تشدد، خوف و دہشت، فوقیت اور طاقت کا غرور یہ سب آخر کس لیے؟ کس کے لیے؟ کہاں تک؟ کب تک؟ فنا سے قبل فنا کا سامان! خود پیغام آفاقی نے اس سے قبل اپنے افسانوی مجموعہ 'مافیا' میں افسانوں سے قبل چند جملے درج کیے ہیں۔ مثلاً 'تخلیقی جہازوں کے قزاق' کائنات کی اجنبی گلیاں' موسموں کی ناقابل برداشت شدت'، پراسرار کرداروں کا جنم اور پھر اپنے شعری مجموعہ 'درندہ' میں بھی ان کا یہی عمل رہا۔ وہاں بھی نظموں اور غزلوں سے قبل کچھ گہرے جملے لکھ دیے گئے ہیں، مثلاً ''ہزاروں اجنبی چہرے، ہزاروں اجنبی گلیاں، ہزاروں اجنبی راستے'' ان جملوں کے معنی مفہوم آخر ہیں کیا، پیغام آفاقی جیسا فلسفیانہ فکر و نظر رکھنے والا تخلیق کار آخر ان جملوں کی ضرورت کیوں محسوس کرتا ہے؟ اب یہ تخلیقی جہازوں کے 'قزاق' کون ہیں؟ اور تخلیقی جہاز کے بھی کیا معنی ہیں؟

ذرا غور کیجیے تو آج کا منظرنامہ ان الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ پیوست ہے۔ سب سے بڑا جہاز ہے ماں، پھر زمین، پھر فنکار، پھر سائنسٹ۔ اور قزاق ہیں استحصال، فرمان، جبر، ظلم، ماتحتی اور خوف پیدا کرنا۔ یہ سب قزاق ہیں جنھوں نے وہ ماں جسے خالق نے خود خالق بنایا ہے، کا برا حال کیا ہے۔ نہ عزت، نہ احترام، نہ ملکیت نہ وراثت۔ سب کچھ اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔ پھر آتی ہے زمین کی باری۔ اسے بھی تو کھوکھلا کیے دے رہے ہیں۔ مٹی زہریلی، پانی آلودہ، ہوا نقصاندہ۔ بس زندگی پر موت کے پہرے بٹھا دیے ہیں۔ گویا ماں کی کوکھ اور زمین کی گود دونوں کو اجاڑنے پر آمادہ ہیں۔

اب رہے فنکار اور تخلیق کار ان کی بھی سرے سے ناقدری۔ عالم یہ ہے کہ اس ناقدری سے نہ میر بچے نہ غالب بچ پائے۔ سب کے سب شکار۔ نہ عزت نہ احترام۔ اقبال نے گھبرا کر آخر شکایت کی: اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟ پیغام دینے والا، روشنی دکھانے والا، فکر کو مثبت وسعت دینے والے تخلیق کار کا روحانی، جذباتی استحصال اسے نہیں کہیں گے تو پھر کسے کہیں گے؟ پہلے یہ استحصال ذرا کم تھا، ڈھکا چھپا تھا۔ اب

برہنہ ہوکر سامنے آگیا ہے۔ ’قزاق‘ کے روپ میں، جو کھلے گھومتے ہیں، دندناتے ہوئے۔ مل بیٹھ کر ادبی اڈوں پر ناکارہ کو آسمان پر بٹھانے کے منصوبے بناتے ہیں۔ چلن ہے مافیا کی۔ جن میں ’ہم اور ہمارے دوست‘ ہی سب کچھ ہیں، ہر شاخ پر انھیں ہی بٹھائیں گے۔ یہ سیاست آج زندگی کے ہر شعبے میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اور اب سائنٹسٹ۔ کیسی کیسی کارآمد ایجادات کیں۔ کیسی کیسی سہولتیں فراہم کروائیں۔ مگر جن کے لیے یہ سب کچھ کیا، انھوں نے مثبت کم منفی رویوں سے زیادہ کام لیا۔ ’قزاق‘ یہاں بھی پہنچا ہوا ہے۔ مادی وسائل کے بے جا استعمال سے انسان نے جسمانی روگ لگائے۔ آگے بڑھا تو تباہی کے حیرت انگیز ہتھیاروں کا ذخیرہ جمع کرلیا اور بارود کے ڈھیر پر دنیا کو بٹھا کر چھوڑے یہ قزاق۔ اب تحقیقی جہاز نہ سمندر میں تیر سکتے ہیں اور نہ آسمانوں میں اڑ سکتے ہیں۔ ہے نا نئے نئے استحصال، نئی نئی تباہیوں کے منصوبے۔ اف پناہ ہے کہیں؟ انتہا ہے کہ پلاسٹک کی سبزیاں اور انڈوں تک کا بازار گرم ہے۔ بھلا ’قزاق‘ کے سامنے کیڑے مکوڑوں کی کیا اوقات؟

پیغام آفاقی کا ایک اور جملہ انتساب کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ ’مافیا‘ میں لکھتے ہیں: ’کائنات کی اجنبی گلیاں‘ طوفان، زلزلے، آتش فشاں، زندگی، فکر، آسمان، فرشتے، موسم، چاند، ستارے، کہکشاں، گردش، اللہ اور ان سب کو سمجھنے میں کوشاں ’انسان‘ اور ’انسان کی چند سانسیں‘ پیغام آفاقی کی منفرد فکر اور حسیات کی کارفرمائیاں جب ’مافیا‘ کے اوراق پلٹتے ہیں تو ’موسموں کی ناقابل برداشت شدت‘ اور ’پراثر کرداروں کا جنم‘ جیسے انتسابی جملوں کا درشن کرواتی ہیں۔ اب غور کیا جائے کہ ”موسموں کی ناقابل برداشت شدت“ سے مراد اگر جنگ و جدل، تحریکات، جمود، احتجاج، حق تلفی، فوقیت کا جنونی کھیل ہیں تو، یہی وہ شدتیں ہیں جو موسموں کے بدلنے کا سبب بنتی ہیں۔ پیغام آفاقی بے چین ہیں۔ حکومت، نظام اور ان کے ذریعے عام آدمی کے استحصال پر۔ یہی وہ شدتیں ہیں جو زندگی کے دھاروں کو سرے سے موڑ دیتی ہیں اور پھر ’مافیا‘ میں آگے بڑھیں تو ’پراسرار کرداروں کا جنم‘ جملے پر نظر ٹھہرتی ہے۔ آخر ’پراسرار‘ کون ہیں؟ باطن سے آواز آتی ہے۔ توحید، کائنات، قدرت، پیغمبر، روشنی، علم، محبت، صبر سکون، عشق، عورت، رشتے۔ سب کے سب پراسرار۔ زندگی کے اہم کردار جن کو سمجھنے، نبھانے، تراشنے، خراشنے میں ہی عمر بیت جایا کرتی ہے۔

پیغام آفاقی یہیں اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کا شعری مجموعہ ’درندہ‘ میں انھیں ’ہزاروں اجنبی چہرے، ہزاروں اجنبی گلیاں اور ہزاروں اجنبی راستے نظر آتے ہیں‘ تو انسان کی زندگی کا حاصل اور لاحاصل ہمارے روبرو آکر بس یہی سوال کرتا ہے کہ:

”کیا دہشت اور بربریت سے اٹی پڑی دھرتی پر اگر ہمیں رہنا ہے تو اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے اس دھرتی کے نام نہاد ٹھیکیداروں سے راہ و رسم پیدا کرنی ہوگی ورنہ ہمیں اجنبیت کے گہرے غار میں قید کردیا جائے گا۔“

’پلیتہ‘ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

”یوں تو دیکھنے میں ایسا لگتا ہے کہ ساری بڑی کہانیوں کا مرکز دارالسلطنت کی جڑیں ان دیہاتوں تک میں کتنی گہرائی سے گھسی ہوئی ہیں اس کا اندازہ صرف اہل نظر لگا سکتے ہیں۔“

’آزادی‘ پیغام آفاقی کی فکر نقطۂ عروج ہے۔ وہ آزادی ہے کیا:

”میری آزادی پوری کائنات سے اپنا رشتہ استوار کرنے کا ذریعہ ہے:

اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر شخص کی زندگی اس کے اور کائنات کے بیچ کا معاملہ ہے۔ دوسرے صرف اس کے پڑوسی ہیں۔“

اب ’درندہ‘ کی نظم کے یہ مصرعے بھی ملاحظہ فرمائیے:

”وہ دیکھو آدمی خود آدمی کے واسطے کیا ہیں\
وہ دیکھو\
ہاں وہ دیکھو\
آئینوں میں غور سے دیکھو\
درندہ کوئی بے فکری سے منھ کھولے ہوئے سنسان سڑکوں پر رواں ہے!!\
یہ پراسرار چہرے\
دھند کے آویزاں پردے\
اور ان پردوں کے پیچھے جانے کیا ہے؟“

متذکرہ بالا نثری شعری افکار کی بنیاد میں عصری حسیت کی دیدہ ریزی ہے۔ آج طمع، عناد، حسد کی دھند میں لپٹے ہوئے چہروں کی شناخت کرنا مشکل ہے۔ متفرق قسم کے مکھوٹے پہن کر انسان نما درندے انسانیت کا خون کشید کررہے ہیں۔“ پیغام آفاقی کس قدر بے چین سانسیں لینے پر مجبور ہیں۔ ایسے فنکار کے لیے فرار کی کوئی صورت بھی تو نہیں کیونکہ وہ بیدار ہے، عالم ہے، دانشور، شاعر ہے اور زندگی کو وسعت دینے والی اہم صنف ناول نگاری کے صفِ اول میں سے ایک ہے۔ موت کے بعد کی حقیقت سے واقف ہے۔ اسی لیے بار بار سوال کرتا ہے، یہ سوال ہوتے ہیں بڑے عجیب و غریب مگر غور سے دیکھیں اور محسوس کریں تو بے حد معنی خیز اور وہ بھی انتساب کے ذریعے۔

’انتساب‘ اور انتسابی جملوں کی یہ جگل بندی قارئین کو زندگی کی حقیقت اور اس کے رموز سے وہ واقفیت عطا کرتی ہے جو انکشاف کی طرح ایک روشنی، ایک چمک ایک انوکھی ڈگر پر لاکر کھڑا کردیتی ہے، جہاں سے انھیں اپنی زندگی کی زمینی حقیقتوں کا علم ہونے لگتا ہے۔

دراصل اردو ادب میں پیغام آفاقی ایک ایسا نام ہے جن کے افکار میں گہرائی، گیرائی اور فہم کی قوس قزح کی نیرنگیاں اپنی مکمل تہہ داری کے ساتھ قارئین کو اپنے دوش پر سوار کرکے ایک ایسی دنیا سے تعارف کرواتی ہے جہاں وہ دنیا کی سفاک سچائیوں کے روبرو ہوکر تخلیق کار کی فکر میں اپنی فکر کو مدغم کردیتا ہے۔ یہ عمل کب اور کس درمیان ہوجاتا ہے خود قاری کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن و دل پر اگر نقوش ثبت ہوتے ہیں تو وہ یہ کہ کائنات، قدرت اور ان کا محور و مرکز انسان۔ اگر آفتوں سے گھرا ہوا ہے تو آخر اس کی بنیاد میں وہ کون کون سے محرکات ہیں جو انسان کو اس قدر آزمائشوں میں مبتلا کردیتے ہیں۔ ان کا حل تلاش کرنے کے لیے وہ بھی فلسفیانہ گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی معمولی سی معمولی اشیا کو بھی اپنی مخصوص نظر سے دیکھ کر یہ اعتراف کروانے پر مجبور کردیتے ہیں کہ ہر لمحہ انسان کو غور و فکر کے بیانوں میں بھٹکتے ہوئے اپنے وجود، اپنی شناخت، اپنے لافانی ہونے کے عمل سے دوچار رہنا پڑے گا ورنہ رواں دواں سانسوں کی آمد و رفت کا ہمسفر، وقت، زندگی کو اپنی قید میں رکھ کر سب کچھ نچوڑ دے گا اور پھر وراثت کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔ اس عمل سے زندگی کا ارتقا اپنی سمت و رفتار کا اندازہ لگانے سے قاصر رہے گا۔ بالآخر وہ انسانوں کی سیاست، مکر وفریب، جرم، ظلم کے شکنجہ میں جکڑتا چلا جائے گا اور پھر اس میں احتجاج و مزاحمت کا مادہ اس قدر پست ہوتا چلا جائے گا کہ وہ استحصال ہونے نہ ہونے کے فرق میں امتیاز کرنے کے لائق بھی نہیں رہے گا۔ بالکل مردہ انسان۔ ویسے بھی اگر کچھ زندہ انسان ہیں بھی تو حکومت کے پاس ان کا بھی بہترین علاج ہے۔ ان کی سہولیات میں اضافہ کردیجیے۔ گہری نیند کے سرور میں ڈوب کر آواز ہی نہیں نکلے گی۔

بس یہی وہ فنکار ہیں جو معاصر ادب میں پیغام آفاقی کو ایک علیحدہ پہچان دیتے ہیں اور قاری ’انتساب‘ پڑھ کر ہی چونک اٹھتا ہے اور سنجیدہ ہوکر ان کی تخلیقات کو ہاتھ لگاتا ہے۔ پیغام آفاقی نے ثابت کردیا کہ تخلیق کار کی فکر میں خداداد روشنی اور پیغام ہوتا ہے۔

■

Sarwat Khan,
76, OTC, Scheme,
Radison Hotel Road, Malla Talai
Udaipur - 313001 (Raj)

لوک ادب تحفظ اور بازیافت

یوسف رام پوری

لوک ادب کسی بھی قوم کا عظیم سرمایہ ہوتا ہے۔ کیونکہ لوک ادب کے دامن میں اُس قوم کے گزشتہ ادوار، روایات، تہذیبی و معاشرتی اقدار اور لسانی و ادبی سلسلے آباد ہوتے ہیں۔ جو قوم اپنے تہذیبی، سماجی، ادبی اور لسانی ورثے کو محفوظ رکھتی ہے اور اس سے وابستہ رہتی ہے، اس قوم کے لیے ماضی و حال کے آئینے میں اپنے مستقبل کا لائحۂ عمل طے کرنا آسان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو قوم اپنے ماضی سے کٹ جاتی ہے، اس کی جڑیں کھوکھلی ہوجاتی ہیں اور اسے اپنے مستقبل کی تصویر دھندلی نظر آتی ہے۔ اسی لیے زندہ قومیں اور ملتیں حال کے سفر کو طے کرتے ہوئے عہد رفتہ کی مشعلوں کو ہاتھ میں اٹھائے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتی ہیں۔

زندگی کے سفر میں جدید تقاضوں اور نئے مطالبوں کو بروئے کار لانے کے لیے عہد رفتہ کی روشنی میں اپنی منزل کے نشانات کی تلاش وجستجو کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی کئی پرتوں کو کریدا جائے۔ کیونکہ ماضی وہ بھی ہے جو ابھی گزرا ہے، ماضی وہ بھی ہے جو چند دہائیوں اور صدیوں قبل گزرا تھا اور ماضی وہ بھی ہے جو ہزاروں سال پہلے گزر چکا ہے۔ انسان اپنے ان بیتے ہوئے زمانی ابعاد اور فاصلوں سے اسی طرح وابستہ ہے جس طرح گزرے ہوئے کل یا اس پل سے، جو ابھی گزرا ہے۔ انسان کا وہ وجود جو آج ہے اُس وجود کا تسلسل ہے جو ہزاروں سال پہلے تھا۔

یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آج کی ترقیات صرف دورِ حاضر کے انسان کی رہین منت نہیں بلکہ گزشتہ کئی ادوار کے اسلاف کی جہدِ مسلسل کا بھی نتیجہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگوں کی نگاہیں محض حال و مستقبل کی جانب مرکوز ہیں اور وہ ماضی کو کالعدم یا فرسودہ خیال کرکے اسے لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کے نئے افق پر عہدِ رفتہ کے بہت سے گراں قدر نقوش دھندلے دھندلے سے دکھائی دے رہے ہیں یا آنکھوں سے اوجھل ہوتے جارہے ہیں۔

زندگی کو دیکھنے کے نئے زاویوں نے اگرچہ بہت سے ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے، جو اب تک گمنامی کے دھندلکوں میں روپوش تھے، تاہم انسانی زندگی کے کئی پہلو ایسے بھی ہیں جو آج کے منظرنامے سے تیزی کے ساتھ اوجھل ہوتے جارہے ہیں۔ جیسا کہ قدیم روایتیں، تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی قدریں، پرانی زبانیں، بولیاں، قصّے کہانیاں وغیرہ۔ نئے زمانے میں تیزی کے ساتھ پردۂ گمنامی میں جانے والی اشیا کی فہرست میں لوک ادب بھی شامل ہے۔ وہ لوک ادب جس کی جڑیں بیتی ہوئی صدیوں سے گزرتی ہوئی نامعلوم زمانوں تک پہنچتی ہیں۔ جی ہاں، وہی لوک ادب جس کے آنگن میں کتنی ہی کہانیاں نسل درنسل سنائی جاتی رہی ہیں۔ کتنی ہی پہیلیاں زبان درزبان کہی جاتی رہی ہیں اور کتنے ہی گیتوں کی نغمگی فضا میں تحلیل ہوکر مختلف ادوار کے انسان کے ذہن ودل کے نہاں خانوں میں گونجتی رہی ہے۔

لوک ادب کو ماضی کا آئینہ کہا جاسکتا ہے جس میں ہم اپنے عہد رفتہ کو دیکھ بھی سکتے ہیں اور اس کی بازیافت بھی کرسکتے ہیں۔ ہماری پچھلی نسلوں کے افکار وخیالات کے دائرے کیا تھے، ان کے سماجی وتہذیبی عناصر کیا تھے، وہ کس طرح کی زبانیں اور بولیاں بولتے تھے، جب خوش ہوتے تو فرحت وانبساط کا اظہار کس طرح کرتے اور جب مغموم ہوتے تو ان کے یہاں غم کے اظہار کی کیا نوعیت ہوتی۔ ان کے یہاں تقریبات، رسوم وروایات، باہمی تعلقات اور عشق ومحبت کے انداز کیا تھے۔ ان سب چیزوں کی دریافت لوک ادب کے توسط سے بآسانی کی جاسکتی ہے۔ گزشتہ ادوار کے جو حالات ہم لوک ادب کے ذریعے جان سکتے ہیں، اس کی توقع ہم تاریخی کتب سے بھی نہیں کرسکتے۔ کیونکہ تاریخی مواد کے حوالے سے استناد اور معتبریت کا سوال ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

لوک کہانیوں، لوک گیتوں اور لوک پہیلیوں کا سلسلہ سینہ بہ سینہ چلتا رہتا ہے۔ گو اس بات کا علم نہ ہو کہ ان کہانیوں، گیتوں، پہیلیوں کے تخلیق کار کون تھے، لیکن بہرحال یہ اپنی جگہ سچ ہے کہ وہ گیت، کہانیاں، پہیلیاں مختلف نسلوں کے جذبات کی ترجمان وآئینہ دار رہی ہیں، تبھی تو ان کہانیوں کو عہد بہ عہد عوام الناس دہراتے رہے ہیں۔ لوک ادب کو انسانی زندگی سے قریب اس لیے بھی مانا جاسکتا ہے کہ وہ عوام الناس سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ دیہی، قصباتی زندگی کی ترجمانی زیادہ کرتا ہے، کسی حد تک شہری زندگی کی بھی عکاسی لوک ادب کے ذریعے ہوتی ہے۔ زیادہ تر انسانی آبادی کا تعلق چھوٹی چھوٹی بستیوں، گاؤں اور قصبوں سے رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ فی

زمانہ دنیا بھر میں بڑی بڑی آبادیوں والے بڑی تعداد میں شہر آباد ہوگئے ہیں، لیکن گزشتہ ادوار میں یہ صورت حال نہ تھی۔ اس لیے گزرے ہوئے زمانوں میں لوک ادب عوامی زندگی کی عکاسی کا موثر وسیلہ تھا۔ اس بابت پروفیسر قمر رئیس رقمطراز ہیں:

''لوک ادب اور لوک گیتوں کی چند مابہ الامتیاز خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ان کا مصنف گمنام ہوتا ہے۔ یہ گیت زیادہ تر اجتماعی اور کم تر انفرادی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اکثر یہ گیت محنت کش عوام کی اجتماعی تخلیقی محنت کے عمل میں خلق ہوتے اور گائے جاتے ہیں، ان کا آہنگ کسی عروضی قاعدے کے بجائے، عوام کے احساس موسیقی کا تابع ہوتا ہے۔ عوامی قصوں کے ماخذ بھی یا تو عوام کے تلخ و شیریں تجربات ہوتے ہیں یا پھر مصائب حیات سے نجات پانے کی ازلی خواہش اور ایک بہتر زندگی کے خواب ہوتے ہیں۔

لوک ادب المیہ اور حزنیہ بھی ہوتا ہے اور طربیہ بھی۔ یہ عوام کی ذہانت کا تخلیقی اظہار بھی ہوتا ہے اور ان کی تفریح و تفنن کا ذریعہ بھی۔ اس میں ہنسی مذاق، ٹھٹھول، طنز و تعریض، مذہبی عقیدت، دشمنوں سے نفرت، وطن دوستی، مظاہر فطرت سے محبت، جنسی جبلت، الغرض ہر طرح کے جذبات، احساسات اور واردات کا اظہار ہوتا ہے۔''

(اردو میں لوک ادب ص 8، مرتب: پروفیسر قمر رئیس)

لوک ادب سے عوامی رشتے کی گہرائی اور مضبوطی کے بارے میں پروفیسر محمد حسن نے مزید وضاحت کے ساتھ لکھا ہے:

''عوامی ادب سے مراد وہ ادب ہے جس کو عوام نے جنم دیا ہو۔ کوچہ و بازار میں، قریے اور دیہات میں، کھیت اور کھلیان میں اور عام طور پر اس ادب کا جنم داتا کوئی ایک شخص نہیں ہوتا، پورا معاشرہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس قسم کا ادب کسی ایک شخص سے منسوب بھی ہوگیا ہے۔ بعد میں تحقیق نے پتہ چلایا کہ یا تو یہ شخص ہی فرضی تھا یا پھر اس سے اس پورے کے پورے ادب کو منسوب کرنا غلط یا مشتبہ تھا...۔ وہ کہانیاں جو نانی دادی سناتی ہیں، وہ گیت جو جانے ان جانے آپ کے ہونٹ گنگنانے لگتے ہیں، وہ بول جنھیں آپ کچھ سمجھتے ہیں کچھ نہیں سمجھتے مگر کھیل کود میں دہراتے ہیں، یہ سب معاشرے کی دین ہیں اور ان کا خالق کوئی ایک فرد نہیں ہے اور اگر ہے تو گم نام ہے۔''

(اردو میں عوامی ادب ایک روایت، از پروفیسر محمد حسن، اردو میں لوک ادب، ص 25)

گزشتہ ادوار کی سادہ اور فطری زندگی میں لوگوں کی زبانوں سے اگر ایسا کچھ نکل جاتا جس سے عوام الناس کے جذبات کی تسکین ہوتی یا اس میں ان کی زندگی جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی یا کوئی تفریحی پہلو پنہاں ہوتا تو وہ سینہ بہ سینہ دور دور تک پھیل جاتا۔ اس عوامی ادب میں اتنی طاقت ہوتی کہ وہ ترسیل و ابلاغ کے وسائل و ذرائع کے فقدان کے باوجود زمانی اور مکانی ابعاد اور فاصلوں کو طے کرتے ہوئے دوسرے ملکوں تک چلا جاتا اور اگلی صدیوں میں داخل ہوجاتا۔

ادوار رفتہ میں لوک ادب کی مقبولیت کا راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عوام الناس کے لیے نہ اتنے تفریحی سامان تھے، جتنے کہ اس دور میں ہیں، نہ زندگی کے اتنے پہلو تھے، نہ رنگ رنگ کے واقعات، نہ ناول، نہ افسانے، نہ اخبارات و رسائل، نہ کتب، نہ ریڈیو اور نہ ٹی وی چینل، نہ کمپیوٹر، نہ انٹرنیٹ، نہ موبائل، نہ فیس بک، نہ واٹس ایپ، نہ نوع بہ نوع کاروبار و صنعتیں، نہ ملازمتیں، نہ مصروفیتیں۔ ان کے پاس فرصت کے اوقات تھے، کہانیاں کہنے اور سننے کا، پہیلیاں تخلیق کرنے اور حل کرنے کا ان کے پاس وقت تھا، گیت گانے کے لیے خواتین کے پاس فرصت بھی تھی اور ماحول و فضا بھی۔ کھیت کھلیان، بدلتے موسموں کے نظارے، اور ان سے بھرپور لطف لینے کے مواقع بھی ان کے پاس تھے۔ اگر کسی کے یہاں شادی کا موقع آجاتا تو ایک مہینے پہلے سے اس گھر میں عورتیں جمع ہوکر گیت گاتیں، وہی گیت جو کبھی ان کی دادیاں اور نانیاں گایا کرتیں۔ بہار اور برسات کے موسموں میں متعدد خواتین اکٹھی ہوکر باغوں میں چلی جاتیں، پیڑوں میں جھولے ڈال لیتیں، جھولتیں اور گیت بھی گاتی جاتیں، ہاں وہی گیت جو لوک ادب کا قیمتی سرمایہ تھے اور ہیں۔ بوڑھی عورتیں اپنے پوتوں، پوتیوں، نواسوں، نواسیوں کو کہانیاں سناتیں، بچے بڑے انہماک سے سنتے۔ پھر جب وہ بڑے ہوجاتے، جوانی سے گزر کر دادا، دادی، نانا نانی بن جاتے تو وہ بھی اپنے گھر کے بچوں کو اکٹھا کرکے وہی کہانیاں دوہراتے جو انھوں نے اپنے دادا دادی، نانا، نانی وغیرہ سے اپنے بچپن میں سنی تھیں، اس طرح ان کا وقت بھی گزر جاتا، قصے کہانیوں میں بچے نصیحت کی باتیں بھی سیکھ لیتے تھے۔ جوان چوپالوں میں جمع ہوجاتے اور پھر طویل قصے چھیڑ دیے جاتے۔ بعض اوقات وہ قصے اتنے طویل ہوجاتے کہ ہفتوں ہفتوں تک ختم نہ ہوتے، داستان گو قصے کے مناظر یہاں تک کہ جزئیات کو بھی بڑی خوبی سے بیان کرتا۔ یہ قصے لکھے ہوئے نہ ہوتے تھے، چنانچہ داستان گو کے لیے ان میں اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کرنے کی گنجائش ہوتی۔ بعض اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تخلیقی صلاحیت کا استعمال کرتے اور بعض چیزوں اور پہلوؤں کو جوڑ کر ان قصوں کو مزید طویل اور دلچسپ بنادیتے۔ اس طرح سامعین کے لیے مزید سامان تفریح و تفنن بھی جمع ہوجاتا۔ ان کا وقت گزر جاتا، مختلف علاقوں، زمانوں اور طبقوں کی تہذیب و ثقافت کا بھی علم ہوجاتا اور کچھ عبرت کی باتیں بھی سیکھنے کو مل جاتیں۔

لوک کہانیوں، پہیلیوں وغیرہ سے ہر دور کے بچے بھی وابستہ رہے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں سے قصے کہانیاں سنتے تھے، ساتھ ہی خود بھی بعض ایسی باتیں یا نظمیں دہراتے تھے جن سے انھیں خوشی ملتی، گاتے، مچلتے اور فطری زندگی کا مزہ لوٹتے۔ دراصل اس نوع کی باتوں سے ان کا واسطہ ماں کی گود سے ہی پڑنا شروع ہوجاتا۔ ماں بچے کو لوریاں سناتی ہوئی کہتی:

چندا ماموں دور کے
بڑے پکائیں بور کے
آپ کھائیں تھالی میں
اوروں کو دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ
چندا ماموں گئے روٹھ

جب بچہ ذرا ہوش سنبھالتا تھا، بولنا سیکھتا، بچوں کے درمیان کھیلتا تو سنتا: ''اکڑ بکڑ بمبے بو'' اور پھر خود بھی گانے لگتا ہے:

اکڑ بکڑ بمبے بو
اسی نوے پورے سو
سو میں لگا تاگا
چور نکل کے بھاگا

اس طرح کے بول بولتے ہوئے بچوں کو کھیل کود میں بڑا مزہ آتا تھا۔ کوئی پہیلی کہتا اور دوسرے اس کو حل کرنے میں دماغ صرف کرتے۔ بعض پہیلیاں نہ جانے کب سے چلی آرہی ہوتیں اور بعض پہیلیاں کچھ ذہین بچے غور و فکر کرکے خود ایجاد کرلیتے، لیکن اب ان پہیلیوں، لوریوں اور بچوں کے درمیان معروف مذکورہ مرتب لفظوں کا تحفظ مشکل نظر آرہا ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں ان کا سلسلہ ٹوٹتا دکھائی دے رہا ہے۔ آج بچے ذرا ہوش سنبھالتے ہیں تو ان کے سامنے ٹی وی کی اسکرین ہوتی ہے یا موبائل اور موبائل پر انواع و اقسام کے گیمز ہوتے ہیں۔ بچے ان گیموں کو دیکھنے اور کھیلنے میں دلچسپی لینے لگتے ہیں، ان گیموں میں موٹر گاڑیاں، ٹرینیں، ہوائی جہاز اور نئے آلات دکھائے جاتے ہیں۔ بچے خواہی نہ خواہی اس

طرح ان سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

بچپن سے ہی ٹیکنکل آلات سے جڑ جانے کی وجہ سے بچوں کا ذہن بھی ٹیکنکل ہوتا چلا جا رہا ہے، اور تخلیقی سطح پر وہ کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ جو داستانیں کبھی بچوں کو سنائی جاتیں، آج ٹی وی پر دکھائی جاتی ہیں۔ داستانیں خواہ وہی یا ایک جیسی کیوں نہ ہوں لیکن دونوں کے اثرات جداگانہ ظاہر ہوتے ہیں۔ بچے جو کہانیاں سنتے ہیں، ان کے کرداروں، ان کے راستوں، پگڈنڈیوں، پہاڑوں، ندیوں، پرانی حویلیوں، شادی بیاہ کے ہنگاموں، سب کی تصویریں خود بخود ان کے ذہن میں بنتی چلی جاتی ہیں، یعنی ان کے ذہن کی تخلیقی صلاحیت کو جلا ملتی ہے، لیکن جب انھیں کہانیوں اور قصوں کو فلما کر بچوں کو دکھایا جاتا ہے تو وہ ان سے محظوظ تو ہو سکتے ہیں، مگر ان کے اذہان خود کرداروں کے حلیے، ان کی حرکات و سکنات، خوبصورت جھیلیں، آبشاروں کی تصویریں اور گزرگاہیں خلق نہیں کرتے، اس طرح ان کی تخلیقی قوت زنگ آلود ہوتی چلی جاتی ہے۔ جیسے ہی بچے بڑے ہوتے ہیں، جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں یا رکھنے والے ہوتے ہیں، ان کے ذہن یا تو اسکولوں کے نصابات کی کوٹھریوں میں قید ہو جاتے ہیں یا پھر وہ کچھ کمانے کی تگ و دو میں دنیا کے جھمیلوں میں الجھ جاتے ہیں اور ایسے مصروف ہو جاتے ہیں کہ پھر کبھی زندگی بھر انھیں فرصت کے لمحات میسر نہیں آتے۔ اگر کچھ وقت بچتا ہے تو ٹی وی آن کر لیتے ہیں، اور فلمی، تفریحی، خبری چینلوں کو دیکھتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ بچوں کو کہانیاں سنانے، پہیلیاں کہنے اور لوک گیت گانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

لوک گیتوں سے خواتین کا گہرا تعلق رہا ہے، خواہ وہ تعلق شادی کے موقع پر گائے جانے والے گیتوں کی شکل میں ہو، یا بارہ ماسہ کی شکل میں ہو، یا پھر خوشی و غم کے دیگر مواقع کی صورت پر گائے جانے روایتی لفظوں کی شکل میں ہوں، لیکن موجودہ زمانے میں خواتین کا ان گیتوں سے رشتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ آج فلمی گانوں کا چلن زیادہ ہے، جنھیں بڑے بڑے فنکار موسیقی کے ساتھ گاتے ہیں، چنانچہ خواتین ان فلمی گیتوں کو زیادہ سنتی اور گاتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی فلمی گیت اب ان کی زبان پر آتے ہیں نہ کہ وہ پرانے گیت و نغمے جو ان کی دادیوں اور نانیوں نے گائے تھے۔ اس کے علاوہ ٹی وی کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے خواتین اب سیریلوں میں مگن دکھائی دیتی ہیں۔ سیریلوں میں ان کی بڑھتی دلچسپی نے قدیم روایتوں سے ان کے رشتے کو منقطع یا کمزور کر دیا ہے۔ چنانچہ اب انھیں شادی کے مواقع پر گیت گانے میں بھی کوئی خاص دلچسپی نظر نہیں آتی۔ جو گیت اب سے کچھ دہائیوں پہلے ساری عورتوں کو یاد ہوتے تھے، اب چند فیصد عورتوں کو بھی یاد نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں لوک گیتوں کا تحفظ یقیناً دشوار ترین مرحلہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان گیتوں کو لکھ کر کتابوں میں محفوظ کر دیا جائے، جیسا کہ کیا بھی گیا ہے اور کیا بھی جا رہا ہے۔ اس طرح کچھ چیزوں کو کاغذوں میں تو ضرور محفوظ کیا جا سکتا ہے، مگر سینوں میں نہیں۔ جب سینوں میں لوک گیت محفوظ نہیں ہوں گے، زبانوں پر نہیں آئیں گے تو قدیم لوک ادب کی زندگی و فنا کا سوال تو اٹھے گا ہی۔

قدیم لوک ادب کی بازیافت اور جو لوک ادب ہنوز زندہ ہے، اس کے تحفظ کا مسئلہ میرے خیال سے ادب کا ایک ایسا مسئلہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کیا جانا چاہیے۔ یہ مسئلہ اردو لوک ادب کا ہی نہیں بلکہ اس جہان رنگ و بو کے ساتھ بدلتے حالات و تغیرات میں تمام دنیا کی زبانوں کے لوک ادب کا ہے۔ ہر زبان اپنے قدیم عوامی ادب کو گم کرتی دکھائی دے رہی ہے۔ عہد حاضر میں کتنی ہی زبانیں، بولیاں اپنا وجود معدوم کر چکی ہیں۔ جس کے سبب بہت سی قیمتی قدریں، روایتیں، تہذیبیں مٹ چکی ہیں اور مٹ رہی ہیں۔ اگر دور حاضر کی قومیں حال و مستقبل کے ساتھ اپنے ماضی، اپنے سماج اور تہذیب سے جڑے رہنا چاہتی ہیں تو انھیں اپنی زبانوں اور ان کے ادبی سرمایوں کی حفاظت کرنے اور زندہ رکھنے کی راہیں تلاش کرنی ہوں گی۔

جہاں تک اردو زبان و ادب کے لوک ادب کا سوال ہے تو لوک ادب سے اردو کا رشتہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اردو زبان۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ اردو کا خمیر ہندوستان کے مختلف علاقوں کی جن بولیوں سے مل کر تیار ہوا ہے، ان میں لوک گیت، لوک کہانیاں اور لوک پہیلیاں پہلے سے موجود ہیں۔ جب اردو وجود میں آئی تو ان بولیوں کا لوک سرمایہ اردو میں منتقل ہو گیا۔ کھڑی بولی، قنوجی، ہریانوی، پنجابی اور دکنی بولیوں اور زبانوں کے لوک ادب کا خاصا بڑا ذخیرہ آج اردو ادب کا حصہ ہے۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام اس حصے کو جو پہیلیوں اور گیتوں پر مشتمل ہے، اردو لوک ادب کا قیمتی اور قدیم ذخیرہ کہا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی بہت سے صوفی سنتوں کی حکایتیں اور دوہے بھی اردو کے لوک ادب میں شامل ہیں۔ دہلی اور اس کے مضافاتی علاقوں، نیز شمال اور دکن کے مختلف اضلاع میں جو عوامی گیت گائے جاتے رہے ہیں، یا جو پہیلیاں زبان زد عام رہی ہیں یا جو داستانیں عوام کے درمیان سنی سنائی جاتی رہی ہیں، وہ بھی اردو لوک ادب کا سرمایہ ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اردو لوک ادب کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ امتداد زمانہ کے باعث یا نئے تقاضوں اور مطالبوں کے سبب اردو لوک ادب کا بہت بڑا حصہ محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔

اردو لوک ادب کے سرمایہ کی حفاظت اور اس کی اشاعت سے عدم دلچسپی یا کم توجہی کے باعث بھی اردو لوک ادب کی کمیابی کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ دراصل اردو زبان نے بہت جلد درباروں تک رسائی حاصل کر لی اور شرفا و رؤسا نے اسے اپنا لیا۔ وقت کے اہم ادبا و شعرا بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے، اس لیے اعلیٰ زبان بولنے اور اعلیٰ شاعری کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ میر، سودا، بہادر شاہ ظفر، ذوق، غالب، داغ، مومن، انشا، مصحفی اور اقبال جیسے شاعروں نے اردو شاعری کے لیے جو راہ ہموار کی اس پر لوک گیتوں اور دوہوں کو کمتر خیال کیا گیا۔ اس کے باوجود یہ کہنا کسی بھی طور مناسب نہ ہوگا کہ اردو کے پاس لوک ادب کا سرمایہ نہیں ہے۔ بلاشک و شبہ اردو کا انسلاک شاہوں، رئیسوں اور درباروں سے رہا ہے لیکن یہ عوامی زبان بھی رہی ہے۔ اگر عوامی نہ ہوتی اور صرف درباروں یا شاہوں تک ہی اس کا دائرہ محدود ہوتا تو رجواڑوں کی تباہی کے ساتھ اس کی بساط بھی الٹ جاتی اور آج اس کا زندہ و تابندہ رہنا تو دور کی بات اس کے آثار کو ڈھونڈ پانا بھی مشکل ہوتا، لیکن اردو نہ صرف یہ کہ ہنوز زندہ ہے بلکہ وقت کے ساتھ اس کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے اور اسے عوام کے درمیان شوق کے ساتھ بولا اور سمجھا جا رہا ہے۔

اردو میں ضرب الامثال اور کہاوتوں کا ایک جہان آباد ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کی جڑوں میں لوک ادب موجود رہا ہے۔ کیونکہ عوام کے بغیر نہ زبان پوری طرح وجود میں آ سکتی ہے، نہ وہ دور تک پھیل سکتی ہے اور نہ دیر تک قائم رہ سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو کئی زمانوں اور صدیوں پر محیط ہے اور اس کا مکانی کینوس بھی کئی ملکوں اور براعظموں تک پھیلا ہوا ہے، اس لیے اردو کی تہوں میں لوک ادب کی شمولیت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے اپنے لوک ادب کی بازیافت کریں اور اسے زبانی اور تحریری طور پر محفوظ کرنے کے لیے امکانی اور عملی کوششیں کریں۔

■

Dr. Mohammad Yousuf
Research Scholar, University of Delhi
Delhi - 110007

اختر شیرانی کی رومانی شاعری

محمد نصر اللہ خان

اختر شیرانی کا اصل نام محمد داؤد خاں تھا۔ 4 مئی 1905 کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ پھر لاہور آکر اورینٹیل کالج میں داخلہ لیا، منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ان کا میلان ومزاج صرف شاعری کی جانب تھا۔ پہلے پہل تو کلام کی اصلاح تاجور نجیب آبادی سے لی اور بعد میں اپنی طبع خداداد ہی کو اپنا استاد مانا۔ آپ رسالہ ہمایوں، خیالستان، رومان، شاہکار سے وابستہ رہے۔ اس طرح اختر نے صحافتی خدمات سے اردو زبان وادب کو آراستہ کیا۔ 1934 کے آس پاس اختر کی شاعری پورے شباب پر تھی۔ رومانیت آپ کی شاعری کا سب سے قیمتی جوہر تھا اس لیے شاعر شباب ورومان کے طور پر پہچانے گئے۔

اس سے پہلے اردو میں رومانی شاعری کو اپنا موضوع سخن بنا کر اکثر شعرا نے کمال حاصل کیا ایک تحریک کے طور پر بھی رومانیت کو اولیت کا مقام حاصل ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیوں سے اس تحریک کو دو چار ہونا پڑا۔ وقت، حالات اور نزاکت کا جدا ہونا رومانیت کے لیے ساز گار ماحول نہ رہا اس کے باوجود تقریباً ہر دور میں شعرا نے رومانیت کو اپنے فن کے اظہار کا وسیلہ بنایا مجاز کو رومانیت کا شہید کہا جاتا ہے اس لیے کہ مجاز کی شاعری رومانیت کے ارد گرد طواف کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لگ بھگ اسی طرح کی شاعری اختر شیرانی کی ہے جنھوں نے اپنے منفرد لب ولہجے سے رومانیت کو ایک اہم مقام عطا کیا۔

شاعری حیات انسانی کے مختلف مرحلوں، گوشوں اورنشیب وفراز کی ترجمانی کرتی ہے۔ زندگی کی مختلف کیفیتوں کی طرح شاعری بھی ایک اہم کیفیت ہے۔ رومانیت بھی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے۔ اختر شیرانی کی رومانی شاعری رومانی تخیل کی گہرائیوں کی سیر کراتے ہوئے حقیقت میں عہد رومان کی دستاویز کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اختر کی شاعری نفسی انقلاب کا نمونہ ہے۔ واقعتاً اختر کی شاعری حسن کا ایک وسیع تر مفہوم پیش کرتی ہے جس میں امن وسکون کو بڑی معنویت ہے۔

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے\
نفرت گہ عالم سے لعنت گہ ہستی سے\
ان نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے\
دور اور کہیں لے چل\
اے عشق کہیں لے چل\
آنکھوں تلے پھرتی ہے اک خواب نما دنیا\
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا\
جنت کی طرح رنگیں شاداب نما دنیا\
اللہ وہیں لے چل\
اے عشق کہیں لے چل

اختر شیرانی کی شاعری حسن وعشق کے نئے انداز و نئے پہلوؤں کو پیش کرتی ہے۔ ویسے اُن کی شاعری تخیل کی معراج ہے رومان جس کا مرکز اور زندگی جس کی حقیقت ہے اگر یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اختر کی شاعری میں زندگی کی دھڑکن محسوس کی جاسکتی ہے۔ اور اختر کی شاعری میں محبت کے نغموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ سلمٰی ایک علامت ہے پیار، خلوص، محبت، عشق، ہمدردی اور زندگی جینے کا سہارا ہے۔ سلمٰی ایک محبوب ہے، تمنا، آرزو، خیال وتصور کی گہرائیوں میں ایک جینے کی امید یا جینے کا حوصلہ جو ملتا ہے وہ محبت ہے اسی محبت کا ایک اہم باب سلمٰی کا کردار ہے۔

وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے\
وہ ہنستی ہے تو فطرت مست ہوکر مسکراتی ہے\
وہ سوتی ہے تو بزم کہکشاں کو نیند آتی ہے

سلمٰی علامت بھی ہے اور اشارہ بھی تصور بھی ہے اور تخیل بھی، تنور بھی ہے اور تطور بھی غرض کہ اختر کی شاعری کا مرکزی خیال سلمٰی کے روپ میں نظر آتا ہے۔ جس طرح ورڈس ورتھ کے لیے لوسی اور کیٹس کے لیے فینی براؤنی۔ یہ ایسے کردار ہیں جو شاہکار ہیں جو شاعری میں

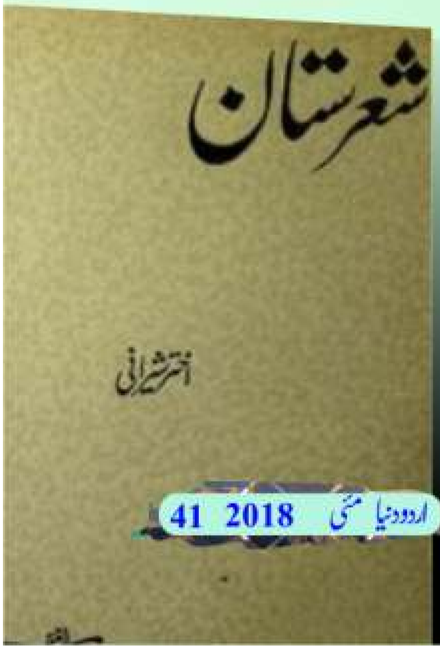

حقیقی تصاویر کا عکس ہیں۔ اگر یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ حسن صداقت کے ہم معنی ہے یہ رومانیت کا فلسفہ ہے چند ایک معاملات میں ناقدین اس سے مخالف ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہی سچائی ہے۔

بہار حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمٰی
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشت رنگ وبو کا تو سراپا اک نظارا ہے
تری صورت سراپا پیکر مہتاب ہے سلمٰی
ترا جسم اک ہجوم ریشم وکم خواب ہے سلمٰی
تو اس سنسار میں ایک آسمانی خواب ہے سلمٰی
جہان قدس کا تو ایک نورانی فسانہ ہے
تجھے سلمٰی دیار ناز کی اک ساحرہ کہیے
صنم آباد عفت کی مقدس کا فرہ کہیے
ارباب حسن کا تو ایک الہامی ترانہ ہے
پرستان لطافت کی تو ایک رنگین کہانی ہے
جوان فطرت کا تو اک گمشدہ خواب جوانی ہے

سلمٰی دراصل اختر کی شاعری میں جسم میں جان اور روح کا درجہ رکھتی ہے۔

سلمٰی اصل میں جمال ذہنی ہے، ان کی مشہور نظموں میں سلمٰی سے دل لگا کر، ایک خاتون کی شاعری پر، چلی گئیں حسرت دیرانہ، گزارش، دیار شیریں، کس لیے تنہا چلی آئی، ان رس بھری انکھوں میں حیا کھیل رہی ہے، کچھ تو تنہائی کی راتوں میں سہارا ہوتا، زندگی وغیرہ۔

اختر کے ترانے درد والم، سوز وگداز، پیار ومحبت، الفت وحقیقت کا عکس ہیں۔ اختر کے گیت اردو میں رومانیت کی نئی پہچان کرانے میں کافی حد تک کامیاب ہیں کیونکہ محبت اختر کے یہاں عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اختر شیرانی نے اردو رومانی شاعری کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ آج تک شعرا

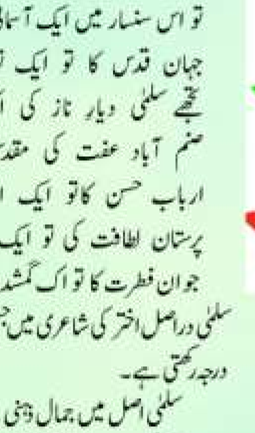

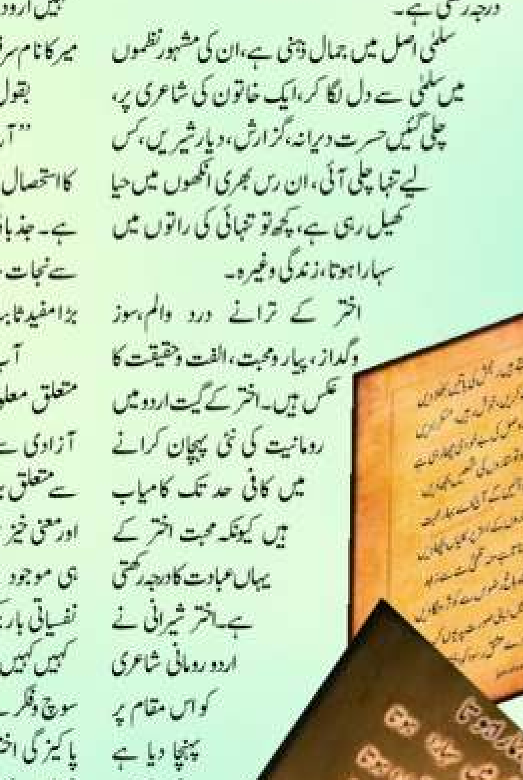

بس اس کا نظارہ دیکھ رہے ہیں اردو روایتی شاعری کو اختر شیرانی نے اپنے الگ انداز سے ایک سند عطا کی ہے جس کی عظمت کا اقرار ہر کوئی کرتا رہے گا۔

بقول آغا حشر کاشمیری:

کبھو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخیل اختر میں

اختر شیرانی کا تخیل اپنی فضاؤں میں پرواز کرتا ہے اس ضمن میں پروفیسر سید اختر احمد لکھتے ہیں "حسن کی حواسی شعور اور اس کی تعبیر واظہار کی طرف اختر کا تخیل مرکوز ہے۔"

ایک اور جگہ پر اختر احمد صاحب رقم طراز ہیں:

"اختر کے تخیل کی خلاقی دنیائے حسن کو بسانے میں صرف ہوتی ہے۔ اس عالم نو، سرور ونور کا کوثر، لنڈایا جاتا ہے شباب وحسن کی بجلیوں کو لہرانے کا اذن دیا جاتا ہے اور ناز کی بستیاں بسائی جاتی ہیں۔"

اختر کی شاعری کا لب لباب درد اور احساس ہے جس کا تعلق دل اور روح سے ہے۔ اختر جذبات کی لے میں بہہ نہیں جاتے۔ ہاں روح کانپ اٹھتی ضرور ہے جو کہیں اردو کے قدیم شعراء کی یاد دلاتی ہے جن میں میر تقی میر کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔

بقول یونس حسن:

"آج کے دور میں ادب کے رومانی اور افادی پہلوؤں کا استحصال ہو رہا ہے۔ اختر کے کلام کی قدر وقیمت مسلم ہے۔ جذباتی آسودگی، ذہن وفکر کی بالیدگی اور تلخ حقائق سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان کی شاعری کا مطالعہ بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔"

آپ کے موضوعات، قومی وسماجی اصلاح سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے کلام میں تحریک آزادی سے متعلقہ نظمیں بھی ملتی ہیں۔ بچوں اور عورتوں سے متعلق بڑی پیاری نظمیں بھی خوب لکھی ہیں جو پر لطف اور معنی خیز ہیں۔ ہلکی پھلکی اور معنی خیز نظموں کا ایک ذخیرہ ہی موجود ہے۔ جذبات واحساسات کا بڑا اچھا نمونہ نفسیاتی باریکیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انداز سنجیدہ ہاں کہیں کہیں مزاح سے بھی کام لیا ہے۔ اختر نے اردو کو نئی سوچ وفکر سے ہمکنار کیا ہے۔ فکر کی جولانی اور خیالات کی پاکیزگی اختر کا کمال ہے، سادگی، لطافت اور چاشنی آپ کے کلام کے قیمتی جواہر ہیں۔

نسیم کوئے یار آئے نہ آئے
میرے دل کو قرار آئے نہ آئے
خزاں ہی سے نہ کیوں ہم دل لگالیں
خدا جانے بہار آنے نہ آئے

جب میری قبر پر وہ پھول چڑھانے آئے
موت کی نیند کے ماتوں کو جگانے آئے
کوئی اس وعدہ فراموش سے اتنا کہنا
آپ اب کس لیے روٹھوں کو منانے آئے

محبت میں جو ہو جاتا ہے پائندہ نہیں مرتا
صداقت جس کو کر دیتی ہے تابندہ نہیں مرتا
ہے جس میں عشق رقصاں وہ دل زندہ نہیں مرتا
نوائے لافنا ہے روح کے خاموش تاروں میں
مری سلمٰی مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں

صحیح جذبات کی عکاسی بڑی فنکاری کے ساتھ کی ہے بیباک انداز، نئے تجربے، اسلوب وہیئت کی خوبصورتی سے اختر کی پہچان بنتی ہے۔ ترقی پسند دور میں بہت سارے شعرا آپ سے متاثر تھے۔ اختر نے صالح روایات کی پاسداری بھی کی ہے۔ اور نئی راہوں کی تلاش کر کے اس پر چلنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ادب ایک وسیع میدان ہے۔ لہٰذا اختر نے ادب کے اس وسیع سمندر میں کامیاب غوطہ لگایا ہے۔ آنے والا دور اختر کی فنی وفکری بصارتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے نئی سوچ وامنگ کی راہوں کو تلاش کرتا رہے گا، اختر کی کوشش وکاوشیں محققین کے لیے دعوت فکر کا کام دیتے ہیں۔

اختر شیرانی کی شاعری حالات حاضرہ کا آئینہ بھی ہے اور اردو کی روایتی شاعری کا ایک نمونہ بھی۔ اختر شیرانی نے رومانی موضوعات کو الگ ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے پاکیزہ محبت کی عظمت کا اقرار ہر کوئی کرتا ہے اختر شیرانی نے رومانی لب ولہجے میں نیا انداز، نئی تشبیہات، خوبصورت کنایات، عمدہ خیال، تصور وتخیل کی گہرائی، معاملات حسن کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اختر شیرانی نے اردو شاعری کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہی نتیجہ ہے کہ اختر شیرانی کے بعد اس نوعیت کا کلام اردو ادب میں بہت کم ملتا ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اختر شیرانی اور رومانیت دونوں ایک ہی ہیں یا دونوں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں دونوں کو الگ نہیں کر سکتے۔ اس طرح اختر شیرانی کی خوبصورت تخلیقات محققین وناقدین کے لیے ایک عظیم سرمایہ سے کم نہیں جوان کی شاعری سے اردو ادب کے بیش بہا خزانے میں رومانیت کا باب بڑا روشن نظر آتا ہے۔

■

Dr Mohd Nasrullah Khan
Depf of Urdu
Coempo University,Sahyadri College Campus
Shivamogga-577203 (Karnataka)

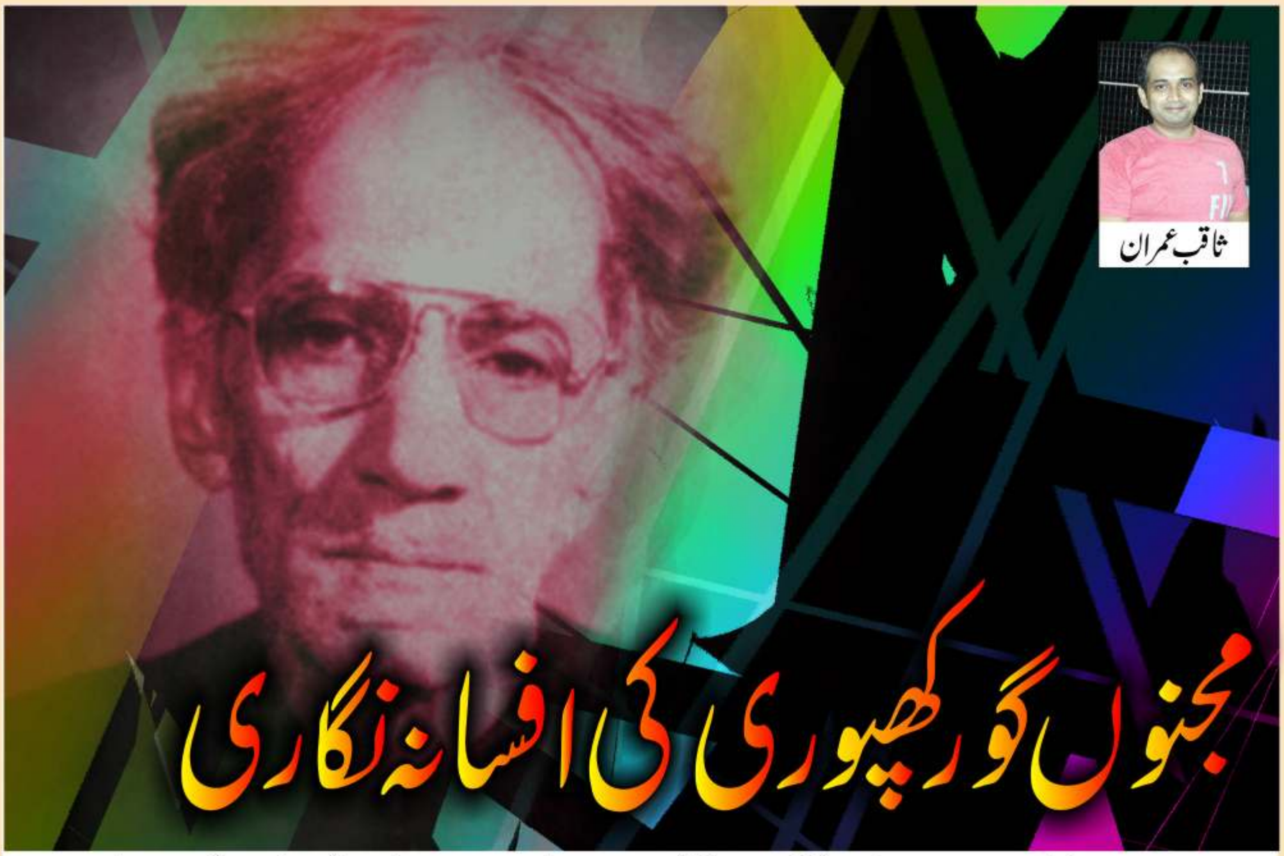

ثاقب عمران

مجنوں گورکھپوری کی افسانہ نگاری

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری 10 مئی 1904 کو مشرقی یوپی کے ضلع بستی، تحصیل خلیل آباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے مضمون ''مجھے نسبت کہاں سے ہے'' میں اس سلسلے میں خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ مضمون پہلے پہل رسالہ نقوش لاہور 1964 کے شخصیات نمبر میں شائع ہوا، بعد ازاں 'ادب اور زندگی' میں بھی اسے شامل کرلیا گیا۔ مجنوں گورکھپوری نے شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے، لیکن اردو ادب میں ان کی بنیادی پہچان ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے نمایاں ہے۔ ان کی تنقید نگاری کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن بطور افسانہ نگار وہ ناقدین کی توجہ کم ہی مبذول کرا سکے۔ مجنوں گورکھپوری کے زیادہ تر افسانے 1925 سے 1935 کے درمیان شائع ہوئے۔ جس میں سے بیشتر افسانے انھوں نے 1929 تک لکھ لیے تھے۔ 1935 کے بعد ترقی پسند تحریک کا دور شروع ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد مجنوں گورکھپوری نے مضامین اور تنقیدیں تو لکھیں لیکن ان کے افسانے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

میری تحقیق کے مطابق مجنوں گورکھپوری کے صرف تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو مجموعے 'خواب و خیال' اور 'سمن پوش' کی اشاعت مجنوں گورکھپوری کی نگرانی میں ہی 'ایوان اشاعت' گورکھپور سے ہو چکی تھی۔ تیسرا افسانوی مجموعہ 'مجنوں کے افسانے' کے عنوان سے ان کے علی گڑھ تشریف لانے کے بعد شائع ہوا۔ یہ مجموعہ چند افسانوں کا انتخاب ہے جسے مجنوں گورکھپوری نے حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی کے روح رواں جناب اظہر عباس صاحب کی خواہش پر کیا تھا۔ انھوں نے اس انتخاب پر جو مقدمہ لکھا تھا اس پر 5/اکتوبر 1935 کی تاریخ درج ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ 1935 کے آخری مہینوں میں شائع ہوا تھا۔ میرے اس مضمون کا محرک ان کا یہی تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی شان نزول کے بارے میں مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''......حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی کے کارفرما جناب خواجہ اظہر عباس صاحب بی اے (علیگ) نے مجھ سے یہ فرمائش کی کہ میں ان کو اپنی کوئی کتاب شائع کرنے کے لیے دوں۔ میں نے فوراً اپنے ضخیم مجموعے سے کل مختصر افسانے علیحدہ کر کے ان کے حوالے کر دیے۔ نہ صرف اس لیے کہ اس طرح مجھے کچھ رقم مل گئی بلکہ بالخصوص اس لیے کہ ایک حوصلہ مند نوجوان کا ادبی حوصلہ پورا ہو رہا ہے، اور میرے بعض افسانوں کی اشاعت ہوئی جاتی ہے۔ یہ ہے اس مجموعے کی شان نزول۔''[1]

کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری کی ایک تحریر پر نظر پڑی تھی جس میں انھوں نے اپنے افسانوں کا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ 1930 کے آس پاس وہ بحیثیت افسانہ نگار مشہور تھے۔ ان کے اس جملے نے مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی کی دیگر لائبریریوں کے چکر بھی لگوائے لیکن مجنوں گورکھپوری سے متعلق افسانوں کا سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اس واقعے کے کچھ وقت بعد عالمی کتاب میلہ 2014 دہلی میں منعقد ہوا۔ وہاں پر مجھے عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ کے اسٹال پر 'مجنوں کے افسانے' کے عنوان سے ایک پاکٹ سائز کتاب نظر آئی۔ میں نے اسے شوق سے اٹھایا تو یہ مجنوں گورکھپوری کا تیسرا افسانوی مجموعہ تھا۔ اس افسانوی مجموعے کے مل جانے کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر سے مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کو تلاش کرنے کا ارادہ کیا اور پہلی مرتبہ یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ان پر کیا کچھ کام ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر شاہین فردوس کی ایک کتاب 'مجنوں گورکھپوری: حیات اور ادبی کارنامے' کے عنوان سے ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے 2001 میں شائع کی ہے۔ یہ کتاب شاہین فردوس کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ مقالے کا ایک حصہ جو تقریباً 73 صفحات کو محیط ہے، مجنوں گورکھپوری کی افسانہ نگاری کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اس حصے کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ شاہین فردوس کی رسائی پہلے دو مجموعوں

یعنی ''خواب وخیال'' اور ''سمن پوش'' تک تو ہوگئی تھی لیکن تیسرا افسانوی مجموعہ ان کی دسترس سے باہر تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے علم میں نہیں رہا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تلاش وجستجو کے بعد بھی تیسرے مجموعے تک رسائی نہ ہوسکی ہو۔ اس مجموعے میں کل آٹھ افسانے شامل ہیں۔ (1) ہتیا (2) گہنا (3) حسنین کا انجام (4) مراد (5) جشن عروسی (6) بڑھاپا (7) کلثوم (8) محبت کا دم واپسیں۔ ان آٹھ افسانوں میں سے ابتدائی چار افسانوں کا ذکر تو شاہین فردوس نے بھی اپنے مقالے میں کیا ہے جو غالباً پہلے دونوں افسانوی مجموعوں میں شامل رہے ہوں گے لیکن آخر کے چار افسانوں کا ذکر ان کے مقالے میں نہیں ملتا اور نہ ہی انھوں نے اپنے مقالے میں تیسرے افسانوی مجموعے کا کہیں ذکر کیا ہے۔ پہلے چار افسانوں کے تعلق سے میں نے لکھا ہے کہ 'غالباً' یہ افسانے پہلے دو مجموعوں یعنی 'خواب وخیال' اور 'سمن پوش' میں شامل ہوں گے۔ 'غالباً' اس لیے لکھا کہ ابھی تک میری رسائی ان مجموعوں تک نہیں ہوسکی ہے لیکن شاہین فردوس کے مقالے میں ابتدائی چار افسانوں کا ذکر میری بات کو قوی بناتا ہے۔ خیر جب بات ڈاکٹر شاہین فردوس کے تحقیقی مقالے پر آہی گئی ہے تو صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ ان کے اس تحقیقی کام کے بعد بھی مجنوں گورکھپوری کی افسانہ نگاری پر ایک اچھے اور بھرپور کام کی ضرورت باقی ہے۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ یہ شاہین فردوس کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا اور پی ایچ ڈی یا دیگر مقالے جو کسی خاص بندھے ٹکے اصول کے تحت لکھے جاتے ہیں ان میں مقالہ نگار کو بعض اوقات آزادی سے کام کرنے کا موقع نہیں ملتا اور اس کے لیے اصول وضوابط کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ بہرحال شاہین فردوس کے مقالے پر مزید گفتگو نہ کرتے ہوئے ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری نے 'مجنوں کے افسانے' میں 'شان نزول' کے عنوان سے مقدمہ بھی لکھا ہے۔ مقدمہ میں وہ اپنے افسانوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''مجھے ارمان تھا اور میں اس کا اہتمام بھی کر رہا تھا کہ اب میرے جتنے مختصر اور طویل افسانے مختلف رسائل میں منتشر پڑے رہ گئے ہیں، ان کو بڑی تقطیع پر، یکجا کر کے شائع کر دیا جائے۔ یہ کتاب اگر وجود میں آتی تو 800 صفحات سے کم ضخیم نہ ہوتی۔ لیکن ضعیف البنیان انسان کا ارادہ ہی کیا؟ سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔''[2]

مجنوں گورکھپوری کے درج بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مختصر سی مدت میں کتنی کثیر تعداد میں افسانے لکھے ہیں۔ بہرحال ان کے تمام افسانے ابھی رسائل تک ہی محدود ہیں جن کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا عمل ابھی باقی ہے۔ ایسا کیوں ہوا کہ اپنے جن افسانوں کو یکجا کرنے کی ابتدا مجنوں گورکھپوری نے کی تھی اور کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے وہ مرحلہ طے نہ ہوسکا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''...... میرے اس ضخیم مجموعہ کی کتابت شروع ہو چکی تھی اور ڈیڑھ سو صفحات لکھے جاچکے تھے کہ وہ بے درد و سفاک قوت جس کو عرف عام میں 'آب ودانہ' کہتے ہیں خلاف توقع مجھے کشاں کشاں کر کے علی گڑھ لے آئی اور اس طرح میں اپنے ارادوں کو ارادہ کے ساتھ ملتوی بھی نہ کرسکا۔ اس کی مہلت بھی نہ ملی کہ 'ایوان' اور 'ایوان اشاعت' کے التوا کا اعلان کرسکتا۔ چنانچہ اکثر احباب کو اس کی مطلق خبر نہیں۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے[3]

درج بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ایوان اشاعت' جہاں سے ان کے پہلے دو مجموعے اشاعت پذیر ہوئے وہ مجنوں گورکھپوری کا ہی ادارہ تھا۔ ساتھ ہی مجنوں اس ادارے سے 'ایوان' رسالہ بھی شائع کرتے تھے جس کے مدیر وہ خود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اشاعت کے التوا کا اعلان نہ کرنے کا قلق تھا۔ رزق کے لیے گورکھپور چھوڑنا ان کے لیے تکلیف دہ عمل تھا۔ وہ اپنے وطن سے حد درجہ محبت کرتے تھے۔ اس لیے وہ گورکھپور واپس جانے کے خواہش مند بھی رہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...... مجھے گورکھپور چھوڑنا پڑا اور گورکھپور سے الگ ہو کر میں کوئی ایسی سنجیدہ زندگی بسر نہیں کرسکتا جس کو شعر و ادب کی زندگی کہتے ہیں اور جس کو ایک نقاد شعر ایک 'لطیف دیوانگی' بتاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا یہ ادبی جمود ہمیشہ قائم رہے گا اس لیے کہ گورکھپور واپس جانے کی آرزو میرے اندر اسی قدر موجود ہے جس قدر کہ ہارڈی کے مشہور ناول "The Return of the Native" کے ہیرو Clym اور خود میرے افسانے 'بازگشت' کے ہیرو ادریس کے اندر موجود تھی اور بہت ممکن ہے کہ میں ان ہی دونوں کی طرح پھر گورکھپور واپس جاؤں، چاہے وہ مٹ جانے کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن فی الحال تو میں گورکھپور میں نہیں ہوں اور 'ایوان' اور 'ایوان اشاعت' کا کاروبار بند ہے۔''[4]

مجنوں گورکھپوری کی افسانہ نگاری کی جانب مائل ہونے کی وجہ بھی دلچسپ ہے۔ دراصل نیاز فتحپوری کا ایک افسانہ 'شہاب کی سرگزشت' رسالہ نگار میں قسط وار شائع ہو رہا تھا۔ مہدی افادی کی صاحب زادی جمیلہ بیگم کو یہ افسانہ حد درجہ پسند تھا لیکن مجنوں گورکھپوری کو افسانے میں کوئی افادیت کا پہلو نظر نہیں آیا اس لیے ان کی رائے اس افسانے کے متعلق اچھی نہیں تھی۔ ایک ملاقات میں 'شہاب کی سرگزشت' پر گفتگو شروع ہوئی تو مجنوں گورکھپوری نے اپنی رائے کا اظہار جمیلہ بیگم کے سامنے بھی کر دیا۔ ردعمل میں جمیلہ بیگم نے طنزاً کہا کہ 'یہ سب تو نہ لکھ سکنے کی تاویلیں ہیں، میں جب جانوں کہ جب آپ بھی کوئی ایسا ہی بے نتیجہ افسانہ لکھ دیں۔' نتیجتاً مجنوں گورکھپوری نے اسی رات اپنا پہلا افسانہ 'زیدی کا حشر' کا کچھ حصہ لکھ ڈالا اور اگلے روز جمیلہ بیگم کے سامنے پیش کر دیا۔ ان ہی دنوں نیاز فتح پوری گورکھپور تشریف لائے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجنوں گورکھپوری کا ادھورا افسانہ پڑھا تو ان سے افسانہ مکمل کرنے کی درخواست کی اور مسودہ اپنے ساتھ کانپور لے آئے جسے انھوں نے رسالہ 'نگار' میں بالاقساط شائع کیا۔[5]

مجنوں گورکھپوری کا یہ پہلا افسانہ تھا۔ اس کے بعد انھوں نے نیاز فتح پوری کی تحریک پر بہت سے افسانے قلم بند کیے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''...... میں نے اول اول اپنی زندگی کا نصب العین کچھ اور بنایا تھا، لیکن انسان اپنی قسمت سے مجبور ہے۔ نیاز صاحب نے تحریک کی اور میں نے افسانہ نگاری شروع کر دی اور آج صرف افسانہ نگار مشہور ہوں۔''[6]

مجنوں گورکھپوری کے افسانوں میں مغربی افسانوں

مجنوں گورکھپوری کے افسانوں میں مغربی افسانوں کی جھلک بہت ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے مغربی افسانوں کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ ان کے ایسے افسانوں کی تعداد بھی زیادہ ہے جو کسی نہ کسی سطح پر مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ اس کا اعتراف مجنوں گورکھپوری بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ ان کے ایسے تمام افسانے مغربی افسانوں کا ترجمہ ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ 'جشن عروسی' بائرن کے افسانے "The Bride of Abydos" کا آزاد ترجمہ ہے۔

کی جھلک بہت ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے مغربی افسانوں کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ ان کے ایسے افسانوں کی تعداد بھی زیادہ ہے جو کسی نہ کسی سطح پر مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ اس کا اعتراف مجنوں گورکھپوری بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کے ایسے تمام افسانے مغربی افسانوں کا ترجمہ ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ 'جشن عروسی' بائرن کے افسانے "The Bride of Abydos" کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر افسانوں کے متعلق خود مجنوں گورکھپوری نے 'شان نزول' میں تحریر کیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی سطح پر مغربی افسانوں کے اثرات لیے ہوئے ہیں اور اگر ان کا کوئی افسانہ طبع زاد بھی ہے تو اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''......دعوے کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں میرے مطالعے کی کوئی آمیزش نہیں ہے۔''[7]

'شان نزول' میں مجنوں گورکھپوری نے 'مجنوں کے افسانے' میں شامل تمام افسانوں پر تھوڑی تھوڑی خامہ فرسائی بھی کی ہے۔ اس کتاب میں شامل افسانوں میں تین کے علاوہ دیگر افسانے 1929 سے پہلے قلم بند کیے گئے تھے۔ دراصل 1929 کے بعد مجنوں گورکھپوری نے افسانے لکھنے کم کر دیے تھے۔ انھوں نے اس کی کوئی خاص وجہ تو نہیں بیان کی ہے، بس ایسا لگتا ہے جیسے ان کا جی افسانہ خلق کرنے پر مائل نہ ہوا اور اپنا آپ ظاہر کرنے کے لیے کسی دوسری صنف کی تلاش میں بھٹک رہا ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس مجموعے میں جتنے افسانے شامل ہیں ان میں سے تین کو چھوڑ کر باقی سب 1929 سے پہلے کے لکھے ہوئے ہیں اور ایسے زمانے کی یادگار ہیں جب کہ میرا ادبی نشہ عروج پر تھا، جب کہ میرے قویٰ میں اضمحلال کی کوئی علامت نمودار نہیں ہوئی تھی جو 1929 کے بعد دھیرے دھیرے مجھ پر چھاتا گیا۔ اب میں اپنے اندر وہ کیف و نشاط نہیں پاتا جس کو اب سے چند سال پیشتر میں اپنی دولت لازوال سمجھ رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب جو کام کرتا ہوں اس میں ایک قسم کی بے دلی اور بے حوصلگی پائی جاتی ہے۔ میرے بعض پڑھنے والوں کو مجھ سے شکایت ہے جو ایک لحاظ سے بجا ہے۔ یعنی اب میرے افسانے اتنے ولولہ خیز اور ذوق انگیز نہیں ہوتے جتنا کہ پہلے ہوتے تھے۔ یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہے کہ اب میں جو کچھ لکھتا ہوں اس میں وہ پختگی جس قدر بھی ہو، جو محض عمر اور مشق کے تجربہ سے پیدا ہوجاتی ہے لیکن اس 'حسن خیال' اور اس شوخی تحریر کا دور تک پتہ نہیں جو صرف جوانی کی روحانیت

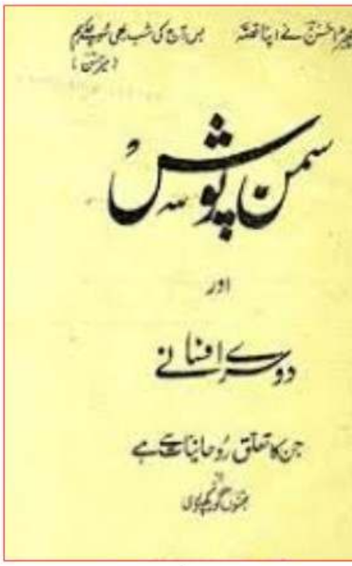

اور شوریدہ سری کا تقاضا ہوا کرتی ہے۔ یہ انحطاط بھی ہے اور ارتقا بھی۔''[8]

طبیعت میں تبدیلی کا واقع ہونا فطری بات ہے۔ عموماً قلم رکھنے کے بعد جب طبیعت پھر سے بحال ہوتی ہے تو مصنف اسی ادب پارے یا فن پارے میں لوٹنا چاہتا ہے جس میں وہ طبع آزمائی کرتا رہا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے جب تک افسانہ نگاری کو اپنا بنائے رکھا تب تک انھوں نے خوب افسانے لکھے لیکن پانچ سال کے اندر ہی اس صنف سے ان کی دلی وابستگی برقرار نہیں رہی۔ ویسے بھی وہ ابتداً افسانہ نگار نہیں بننا چاہتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا ذہن دھیرے دھیرے اس صنف سے دوری بناتا گیا اور آخر کار انھوں نے افسانہ نگاری کو چھوڑ کر تنقید کو اپنا میدان خاص بنالیا۔ شاید ان کی طبیعت کے لیے تنقید کا میدان ہی موزوں تھا۔ فراق گورکھپوری اور ان کے بعض دیگر دوستوں نے بھی انھیں تنقید کو ہی اولیت دینے کا مشورہ دیا۔ طبیعت کی موزونیت اور دوستوں کے مشورے ہی تھے کہ آج ہم مجنوں گورکھپوری کو بطور افسانہ نگار نہیں بلکہ ایک نقاد کی صورت میں جانتے اور پہچانتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''گذشتہ چند سال سے میں تنقیدیں زیادہ لکھ رہا ہوں اور افسانہ نگاری کی طرف میلان کم رہا ہے، یہ کوئی اضطراری حرکت نہیں تھی بلکہ اس کے مختلف اسباب تھے جس کی تفصیل وتشریح بے کار ہی ثابت ہوگی۔ اس ذکر کو چھیڑنے سے میرا ایک خاص مقصد تھا۔ میرے بعض احباب نے جن میں بابو رگھوپتی سہائے کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے حال میں میرے متعلق اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تنقید ہی میرا غیر فانی ادبی کارنامہ ہے......ان لوگوں کی رائے میں جو چیز میرا نام زندہ رکھے گی وہ تنقید ہی ہوگی۔''[9]

انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ ان ہی چیزوں کے مشورے دیتا ہے جس میں اسے امکانات نظر آتے ہیں۔ فراق اور دیگر احباب کے مشورے اپنی جگہ لیکن بہت سے احباب ایسے بھی تھے جنھوں نے مجنوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ افسانے کے علاوہ کچھ نہ لکھیں۔ دوستوں کے ان دو گروہوں کے درمیان کون صحیح ہے اور کون غلط، مجنوں گورکھپوری نے اس کا فیصلہ نہیں کیا ہے اور انھیں کرنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ لیکن انھوں نے افسانہ نگاری اور تنقید نگاری کے ضمن میں ایک اہم بات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ دونوں کے مابین افسانہ نگاری کو بہتر خیال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اگر چہ افسانہ لکھنا میری زندگی کا اولین مقصد نہیں تھا، تاہم مجھے اس قدر تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ جب میں تنقیدیں لکھتا ہوں تو ان کی تمام تر بنیاد مطالعہ اور فکر وتخیل پر ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے جب افسانے لکھتا ہوں تو ان میں میرے مطالعے اور مشاہدے دونوں آجاتے ہیں اور تجربات و تخیلات مل کر ایک تخیلی کل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یعنی میرے افسانوں میں ادب اور زندگی دونوں عناصر شامل ہوتے ہیں، جس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ میرے افسانے میری زیادہ مکمل نمائندگی کرتے ہیں۔''[10]

ماخذ:

1۔ مجنوں گورکھپوری، شان نزول، مجنوں کے افسانے، عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی، 2014، ص ج
2۔ ایضاً، ص ب
3۔ ایضاً، ص ب، ج
4۔ ایضاً، ص ج
5۔ شاہین فردوس، مجنوں گورکھپوری: حیات اور ادبی کارنامے، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 2001، ص 96
6۔ مجنوں گورکھپوری، شان نزول، مجنوں کے افسانے، عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی، 2014، ص د
7۔ ایضاً، ص ذ
8۔ ایضاً، ص د، ہ
9۔ ایضاً، ص ذ
10۔ ایضاً، ص ح

Dr. Saqib Imran
Guest Teacher, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

اردو زبان و ادب اور رابندر ناتھ ٹیگور

عبدالرزاق زیادی

زمانہ خواہ کوئی بھی ہو، ہر ایک عہد میں کچھ ایسی شخصیات ضرور جنم لیتی ہیں جو اپنے کارناموں کی بدولت ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتی ہیں۔ زمانہ ماضی میں اس طرح کی کئی مثالیں مل جائیں گی جو کل بھی زندہ تھیں آج بھی ہیں اور کل بھی رہیں گی۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ شخصیات تھیں جنھوں نے اپنی تخلیقات سے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ آنے والے ادوار پر بھی اپنے گہرے نقوش ثبت کیے۔ اردو کے ادبی افق پر بھی اس نوع کی شخصیات بڑی تعداد میں ہیں اور ان میں امیر خسرو، ولی، میر، غالب اور اقبال وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اگر عالمی ادب پر نظر ڈالی جائے تو مشرق کی شعری روایت سے تعلق رکھنے والے شعرا و ادبا میں جو بڑے نام ابھر کر سامنے آئیں گے ان میں ایک نام رابندر ناتھ ٹیگور کا بھی ہوگا۔ ٹیگور کا شمار بیسویں صدی کے نابغہ میں ہوتا ہے اور انھوں نے بھی اپنی تخلیقات اور علمی و ادبی کارناموں کی بدولت اپنے عہد کے ساتھ ساتھ آنے والے ادوار کو بھی متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور فکر و فن کے حوالے سے اب تک ان پر جتنا اور جو کچھ بھی لکھا جا چکا ہے اتنا شاید ہی کسی اور ہندوستانی ادیب و فنکار پر لکھا گیا ہو۔

رابندر ناتھ ٹیگور 7 مئی 1861 کو کلکتے میں پیدا ہوئے اور علم و ادب کا ایک بیش بہا سرمایہ چھوڑ کر 7 اگست 1941 کو وفات پا گئے۔ ہر بڑے فنکار کی طرح ان کی تخلیقات کا بھی دائرہ بہت وسیع ہے۔ شاعری، گیت، کہانیاں، مصوری اور موسیقی کے علاوہ تعلیم و فلسفہ اور سیاسیات میں بھی ان کی بہت سی یادگاریں ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی بنیادی شناخت اگرچہ ایک بنگلہ ادیب و شاعر کی ہے اور ان کے زیادہ تر علمی و ادبی کارنامے اسی زبان میں ہیں مگر اس کے ساتھ ہی انھیں انگریزی زبان پر بھی مہارت حاصل تھی۔ ان کی انگریزی دانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی بیشتر تخلیقات کا ترجمہ خود بنگلہ زبان سے انگریزی میں کیا اور اپنے پیغام کو پوری دنیا میں عام کیا۔ 1910 میں ان کی شہرہ آفاق تصنیف 'گیتا نجلی' شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت سے قبل ٹیگور کی پہچان اگرچہ ایک خاص علاقے اور زبان تک محدود تھی مگر جب 1912 میں اس کا ترجمہ The Song Offering کے نام سے ہوا اور 1913 میں انھیں گراں قدر انعام نوبل سے نوازا گیا تو راتوں رات ان کی شہرت و مقبولیت بلندیوں پر پہنچ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے گیتا نجلی کے علاوہ ان کی دیگر تخلیقات کے بھی ترجمے دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو گئے۔ آج تو صورت حال یہ ہے کہ پوری دنیا میں کم ہی ایسی زندہ زبانیں ہوں گی جن میں ٹیگور کی تخلیقات ترجمے کی شکل میں موجود نہ ہوں یا پھر خود ان پر کتابیں اور مقالات و مضامین دستیاب نہ ہوں۔

دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی ٹیگور کی تخلیقات کے متعدد ترجمے ہوئے۔ نیاز فتح پوری کے عرض نغمہ سے لے کر اب تک ان کی بیشتر نظموں، گیتوں، ناولوں، افسانوں، ڈراموں اور مقالات و مضامین کے ترجمے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے مترجمین میں نیاز فتح پوری (عرض نغمہ)، حامد حسن قادری (باغبان)، فراق گورکھپوری (ایک سو ایک نظمیں)، عبد العزیز خالد (گل نغمہ)، ایم۔ ضیاء الدین (کلام ٹیگور) کے ساتھ ساتھ عہد حاضر میں سہیل احمد فاروقی (گیتا نجلی)، ایم علی (گورا) فہیم انور (میری یادیں) وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہی وہ ترجمے ہیں جن کی وساطت سے عام

طور پر ٹیگور کی تحریروں کا رشتہ اردو ادب سے استوار کیا جاتا ہے اور آج اردو میں ٹیگور کے فکر وفن کے حوالے سے جتنی بھی تحریریں دیکھنے کو ملتی ہیں ان میں سے بیشتر انھیں تراجم سے مستفاد ہیں۔ اردو زبان میں ٹیگور پر لکھنے والوں میں کم ہی ایسے ادبا، ومترجمین ہوں گے جنھوں نے براہ راست بنگلہ زبان میں ٹیگور کی تخلیقات کا مطالعہ ہو۔ لیکن باوجود اس کے ان تراجم کی اہمیت وافادیت مسلم ہے۔ انھیں کی دین ہے کہ آج ہم ٹیگور سے روشناس ہو سکے۔

بہر حال جب ہم ان ترجموں کی مدد سے ٹیگور کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں ہمیں ایک خاص قسم کا رنگ و آہنگ اور جذباتیت کا احساس ہوتا ہے۔ بقول فراق گورکھپوری کہ 'ان کی ہر نظم میں ہندوستان کی سرزمین اور ہندوستان کے قالب کو ہم سانس لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ہندوستان کی مٹی بول اٹھتی ہے۔ ان کی نظموں میں ہندوستان کے کھیتوں کی لہلہاہٹ ہے۔ یہاں کے دریاؤں کا ساز روانی ہے۔ یہاں کے شبستان کی کھنک ہے۔ یہاں کے موسموں کے جلوے ہیں۔ یہاں کے دن اور رات کی آئینہ داری ہے'[1]۔ شاید ٹیگور کی یہی وہ تخلیقیت اور کمال فن ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک ایسی کشش، اپنائیت اور انفرادیت پیدا ہوگئی ہے جس کی مثال دوسرے شعرا کے یہاں شاید ہی نظر آتی ہو اور ان کی شاعری طبع زاد نہ ہو کر کے بھی طبع زاد معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی جتنی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ان تمام نے اس سے اثرات قبول کیے۔ مخدوم محی الدین ٹیگور کے کلام کی اثر انگیزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رابندر ناتھ ٹیگور کی تحریرات نے دنیا کی اکثر زبانوں پر اثرات ڈالے ہیں۔ ہر جگہ ان کے پرستار اور قدر دان موجود ہیں۔ لوگ ان کے کلام کو بڑے شوق سے پڑھتے اور سر آنکھوں پر رکھتے ہیں، پھر اردو جو بنگالی کی ہم سایہ زبان ہے کیسے اس اثر سے بچ سکتی تھی، چنانچہ اردو پر بھی ٹیگور کا اثر ہوا۔ نیاز فتح پوری اردو کے پہلے انشا پرداز ہیں جنھوں نے ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ گیتانجلی کا اردو ترجمہ کر کے ٹیگور کو اردو سے متعارف کرایا۔ گیتانجلی کا ترجمہ ہونا ہی تھا کہ ان کا دوسرا کلام بھی سرعت کے ساتھ اردو میں منتقل ہوتا گیا۔ نظموں، افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے اردو رسالوں میں شائع ہوتے گئے، اب بھی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کوئی رسالہ ان کے ذکر سے خالی نہیں رہتا۔ اس بے پناہ ترجمہ کا نتیجہ تھا کہ اردو میں ایسے نوجوان انشا پردازوں اور شاعروں کا گروہ پیدا ہوا جس نے ٹیگور کے رنگ میں لکھنا شروع کیا۔''[2]

ٹیگور سے اثرات قبول کرنے والے اردو کے ادبا وشعرا میں پریم چند، جوش ملیح آبادی، پنڈت بدری ناتھ، سدرشن، اعظم کریوی، دیوندر ستیارتھی، مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، اور نیاز فتح پوری وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے باقاعدہ طور پر ٹیگور کی تخلیقات کو پڑھا، سمجھا اور اپنے اپنے طور پر انھیں اپنے تخلیقی فن پاروں میں برتا بھی۔ یہ سلسلہ قائم ودائم ہے۔ عصر حاضر میں انور قمر نے 'کابلی والا' کے کردار کی توسیع کرتے ہوئے 'کابلی والا کی واپسی' کے عنوان سے افسانہ لکھا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ اور بھی دیگر ایسے شعرا وادبا، ہیں جو ٹیگور کے سرچشمہ فکر وفن سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے گلشن شعر وادب کو سیراب کر رہے ہیں۔

اس طرح اردو ادب پر ٹیگور کے کئی اعتبار سے اثرات مرتب ہوئے اور اس کی وجہ شاید ان کی تخلیقیت اور اثر انگیزی ہی تھی۔ مگر اردو زبان وادب پر ٹیگور کے اس حد تک اثرات مرتب ہونے کی وجہ سے ہمارے ذہن میں ضروری طور پر کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ کیا اثر پذیری کا یہ عمل صرف اردو زبان وادب کے ساتھ ہی خاص تھا؟ کیا صرف اردو کے ادبا، وشعرا ہی نے ٹیگور سے اثرات قبول کیے تھے؟ یا پھر اثر پذیری کی مثالیں ہمیں خود ٹیگور کے یہاں بھی اسی طرح دیکھنے کو ملتی ہیں جس طرح کہ ہمارے شعرا وفکشن نگاروں کے یہاں موجود ہیں؟ کیونکہ عام طور پر جب دو قومیں یا دو لوگ آپس میں ملتے ہیں تو دانستہ و نادانستہ طور پر دونوں ہی ایک دوسرے سے اثرات قبول کرتے ہیں اور ادب میں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہمارا ادبی سرمایہ اس نوع کے اثر وتاثیر کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ چنانچہ جب ہم ان سوالوں کا جواب تلاش کرتے ہیں تو بادی النظر میں ان کا جواب نفی میں ہی ملتا ہے۔ کیونکہ ٹیگور اردو زبان وادب سے ناواقف تھے۔ مگر جب ہم مزید غور وفکر سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اثر پذیری کا عمل خود ٹیگور کے یہاں بھی موجود تھا اور انھوں نے بھی عالمی ادب کے ساتھ ساتھ خود اردو زبان وادب سے اثرات قبول کیے تھے۔ چونکہ ٹیگور جس زبان میں ادب تخلیق کر رہے تھے اس کی ادبی بے بضاعتی کا احساس انھیں اسی وقت ہو گیا تھا جب کہ ابھی انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا سفر بہت زیادہ طے بھی نہیں کیا تھا۔ بقول شمیم طارق کہ:

''ٹیگور کی عمر جب 30 سال تھی اسی وقت ان کو احساس ہو گیا تھا کہ بنگلہ زبان میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے، قارئین اس سے متاثر نہیں ہوتے کیونکہ نہ تو آدرش اور اعلیٰ خیالات وموضوعات کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی دوسری ہندوستانی زبانوں سے زیادہ ہے اس لیے ٹیگور کا اردو تخلیقات اور اردو ادب میں پیدا ہونے والے نئے رجحانات کی طرف متوجہ ہونا یا کم از کم ان سے باخبر ہونا باعث حیرت نہیں ہے''۔[3]

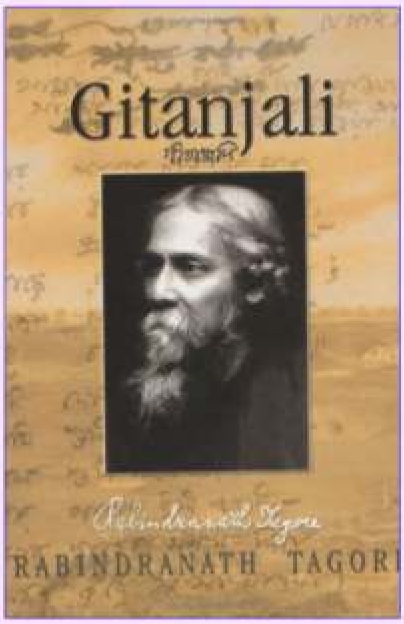

شمیم طارق کے اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگرچہ ٹیگور اردو زبان وادب سے براہ راست واقف نہیں تھے مگر باوجود اس کے انھوں نے اس سے اثرات قبول کیے تھے۔ کیونکہ موضوعات وخیالات کی سطح پر بنگلہ زبان وادب کی جو صورت حال تھی اس سے وہ واقف تھے اور دیگر ہندوستانی زبانوں اور بالخصوص اردو زبان وادب سے اثرات قبول کیے بغیر اس طرح کے افکار وخیالات کو پیش کرنا ناممکن سا تھا جیسا کہ انھوں نے بنگلہ زبان میں پیش کیے ہیں۔

اس کے علاوہ جب ہم ٹیگور کے عہد کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور بڑے پیمانے پر تغیرات و تبدلات کا دور تھا اور اس میں سیاسی وسماجی معاملات و مسائل کے ساتھ ساتھ علم وادب میں بھی عالمی سطح پر تبدیلیاں اور تجربات ہو رہے تھے اور دیگر ادبا، وشعرا کی طرح ٹیگور کا بھی ان سے محفوظ رہ پانا ناممکن تھا۔ چنانچہ عہد ٹیگور میں ہو رہی تبدیلیوں اور اس کے اثرات پر اظہار خیال کرتے ہوئے شمیم طارق اپنے ایک مضمون ''ٹیگور کی فکر وآگہی'' میں لکھتے ہیں:

''ٹیگور جب 1861 میں پیدا ہوئے اس وقت سر سید (1817-1898) سائنسی فکر کی آبیاری کرنے کے

ساتھ روشن خیالی کو نئی تعبیر عطا کر رہے تھے۔ غالب (1797-1869) کلکتہ میں فرنگی تہذیب اور فرنگی ایجادات کو خراجِ تحسین پیش کر کے دلی واپس آچکے تھے اور طبیعت کی تمام افسردگی کے باوجود اردو نثر کو شگفتگی عطا کر رہے تھے۔ حالی (1837-1914) 24 برس کے تھے اور مسدس (1879)، حیاتِ سعدی (1886) مقدمہ شعر و شاعری (1983) یادگارِ غالب (1893)، حیاتِ جاوید (1901) جیسی اہم علمی تنقیدی، تحقیقی اور سوانحی کتابوں کی تمہید تیار ہو رہی تھی۔ مراۃ العروس (1869)، بنات النعش (1873) توبۃ النصوح (1877) اور ابن الوقت (1888) جیسے اصلاحی ناول لکھنے بلکہ اردو میں ناول نگاری کی بنیاد ڈالنے والے ڈپٹی نذیر احمد (1836-1912) اور ادبی تذکرے کی روایت مستحکم کرنے کے ساتھ ادبی تنقید کی مضبوط بنیاد استوار کرنے والے 'آبِ حیات' کے مصنف محمد حسین آزاد (1830-1910) عمر کے 25 اور 31 سال مکمل کر چکے تھے۔ منشی پریم چند نے ٹیگور کو متاثر کرنے کے بجائے ان سے متاثر ہونے اور کہانی لکھنے کی تحریک پانے کا اعتراف کیا ہے مگر جب وہ پیدا ہوئے (1880) تب تک ڈپٹی نذیر احمد کے تین ناول شائع ہو چکے تھے۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی (1864-1921) بھی سنِ شعور کو پہنچ رہے تھے۔ مسلمانوں کے اقبالِ گزشتہ کے حوالے سے اردو شاعری کو آفاقی اور اجتماعی شعور بخشنے والے اقبال (1873-1938) کو پیدا ہونے میں ابھی 12 یا 16 سال باقی تھے مگر اپنی علمی تحریروں اور قومی نظموں کے ذریعے اقبال کی شاعری اولین نمونہ پیش کرنے اور 'شعر العجم' لکھ کر فارسی اور اردو شعریات کے رشتے کو مستحکم کرنے والے علامہ شبلی (1857-1914) پیدا ہو چکے تھے یعنی جب ٹیگور پیدا ہوئے اس وقت اردو نظم و نثر نئے موضوعات کے ساتھ نئے پیرایہ بیان اور نئے تخلیقی تجربوں سے بھی گزر رہی تھی اور اس تبدیلی کے اثرات ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب پر بھی مرتب ہو رہے تھے اس لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ اردو ادب میں پیدا ہونے والے نئے رجحانات، مسائل و مباحث اور تخلیقی سطح پر کیے جانے والے تجربوں سے ٹیگور واقف نہ رہے ہوں۔''[4]

ٹیگور اردو زبان و ادب میں ہو رہی تبدیلیوں اور رجحانات و میلانات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے شعرا و ادبا کی تحریریں بھی ان کے مطالعے میں تھیں۔ چونکہ اس وقت تک ترجمے کی روایت کافی عام ہو چکی تھی اور مغربی ادبیات کے ساتھ ساتھ خود ہندوستان میں ہو رہی تخلیقات کے ترجمے بھی بڑی تعداد میں سامنے آ رہے تھے۔ اس لیے ان ترجموں کے توسط سے اردو شعرا و ادبا کی تخلیقات بھی ٹیگور کے مطالعے میں آچکی تھیں۔ نیز وہ فارسی کی شعری روایت

> **ٹیگور**
> اردو زبان و ادب میں ہو رہی تبدیلیوں اور رجحانات و میلانات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے شعرا وادبا. کی تحریریں بھی ان کے مطالعے میں تھیں. چونکہ اس وقت تک ترجمے کی روایت کافی عام ہو چکی تھی اور مغربی ادبیات کے ساتھ ساتھ خود ہندوستان میں ہورہی تخلیقات کے ترجمے بھی بڑی تعداد میں سامنے آرہے تھے. اس لیے ان ترجموں کے توسط سے اردوشعرا و ادبا. کی تخلیقات بھی ٹیگور کے مطالعے میں آچکی تھیں.

سے بھی نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ حافظ، رومی، اور شیرازی کے افکار کی گونج ان کے کانوں میں بچپن سے ہی سنائی دے رہی تھی۔ اس کا اعتراف ہمیں خود ٹیگور کے یہاں ملتا ہے جو انھوں نے جوش ملیح آبادی سے ایک ملاقات کے دوران کیا تھا۔ جوش ملیح آبادی اپنی اس ملاقات کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غلغلہ سنا کہ ٹیگور آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنے گیا۔ انھوں نے مجھ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے کے بعد انگریزی میں پوچھا: ''کیا یہ بات سچ ہے کہ میں ایک نوجوان شاعر کے چہرے کو دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے سر جھکا کر انگریزی میں جواب دیا: ''شاید''۔ انھوں نے میرا نام پوچھا۔ جب میں نے اپنا تخلص بتایا۔ انھوں نے میرا ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور کہا یہ عجیب اتفاق ہے کہ کل ہی سروجنی نائیڈو نے آپ کی ایک نظم ''طلوعِ سحر'' کا ترجمہ سنایا تھا اور آج آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ کی نظم لاجواب ہے اور اس کے سننے کے بعد میں آپ کو فرزند سحر گاہ کہہ سکتا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ میرے باپ فارسی کے بڑے اسکالر تھے اور دیوانِ حافظ ان کے سرہانے رکھا رہتا تھا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو انھوں نے کہا کیا یہ ممکن ہے کہ آپ شانتی نکیتن آ کر کچھ روز کے لیے میرے ساتھ رہیں اور حافظ کی اسپرٹ سے مجھ کو بخوبی آگاہ کریں؟ میں نے بڑی خوشی کے ساتھ ان کی دعوت قبول کر لی اور جگنو خدمت گار کو لے کر وہاں پہنچ گیا اور مطالعے کے لیے بہت سی کتابیں بھی ساتھ لے لیں۔''[5]

مذکورہ بالا اقتباس میں اگرچہ جوش کی خودستائی نمایاں ہے مگر اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیگور بچپن سے ہی فارسی کی شعری روایت سے آشنا تھے۔ نیز تراجم کی مدد سے وہ اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ اردو میں اس وقت کس قسم کا ادب تخلیق ہو رہا تھا۔

غرض یہ کہ جس طرح ٹیگور کی تحریروں کا اثر اردو ادب پر پڑا مختلف شعرا و ادبا نے ان سے اثرات قبول کیے اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر اردو میں بھی مختلف نظمیں اور کہانیاں لکھیں ٹھیک اسی طرح خود ٹیگور بھی بالواسطہ ہی سہی مگر اردو زبان و ادب اور اس کی شعری روایت سے بخوبی واقف تھے اور انھوں نے بھی اپنے عہد کے دیگر فنکاروں کی طرح نہ صرف فکری و فنی سطح پر دیگر زبانوں اور بالخصوص اردو زبان و ادب سے اثرات قبول کیے تھے بلکہ ان کو اپنے تجربات کا حصہ بھی بنایا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو بنگلہ زبان کی بے بضاعتی کے باوجود شاید ٹیگور اس طرح کے عظیم اور غیر معمولی تخلیقی کارنامے پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے جس طرح کہ انھوں نے پیش کیے اور جن کی بدولت انھیں دنیا کا معزز ترین انعام نوبیل سے نوازا گیا۔

حواشی:

(1) رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری پر طائرانہ نظر، فراق گورکھپوری، بحوالہ ٹیگور کی بازیافت، شہزاد انجم (مرتب) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص 51

(2) اردو ادب پر ٹیگور کے اثرات، مخدوم محی الدین، بحوالہ رابندر ناتھ ٹیگور: فکر و فن، شہزاد انجم (مرتب) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ص 545

(3) ٹیگور کی فکر و آگہی، شمیم طارق، مشمولہ ٹیگور کی بازیافت، شہزاد انجم (مرتب) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص 95

(4) ایضاً، ص 94

(5) یادوں کی بارات، جوش ملیح آبادی، ص 197-202

■

Abdur Razzaque Zeyadi
Research Scholar, Dept of Urdu
JNU, New Delhi - 110067
Mob.:9911589715

ملیالم اور اردو

ریاض احمد

ملیالم اور اردو میں کوئی لسانی رشتہ نہیں ہے۔ دونوں زبانوں کے خاندان الگ ہیں۔ ملیالم ڈراویڈی خاندان کی زبان ہے اور اسی خاندان سے تعلق رکھنے والی دیگر زبانوں جیسے تمل، کنڑ، تلگو کی طرح جنوبی ہند کی ایک ریاست کیرلہ تک محدود ہے، اسی ریاست میں بولی، سمجھی اور برتی جاتی ہے۔ جبکہ اردو کا تعلق آریائی خاندان سے ہے، جو ہندی عربی، فارسی، کھڑی بولی، پنجابی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کا حسین وجمیل مجموعہ ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوکر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ایک زندہ زبان ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اردو اور ملیالم میں لسانی سطح پر کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے باوجود ملیالم اور اردو دانوں کے آپسی اختلاط اور لین دین کی بنا پر بہت سارے اردو کے الفاظ ملیالم زبان میں داخل ہوکر عام و خاص کی زبان پر جاری ہوگئے ہیں۔

بعض اردو دانوں کا خیال ہے کہ اردو زبان کیرلہ کی سرزمین میں پیدا ہوئی اور دیگر مقامات میں پھیل گئی۔ مشہور تاریخ داں اور نقاد 'دکن میں اردو' کے مصنف نصیرالدین ہاشمی بھی پہلے یہی رائے رکھتے تھے لیکن آگے چل کر انھوں نے اپنی رائے بدل لی۔ ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب 'دکن میں اردو' میں اردو کی ابتدا سے متعلق مختلف نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں چار نظریات پائے جاتے ہیں:

(1) اردو زبان کی شروعات پنجاب سے ہوئی

(2) اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی

(3) اس کی ابتدا دکن سے ہوئی

(4) اس کی ابتدا دوآبہ گنگا جمنا سے ہوئی ہے۔

ان آرا کے ذکر کے بعد کہتے ہیں کہ یہ امر یقینی ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے ان کے خیال میں جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو کی ابتدا سندھ یا دکن سے ہوئی۔ ان کے دعوے کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سب سے پہلے مسلمانوں کی آمد انہی مقامات پر ہوئی۔ نصیرالدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

''سندھ میں اسلامی حکومت کا آغاز 712 سے ہوچکا تھا۔ مسلمان صدیوں تک یہاں حکومت کرتے رہے۔ حکومت کی رواداری اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے عام طور سے ملنے جلنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہمی تبادلۂ خیالات کے مواقع پیدا ہوگئے۔ ان حالات کے پیش نظر اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ہندو اور مسلمانوں

موجودہ دور میں انگریزی زبان کی بڑھتی مقبولیت نے ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح ملیالم کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے۔ چنانچہ انگریزی کے الفاظ کا چلن ملیالم میں بھی بڑھ چکا ہے۔ اس کے باوجود انگریزی سے قبل ہی اردو کے بہت سے الفاظ ملیالم میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ زبانوں کا نیچر مختلف ہونے کی وجہ سے اس کے تلفظ میں کچھ فرق آگیا ہے لیکن یہ الفاظ اسی معنی میں آج بھی ملیالم میں استعمال ہوتے ہیں۔

کے امتزاج سے جو زبان بنی، اس کا آغاز اسی مقام سے ہوا تو غلط نہیں ہوسکتا۔ لیکن جو تحقیقات ہوئی ہیں، اس کے لحاظ سے یہ صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ ان فاتحوں کی اصلی زبان عربی تھی۔ اس لحاظ سے جو زبان عالم وجود میں آئی وہ عربی اور شورسینی سے مشترک ہوتی لیکن چونکہ اس میں فارسی کا حصہ زیادہ ہے اس لیے ہم یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اردو کی ابتدا سندھ سے نہیں ہوئی۔ سندھ کے بعد مسلمانوں کی آمد سواحل مالابار اور کرناٹک پر ہوئی۔ شیوخ عرب اور سرداران آل ہاشم تجارت اور تبلیغ دین کی دھن میں صدہا میل سے سمندر کی راہ طے کرکے پرامن طریقے سے سواحل ہند پر پہنچے اور اپنی کوششوں سے سواحل کے ہندوؤں میں اثر ورسوخ حاصل کرلیا۔ اپنی ملنساری اور نیک مزاجی کی بدولت انھوں نے دلوں میں گھر کرلیا۔ وہ سواحل سے گزر کر اندرون ملک تک پہنچ گئے۔"

(دکن میں اردو،ص 33)

اس رائے کو اس سے قبل اور بعد کے کسی محقق یا نقاد نے نہیں مانا۔ یہ رائے غلط فہمی کی بدولت پیدا ہوئی ہے کیونکہ اردو بولنے والی قوم جنوبی ہند میں زمین کی راہ سے آئی، بسی اور زبان کو فروغ ملا۔ سمندر کی راہ صرف عرب لوگ جانتے تھے جو زمانۂ جاہلیت سے آتے جاتے رہے۔ صدیوں کے بعد یعنی قریب تین سو سال قبل سے کچھی میمن لوگ سمندر کے راستے سواحل مالابار آنے لگے، جن کی زبان اردو ہے۔ اس سے قبل کوئی اردو داں سمندری راستے سے واقف نہیں تھا۔ اس وجہ سے مصنف کی رائے سے کسی نے اتفاق نہیں کیا۔

شمال سے جنوبی علاقے میں بہمنی سلطنت کے سلاطین کی آمد اور قیام سلطنت کی وجہ سے جنوبی ہند میں دکنی زبان میں بول چال شروع ہوئی۔ کیرل کی سرزمین پر سلطان حیدر علی اور ان کے فرزند ٹیپو سلطان کے فوجی حملوں کی وجہ سے ہزاروں دکنی اردو دانوں کے ذریعے دکنی زبان پھیلنے لگی۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے نظام کے یہاں راجاؤں سے تجارتی تعلقات قائم رکھنے کی وجہ سے یہاں دکنیوں کی آمد ورفت جاری رہی اور وہ ریاست کے کونے کونے میں رہنے لگے۔ مرور زمانہ کے ساتھ ان کی نسل بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک اندازے کے مطابق بارہ لاکھ سے زیادہ دکنی لوگ کیرلہ کے ملیالی سماج کا حصہ بن چکے ہیں، جن کو ملیالی لوگ پٹھان، دکنی، حنفی، ترکر، صاحب جیسے الفاظ سے پکارتے ہیں۔ جو شیخ، سید، پٹھان، خان وغیرہ برادریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

دکنیوں کی آمد سے قبل ہی تاجر پیشہ قوم یعنی کچھ میمن برادری کے لوگوں نے اپنے خاندانوں کے ساتھ اس خطے میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اس کے علاوہ بوہرہ مسلم اور نوایتی (بھٹکل) برادری کے لوگ بھی ان سے مل گئے۔ اس طرح اردو دانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ اردو داں حضرات یہاں کے سماج کا حصہ بن گئے۔ یہ لوگ اپنے کاروبار کے لیے ترسیل کے طور پر اردو اور کبھی ملیالم کا استعمال کرتے تھے۔ ملیالوں کے درمیان رہنے سہنے کی وجہ سے اردو زبان کے بہت سارے الفاظ ملیالیوں کی زبان پر رائج ہوگئے۔ اگر کوئی اس موضوع پر تحقیق کرے تو اسے لازمی اس زبان کے اثرات نمایاں طور پر نظر آئیں گے۔

1956 میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل جدید کے نتیجے میں مدراس پریسیڈنسی کے ملیالم بولنے والے علاقے کو کیرلہ کے نام سے الگ ریاست کا درجہ دے دیا گیا اور ملیالم ریاست کیرلہ کی سرکاری زبان قرار پائی لیکن چونکہ برسوں سے سرکاری دفاتر میں کام کاج کے لیے اردو فارسی اصطلاحات رائج ہوچکی تھی اور انگریزی عہد حکومت میں اردو دانوں کو مقرر کرنے سے انگریزوں کو بھی اس زبان سے الفت ہوگئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس زبان کے سیکھنے اور سکھانے کا اہتمام بھی کیا۔ اس طرح سلاطین کے عہد میں سرکاری عہدوں اور شعبوں کے جو فارسی نام رواج پاچکے تھے، وہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی ہیں۔ جیسے تعلق، ضلع، فرقہ، قصبہ، قسط، تحصیلدار، کچہری، امین، وکیل، وکالت، منصف، عدالت، سررشتہ دار، صوبہ دار، چوکیدار، انعام، سرکار، تاکید، تھانہ، مفتی، استاد، رشید، معمول، خبردار، خالی، تکرار، بندوبست، خزانہ، حوالہ، چٹی راجی (راضی)، چیتی (ضبطی)، مختیار (مختار) جمع، آبکاری، چوکی، محضر، سپاہی (شپاہی) وصول، نائب، پیسہ وغیرہ الفاظ بھی زبان زد خاص وعام ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ ملیالم (جو ایک ڈراویڈی زبان ہے) پر سنسکرت زبان کے اثرات دیگر ڈراویڈی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ سنسکرت کے بعد جس زبان کے اثرات ملیالم پر زیادہ پڑے ہیں وہ اردو اور انگریزی زبانیں ہیں۔ سیکڑوں اردو کے الفاظ ایسے ہیں جو آج بھی اسی معنی میں ملیالم میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے برابر، سامان تکرار، اصل، چپل، آٹا، استاد، دھوبی، سادہ، پوری، بڑائی، کچرا، تیار، روٹی، پانی، محل، سفر، بوٹی سواری، وال، شک، چٹنی، صابون، مجبور، مرتبہ، درجہ، دربار، ندی، سلطان، بند، ناشتہ، پردہ، مصیبت، قبول، چابی، چائے، قاضی، کرتا، چٹنی، حلوا، فٹافٹ، کڑائی، توا، محبت، چاول، مست، پلاؤ، بریانی، سالن، کباب، مردہ باد، زندہ باد، انقلاب، برقع، بوٹی، دوپٹہ، فکر، شربت، شاباش، کاجل، شیروانی قمیص، استری، اجالا، بھائی، دوست وغیرہ۔

موجودہ دور میں انگریزی زبان کی بڑھتی مقبولیت نے ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح ملیالم کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے۔ چنانچہ انگریزی کے الفاظ کا چلن ملیالم میں بھی بڑھ چکا ہے۔ اس کے باوجود انگریزی سے قبل ہی اردو کے بہت سے الفاظ ملیالم میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ زبانوں کا نیچر مختلف ہونے کی وجہ سے اس کے تلفظ میں کچھ فرق آگیا ہے لیکن یہ الفاظ اسی معنی میں آج بھی ملیالم میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں کچھ الفاظ اصل تلفظ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں:

الفاظ	اصل	الفاظ	اصل
روپا	روپیہ	ساری	ساڑی
دلالی	دلال	کس مس	کش مکش
بلکیت	حقیقت	کھجاناو	خزانہ
متائی	مٹھائی	ماموں	معمول
فیلوان	پہلوان	کبول	قبول
تازی	داڑھی	انام	انعام
سوجی	سوئی	سربت	شربت
کت	خط	باکی	باقی
شباش	شاباش	کنجاو	گنجا
ماپ	معاف	اُرمال	رومال
کسم	قسم	بسار	بازار

تاکت	طاقت	توپی	ٹوپی
پاوی	پاپی	ناستا	ناشتہ
نیلا	نیلی	سوپی	صوفی
کولی	قولی	فکیر	فقیر
کِسمت	قسمت	چایا	چائے
چیرنی	شیرانی		

یہ کوئی حتمی فہرست نہیں ہے بلکہ محض چند مثالیں ہیں۔ تحقیق کرنے سے یہ فہرست کافی طویل ہوسکتی ہے۔

اسی طرح اردو میں استعمال ہونے والے بہت سے اردو میں مستعمل عربی کے الفاظ بھی ملیالیوں کی زبان پر رائج ہیں جو سیکڑوں سال سے اس سرزمین پر عربوں کی آمدورفت اور قیام کی وجہ سے رائج ہوئی ہیں، جو اسی معنی میں آج بھی بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے میت، کفن، قبر، نزل، کتاب، سوال، جواب، امام، حرام، حلال، مبارک، صاحب، محلّہ، شکر، عید، شکریہ، مہر، ایمان، صفر، واحد، استاد، قاضی، حق، دین، مولوی، فتنہ، نور، ہلاک، ہلال، حرامی، ابلیس، سلطان، برکت، رحمت، سحر، شہید اولیاء، علماء، ایمان، فکر وغیرہ۔

اسی طرح ہندی اور سنسکرت کے بعض ایسے الفاظ بھی ملیالم میں مستعمل ہیں جن کو اردو میں بھی اسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے ندی، گوبر، دوات، آگ، پانی، سونا، آشیرواد، راجا، رانی، وارتا، نگر، کھیہ، یوجنا، کرشی، پوجا، ناری، گاڑی، سنیاس، پاپی، ہڑتال، شکتی، آنند، کلی، کمل، پران، مریادہ، آشاپروت، وشیش، آکاش، کمل، کنیا، دیا، انیک۔ میلا، چچا وغیرہ چند مثالیں ہیں۔

ملیالم میں چند جیسے الفاظ بولے جاتے ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں لیکن ان کا معنی اردو سے الگ ہوتا ہے۔

ملک کے دیگر علاقوں سے بڑی تعداد میں کیرلہ میں ملازمت اور مزدوری کی غرض سے آنے والوں کے ساتھ لین دین کی وجہ سے بہت سارے اردو کے الفاظ یہاں کی مقامی آبادی کی زبان پر جاری ہوگئے ہیں۔ جیسے توا، تیل، انڈا، دال، مرچ، آلو، پانی، گوبھی، چاول، روٹی، مرغی، ٹماٹر، چینی، کرایا، چائے، بیڑی، دودھ، روپیہ، باقی، ملائم، کتنا، کدھر، کہاں، گھر، کام، روٹی، کھانا پینا، پیچھے، بابو بھیا وغیرہ۔

جیسے چور، چار، اچھا، کاکا، چھے، کھاجا، پانی، چال، آنا، سواری، چٹی، آپ، بات، تار، کڑی، دادا، رسم، پاٹ، امی، تنی، پور، مائی، کافی، آیا، کری، بابو وغیرہ اس صنف کی چند مثالیں ہیں۔

ملک کے دیگر علاقوں سے بڑی تعداد میں کیرلہ میں ملازمت اور مزدوری کی غرض سے آنے والوں کے ساتھ لین دین کی وجہ سے بہت سارے اردو کے الفاظ یہاں کی مقامی آبادی کی زبان پر جاری ہوگئے ہیں۔ جیسے توا، تیل، انڈا، دال، مرچ، آلو، پانی، گوبھی، چاول، روٹی، مرغی، ٹماٹر، چینی، کرایا، چائے، بیڑی، دودھ، روپیہ، باقی، ملائم، کتنا، کدھر، کہاں، گھر، کام، روٹی، کھانا پینا، پیچھے، بابو بھیا وغیرہ۔

آج کل کیرلہ میں ہندی فلموں کے اثرات کی وجہ سے رشتہ داری سے متعلق الفاظ کا استعمال فیشن بن چکا ہے۔ جیسے دادا، دادی، دیدی، آپا، چاچا، چاچی، ماما، مامی، منا، منی، بھابھی وغیرہ۔ اردو سے متاثر ہوکر بچوں کے نام بھی اردو میں رکھے جاتے ہیں۔ پہلے مسلمان اپنی اولاد کا نام اسمائے حسنیٰ، پیغمبروں اور صحابہ کے نام پر رکھتے تھے۔ اسی طرح غیر مسلم بھی اپنے بچوں کے نام اردو میں رکھنا پسند کرنے لگے ہیں۔ جیسے ریشمہ، تبسم، تمنا، نسیم، عاشق، تارا، شوکت، چاندنی، توفیق، ثریا، جمیل، شکیل، دل آرا، دل دار، وغیرہ۔ اسی طرح گھروں اور دکانوں کے نام بھی اردو سے لیے جاتے ہیں۔ جیسے شیش محل، نور محل، عیش محل، محفل، گلزار، گل منزل، گھروں کے ناموں کے ساتھ عام طور پر منزل، یا گھر ملاتے ہیں۔ دکانوں کے نام کے ساتھ کاروبار سے مناسبت رکھنے والے الفاظ ملاتے ہیں جیسے سونا بازار، شادی، نوری، آشیانہ وغیرہ۔

ماپلا پاٹو (Mappilapattu) گیت، ملیالیوں، خاص کر مسلمانوں میں روایتی طور پر کافی مقبول مانے جاتے ہیں۔ لیکن زمانے کی گردش کے ساتھ آج کل ماپلہ پاٹو کی جگہ اردو غزل نے لے لی ہے۔ پہلے ملیالم فلموں میں اردو کے مکالمے استعمال ہوتے تھے اور ان کا مطلب بھی بتایا جاتا تھا اب اردو مکالموں کا رجحان بہت بڑھ چکا ہے۔ ملیالم گیتوں میں اردو کے فقرے اور مصرعے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مکالموں کا مطلب بھی ملیالم میں نہیں بتاتے ہیں۔ فلم انگاڑی، کشمیرم، چینا ٹاؤن، دبائی، قلمھم، ٹرک شترا، گل مال، اندرہ جالم، نیودلہی، علی بھائی، ابھیونانم، یوہ ترکی، شرنگارہ، ویلن، جنم پیاری، دادا صاحب، دی ٹرین، بی یونڈ بارڈر، انگمالی اکسپریس، غزل، انجان، چاند پوٹو، باباکلیانی، وار اینڈ لو جیسی فلمیں

اردو اور ملیالم کا رشتہ پرانا ہے۔ دونوں زبان کے لوگوں کے بیچ میں لین دین، میل جول، ہمدردی، بڑھی اور مضبوط ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں یہاں کی فضا کافی بدل چکی ہے۔ پیشہ و نوکری کے سلسلے میں ریاست اور ملک سے باہر جاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح یہاں ملنے والی مزدوری کو دیکھ کر ملک کے کونے کونے سے بڑی تعداد میں آنے والے مزدوروں کی وجہ سے اردو کے چلن میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ تفریح کے میدان میں اردو کا اثر دیگر زبانوں کی بہ نسبت زیادہ نظر آتا ہے۔ خاص کر ملیالی اردو فلم، فلمی نغمے، غزل کی نزاکت، شیرینی، اور انداز کا لطف اٹھاتے ہیں۔

اردو کی پسندیدگی کا بین ثبوت ہیں۔

اردو اور ملیالم کا رشتہ پرانا ہے۔ دونوں زبان کے لوگوں کے بیچ میں لین دین، میل جول، ہمدردی، بڑھی اور مضبوط ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں یہاں کی فضا کافی بدل چکی ہے۔ پیشہ و نوکری کے سلسلے میں ریاست اور ملک سے باہر جاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح یہاں ملنے والی مزدوری کو دیکھ کر ملک کے کونے کونے سے بڑی تعداد میں آنے والے مزدوروں کی وجہ سے اردو کے چلن میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ تفریح کے میدان میں اردو کا اثر دیگر زبانوں کی بہ نسبت زیادہ نظر آتا ہے۔ خاص کر ملیالی اردو فلم، فلمی نغمے، غزل کی نزاکت، شیرینی، اور انداز کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ملیالم فلم کے بعد سب سے زیادہ اردو بنام ہندی فلمیں یہاں دیکھی جاتی ہیں فلم بینی کے اثرات سے ملیالیوں کی زبان پر اردو کے الفاظ چڑھ گئے ہیں ملیالیوں کے درمیان اردو کے بڑھتے اثرات سے متاثر ہوکر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ملیالیوں میں بھی اب آواز آرہی ہے
ہے کون سی زباں یہ، نغمے سنا رہی ہے
کیرل پہ دھیرے دھیرے سکے جما رہی ہے
اردو یہاں پہ اپنے جلوے دکھا رہی ہے

■

Dr. R.I. Riyaz Ahamed
'Tharif' Kayyath Road
Tellicherry- 670101 (Kerala)
Mob.:9447816192

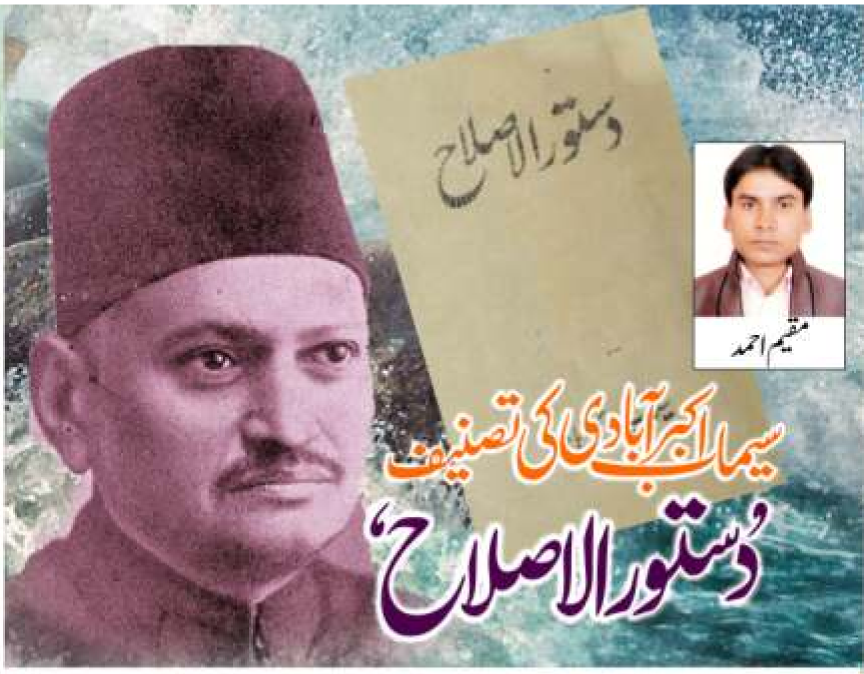

مقیم احمد

سیماب اکبرآبادی کی تصنیف
’دستورالاصلاح‘

’دستورالاصلاح‘ سیماب اکبرآبادی کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ یہ کتاب 1940 میں مکتبہ قصرالادب، آگرہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بیشتر اجزا سیماب کے رسالہ ’شاعر‘ میں شائع ہو چکے ہیں۔ سیماب اکبرآبادی نے ’دستورالاصلاح‘ میں کئی قدیم و جدید اساتذہ کی اصلاحیں بھی درج کی ہیں اور ان پر اپنا محاکمہ بھی لکھا ہے۔ اس محاکے میں انھوں نے بعض اصلاحوں کی توجیہ کی، تو بعض پر اعتراض بھی کیا اور ان کی جگہ اپنی اصلاحیں درج کیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے آخری صفحات میں سیماب نے اپنی بھی بہت سی اصلاحیں درج کی ہیں جو بہت دلچسپ ہیں اور اس کے بعد خود ان اصلاحات کی توجیہ بھی بیان کی ہے۔

عالمی ادب ہو یا پھر ہندوستانی ادب کا منظرنامہ استادی اور شاگردی کی روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ عہد قدیم سے اساتذۂ سخن اپنے تلامذہ کے کلام پر اصلاح کرتے رہے ہیں اور یہ ہنر نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ لیکن کبھی کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اس ہنر کا کوئی دستور تحریری شکل میں بھی ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ استادی اور شاگردی کا ادارہ غیر اہم ہوتا چلا گیا۔ حالات اس قدر خراب ہوئے کہ بعض شعرا نے خود کو استاد کہلانے کے شوق میں اصلاح سخن کو عمومی اور بازاری بنا دیا۔ ان کے نزدیک یہ عمل یا تو تفریح طبع کی ایک صورت بن گیا یا پھر ذریعۂ معاش ہو گیا۔ لیکن کچھ سنجیدہ اساتذہ اب بھی باقی تھے جو شاعری کے تقدس کی حفاظت کے لیے فکرمند اور کوشاں رہتے تھے۔ انھی معدودے چند اساتذہ میں سیماب اکبرآبادی بھی شامل تھے۔ لیکن ان کی جدت پسند طبیعت انھیں ہمیشہ اس بات پر آمادہ کرتی رہتی تھی کہ اس ماحول کی اصلاح ضروری ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ نئے زمانے کے ساتھ اصلاح سخن کے فن کو ہم آہنگ کیا جائے، ایک دستور، ایک نصاب مرتب کیا جائے۔ یہی فکر اور احساس ’دستورالاصلاح‘ کی شکل میں معرض وجود میں آیا۔

جب ’دستورالاصلاح‘ چھپ کر منظر عام پر آئی (جولائی 1940) تو ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ سنجیدہ اور ذمے دار اساتذہ اور شعروادب کے باشعور طالب علموں نے اس کتاب کو خوب سراہا اور سیماب اکبرآبادی کی علمی حیثیت بہت بلند ہو گئی۔ لیکن بعض روایت پسند اور دقیانوسی فکر کے حامل اساتذہ یا وہ جو اپنی اوسط فنی لیاقت کے باوجود استاد کا درجہ حاصل کیے بیٹھے تھے، اپنی قلعی کھل جانے کے خوف سے اس کتاب کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگے۔ اس سے پہلے بھی سیماب اکبرآبادی کے خلاف محاذ کھلے ہوئے تھے جنھوں نے ایک اور ادبی معرکے کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔

سیماب اکبرآبادی کا شمار اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اصناف شاعری کے ساتھ اصناف نثر میں بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔ علامہ سیماب نے اصناف نظم کی طرح نثر کی بھی کئی صنفوں میں طبع آزمائی کی۔ تحقیق و تنقید، افسانہ، ڈرامہ اور ناول نگاری ان سب میں ان کی ایک الگ شناخت ہے۔ یوں تو سیماب اکبرآبادی کی نثری خدمات کی فہرست طویل ہے تاہم ان میں ان کی ’دستورالاصلاح‘ کو بلند حیثیت حاصل ہے۔ مقام افسوس ہے کہ یہ کتاب محققوں اور نقادوں کی نظر التفات سے عموماً محروم رہی۔ اس کتاب کا تعلق شاعری سے ہے لیکن اس میں استعمال زبان و بیان اور اپنی بات کو مدلل پیش کرنے کا انداز نثر نگاری کی عمدہ مثال ہے۔

یہاں ہم سب سے پہلے ’دستورالاصلاح‘ کے تمہیدی جزو پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس میں صاحب کتاب نے شاعری اور شاعر کا عمیق مطالعہ پیش کیا ہے، بالخصوص شاعری میں اصلاح کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ’دستورالاصلاح‘ کی ابتدا ’تمہید‘ سے ہوتی ہے۔

اس باب کی ابتدا میں سیماب نے ہندوستان کے شعرا کو اصلاح کے نقطۂ نظر سے تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

(1) متکلمین ماضی (2) محدثین عہد (3) پیغمبران مستقبل

وہ شعرا جن کے کلام میں قدیم اور قدیم ترین موضوعات شاعری بالکلیہ موجود ہیں اور جنھیں اب تک تغزل کی روح سمجھا جاتا ہے انھیں وہ ’متکلمین ماضی‘ کا نام دیتے ہیں، اور ’محدثین عہد‘ کے ذیل میں ان شعرا کو رکھتے ہیں جو قدیم رنگ تغزل میں دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اس کے برعکس عصریات کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ تیسرے اور آخری طبقے میں سیماب نے ان شعرا کو رکھا ہے جو دنیا کو مستقبل کا پیغام دیتے ہیں اور جن کا موضوع فکر ’ابدیت‘ ہے۔ انھیں وہ ’پیغمبران مستقبل‘ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سیماب اکبرآبادی نے پھر شاعری کے معیار اور وجہ زوال کا ذکر کیا ہے۔

شاعری کے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

”میں شاعری کو آخرالعلوم سمجھتا ہوں۔ مگر کسی شاعر کو خاتم الشعرا نہیں مانتا۔“ (دستورالاصلاح، سیماب اکبرآبادی، مکتبہ قصرالادب، آگرہ، بار اول جولائی 1940 ص 7)

سیماب اکبرآبادی شاعری کے مختلف مفکرین اور مختلف عہد اور اس کے بدلتے ہوئے رنگ کے حوالے سے اس قول کو استحکام بخشنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاعری ایسا جامع علم ہے جس کے کلیات و جزئیات کا احاطہ تمام تر کوششوں کے باوجود نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ کوئی شاعر خاتم الشعرا نہیں ہو سکتا۔ آگے وہ لکھتے ہیں:

”اس کا سبب سب کو معلوم ہے کہ شاعری ’الہام‘ ہے اور الہام کی لامحدود قوتوں کا استقصاء انسانی قوت سے بالاتر ہے۔“ (ایضاً، ص 7)

شاعری کے الہام ہونے کی بات تو افلاطون سے لے کر اب تک کہی جاتی رہی ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا جاتا رہا ہے۔ البتہ جب ہم اسے قطعاً ’الہام‘ مان لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ اس میں انسانی قوت اور اس کے اپنے ارادوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر استادی شاگردی اور اصلاح کی ضرورت مشکوک معلوم ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاعری الہام نہیں بلکہ الہامی کیفیت کی حامل ہوتی ہے جس میں انسانی کوششوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ بہرحال آگے چل کر وہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ”فن شعر وہبی بھی ہے اور اکتسابی بھی۔“

سیماب استادی شاگردی کی رسم قدیم اور جدید

تنقید کو شاعری کے لیے نہ صرف مقصد بلکہ مشعلِ راہ قرار دیتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ رسم قدیم ہر دور اور ہر عہد میں شاعری کی ضرورت رہے گی۔ علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ ضرورتِ اصلاح میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔ سیماب شاعری کو ذریعۂ اصلاح معاشرہ اور شاعر کو مصلحِ قوم تصور کرتے ہیں۔ وہ جذباتی اور نشاطی شاعری کے اس تصور کو قبول نہیں کرتے جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ''شاعری جنسیات کا ارتفاع ہے''۔ سیماب پورے طور پر اس بات سے اتفاق نہیں کرتے۔ سیماب اکبرآبادی اسے تنگ دائرے میں محدود کرنے کے بجائے اصلاح کے وسیع تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لکھنؤ اسکول کے نشاطیہ لہجہ سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ وہاں کی زبان و بیان کی خصوصیات کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے ساتھ آگرہ اسکول کی بھی وکالت کرتے ہیں اور نہ صرف آگرہ اسکول کی وکالت کرتے ہیں بلکہ اسے مرکزی حیثیت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آگرہ کو بطور ثالث پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دہلی اور لکھنؤ میں مرکزیت قائم ہونے کے بعد اکبرآباد (آگرہ) کی حیثیت ایک ثالث کی سی رہی۔''

(دستورالاصلاح، سیماب اکبرآبادی، ص 10)

'دستورالاصلاح' میں ایک باب 'اصلاح کلام سے پہلے نظام' ہے۔ اس دلچسپ باب کے ذیلی عنوانات ہی اس کی اہمیت پر دلالت کرتے ہیں۔ سیماب نے اس حصے کو تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ اصلاح زبان، اپنی اصلاح اور اصلاح خیال۔ یہاں ان عنوانات پر نہایت ہی معلوماتی اور فکر انگیز بحث ہے۔ 'اصلاح زبان' کے تحت انھوں نے اصلاح شاعری کے لیے مصلح کی زبان کو اصلاح یافتہ ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ کیونکہ زبان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک عوام کی زبان اور دوسری خواص کی زبان۔ عوام کی زبان کا مقصد صرف مافی الضمیر کی ادائیگی اور ایک دوسرے تک پیغام رسانی ہوتا ہے۔ اس لیے اسے ناقابل اصلاح قرار دیا گیا ہے۔ خواص کی زبان کے، جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ یہاں مقصد صرف پیغام رسانی نہیں بلکہ پیغام کو بہتر اور زیادہ بامعنی صورت میں پہنچانا ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں زبان کی چاشنی اور لطف کے ساتھ زبان اور لب و لہجے کا خیال رکھا جاتا ہے، ساتھ ہی مخاطب کے ذہنی معیار اور اس کی علمی سطح کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے تاکہ متکلم کی بات اپنے پورے معانی و مطالب کے ساتھ احسن طریقے سے مخاطب تک پہنچ سکے۔ اسی لیے اسے ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ اور اسی زبان میں شاعر اپنے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

سیماب 'اپنی اصلاح' کے تحت لکھتے ہیں:

''شاعری کے لیے اپنی اصلاح کی بھی ضرورت ہے''۔ (دستورالاصلاح، سیماب اکبرآبادی، ص 15)

'اپنی اصلاح' پر بحث کرتے ہوئے وہ دو بنیادی امور 'فطرت' اور 'سیرت' پر روشنی ڈالتے ہیں۔ فطرت کو خارجی اور سیرت کو داخلی قرار دیتے ہوئے اول الذکر کو ناقابل تبدیل اور موخرالذکر کو خارجی عناصر سے متاثر ہو کر قابل تبدیل قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ شاعر کو مشورہ دیتے ہیں کہ شاعری کے لیے اچھی سیرت والا ہونا ان کے نزدیک ضروری ہے۔

'اصلاح خیال' کے تحت سیماب نے شاعر کے خیالات کو اس کی سیرت کی طرح پاکیزہ، بلند اور اعلیٰ ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اسی لیے انھوں نے شاعر کے لیے مفکر ہونا لازمی قرار دیا ہے۔ کیونکہ جو مفکر نہیں ہوگا اس کی شاعری میں نئی فکر، نئے خیالات نہیں آسکتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیماب اکبرآبادی شاعری سے اصلاح قوم کا کام لینا چاہتے تھے، جیسا کہ مولانا الطاف حسین حالی نے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سیماب خیالات میں پستی کو شاعری کے لیے مناسب نہیں سمجھتے اور ایسے تمام خیالات و افکار کی تردید کرتے ہیں جن سے سماجی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اس عنوان کے تحت سیماب نے تغزل برائے تغزل کے تحت کی جانے والی شاعری کو مخرب الاخلاق قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعری کے لیے اپنے خیالات کو بلند رکھنا ضروری ہے ساتھ ہی اپنے اردگرد کے سماج اور معاشرے میں پیدا شدہ خرابیوں سے واقفیت بھی ضروری ہے، تبھی شاعر میں بلند پروازی اور اصلاح کی قوت پیدا ہوسکتی ہے۔ ہمارے سامنے رونما ہونے والے واقعات تو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں مگر اس کا اثر اور نتائج الگ الگ شکل میں مرتب ہوتے ہیں۔ سیماب کا اصرار ہے کہ شاعر سماج میں ہونے والے واقعات کے منفی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اس کے مثبت پہلوؤں پر توجہ دیں۔ ساتھ ہی چونکہ شاعر مصلحِ قوم ہے اس لیے اس کے افکار و نظریات سے انقلاب اور بیداری کا کام لیا جانا چاہیے۔ اور اس عمل کے لیے شاعر کے خیالات کا بلند و بالا ہونا ضروری ہے۔

دراصل اس موضوع کا مقصد اجتماعی اصلاح ہے۔ سیماب اکبرآبادی کا مقصد یہ ہے کہ مبتدی شعرا کی اصلاح برسرِ مجلس کردی جائے جیسا کہ قدیم زمانے میں رواج تھا، خاص کر مشاعرے میں شعر پڑھتے وقت ہی اساتذہ اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ اس سے اسٹیج پر موجود دیگر اساتذۂ سخن کے خیالات و نظریات بھی سامنے آجاتے تھے اور ان کی تائید بھی حاصل ہوجاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کلام پختہ اور ہر طرح کی خرابیوں سے پاک ہوجاتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ برسرِ مجلس کی گئی اصلاح شعر کی تمام جہتیں اور پرتیں کھول دیتی ہے اور صاحب اصلاح کے اندر پختگی پیدا ہوجاتی ہے۔

اس کے بعد 'مجلسی و اجتماعی اصلاح' میں مشاعروں کے جدید نظام عمل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ باب بھی اپنے اندر کئی دلچسپیاں اور معلومات سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں انھوں نے مشاعروں کے بجائے مناظموں کے انعقاد پر زور دیا ہے اور ترنم سے کلام سنانے کو مشاعرے کے زوال کا سبب بتایا ہے۔ 'ضرورت اصلاح' کے تحت اصلاح سخن کی مختصر تاریخ، اصلاح کی اہمیت و ضرورت، اصلاح کے عامیانہ رویے اور ایسے ہی کئی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آگے چل کر 'اصلاح لینے کا طریقہ' میں شاگردی کے لیے ضروری رہنمائی کی گئی ہے اور اصلاح کے وہ اصول لکھے گئے ہیں جو سیماب کے معمولات اصلاح میں شامل رہے ہیں۔

'دستورالاصلاح' میں سیماب نے شعرائے متقدمین کا طریقۂ اصلاح، شعرائے متاخرین کا طریقۂ اصلاح اور شعرائے عہد موجود اور اصلاح کلام (سیماب کا عہد) تک کی اصلاحوں پر توجیہات و اعتراضات رقم کیے ہیں۔ شعرائے متقدمین کا طریقۂ اصلاح میں تعارفی نوٹ کے بعد میر تقی میر، غلام ہمدانی مصحفی، امام بخش ناسخ، حیدر علی آتش، مومن خاں مومن، اسداللہ خاں غالب اور امیر لکھنوی جیسے بڑے شعرا کی اصلاحوں کے نمونے اور ان پر خود سیماب کی توجیہات درج ہیں۔ اس کے بعد شعرائے متاخرین کا طریقۂ اصلاح کا بیان ہے جس میں تعارفی نوٹ کے بعد منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، داغ دہلوی، جلال لکھنوی، امیر اللہ تسلیم اور شوق قدوائی شامل ہیں۔ شعرائے عہد موجود اور اصلاح کلام، کے ذیل میں ابتدائی نوٹ کے بعد، جلیل مانک پوری، بیخود دہلوی، قمر بدایونی، دتاتریہ کیفی، احسن مارہروی، نوح ناروی، وحشت کلکتوی، دل شاہ جہاں پوری اور آرزو لکھنوی شامل ہیں۔ ان قدیم و جدید اساتذہ کی اصلاحوں کو درج کر کے سیماب نے ان پر اپنا محاکمہ لکھا ہے۔ اس محاکمے میں انھوں نے بعض اصلاحوں کی توجیہ کی تو بعض پر اعتراض بھی کیا اور ان کی جگہ کہیں کہیں اپنی اصلاحیں پیش کیں۔ اس کے علاوہ سیماب نے اپنی بھی بہت سی اصلاحیں درج کی ہیں اور ان کی توجیہات بیان کی ہیں۔ یہاں بطور نمونہ بعض اساتذہ کی چند اصلاحوں پر سیماب کی توجیہات اور ان پر راقم الحروف کا محاکمہ پیش ہے۔

صوفی

حق نے دی ان کو شہنشاہی دیں
کی عطا مہر نبوت کی نگیں

اصلاح غالب

حق نے دی ان کو شہنشاہی دیں
سونپ کر مہر نبوت کا نگیں

توجیہ سیماب: نگیں اور نگینہ مذکر ہے۔ یہی وجہ اصلاح تھی۔

سیماب اکبرآبادی نے اصلاح کی جو توجیہ کی ہے وہ بہت مناسب نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غالب نے نگین اور نگینہ کی وجہ سے اصلاح نہیں دی بلکہ 'سونپنا' اور 'عطا کرنا' کے درمیان باریک فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے شعر کی اصلاح کی ہے۔ شہنشاہی سونپی جاتی ہے، عطا نہیں کی جاتی ہے کیونکہ سونپنے میں کلی اختیار کی بات سمجھ میں آتی ہے۔

خواجہ آتش

سختی ایام ہے میرے لیے سامان عیش
سنگ در کو بھی سمجھتا ہوں میں زانو حور کا

اصلاح مصحفی

سختی ایام ہے میرے لیے سامان عیش
خشت بالیں کو سمجھتا ہوں میں زانو حور کا

توجیہ سیماب: سنگ در پر سر رکھ کر سویا نہیں کرتے، بلکہ یا تو اس پر سجدہ کیا جاتا ہے یا سر ٹیکا جاتا ہے۔ 'خشت بالیں' سختی ایام کے لیے بہت مناسب چیز ہے۔ اینٹ پر سر رکھ کر اکثر سوتے ہیں۔ لفظ 'بالیں' نے اس کی تصریح کردی ہے۔ اور اب شعر واقعی بلند ہوگیا ہے۔

مصحفی کی اصلاح کے بعد شعر کی معنویت بڑھ گئی ہے اور فصاحت و بلاغت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ حالانکہ سیماب اکبرآبادی نے 'سنگ در، اور 'خشت بالیں' میں جو فرق ہے اس کو واضح کردیا ہے، لیکن اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ معشوق کے زانو پر سر رکھنا مصحفی کی اصلاح کے بعد شعر کی معنویت بڑھ گئی ہے اور فصاحت و بلاغت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ 'خشت بالیں' اور زانوئے حور کی تشبیہ بالکل درست اور حقیقت حال کے موافق ہے۔ لہٰذا سیماب اکبرآبادی کی توجیہ لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے درست ہے۔

جلیل الدین حسین صوفی

خلق سے تھا وہ دل فروز مراد
صبح کے ہونے سے ہے روز مراد

اصلاح غالب

خلق سے تھا وہ دل افروز مراد
صبح کے ہونے سے ہے روز مراد

توجیہ سیماب: پہلے مصرع میں 'دل فروز' سے سکتہ پڑتا تھا 'دل افروز' نے اس کمی کو پورا کردیا۔

سیماب اکبرآبادی کی توجیہ پر اتنا اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ پہلی صورت میں پہلے مصرع کا وزن بدل گیا تھا اگرچہ مصرع موزوں تھا۔ سیماب نے جو سکتہ کی بات کہی ہے وہ درست نہیں۔ پہلے مصرع کا وزن تھا فاعلاتن مفاعلن فعلان جب کہ شعر کا صحیح وزن فاعلاتن فعلاتن فعلان ہے۔ اصلاح کے بعد یہی وزن اب ہوگیا ہے۔

لطیف انور گورداسپوری

گنگ و جمن کی موجیں چھلکا رہی ہیں امرت
ہم تشنہ لب ہیں لیکن یہ دل نشیں ہے گویا

اصلاح سیماب

گنگ و جمن کی موجیں چھلکا رہی ہیں امرت
تشنہ لبوں سے کوثر بالکل قریں ہے گویا

توجیہ سیماب: دوسرا مصرع بے معنی تھا۔ اصلاح سے مفہوم و معنی پیدا ہوگئے۔

سیماب اکبرآبادی نے اپنی اصلاح کی توجیہ درست بیان کی ہے۔ واقعی دوسرا مصرع بے معنی تھا۔ اصلاح کے بعد اس میں معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ مفہوم کے اعتبار سے گنگا، جمنا کے پانی کو تشنہ لبوں کے لیے کوثر قرار دینا محل نظر ہے۔ اس پر مذہبی نقطۂ نظر سے اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ مگر بغور دیکھا جائے تو پانی دنیاوی زندگی میں امرت ہی ہے۔ اسی سے پیدائش ہوتی ہے اور یہ پوری مخلوق کی زندگی کا اہم ذریعہ ہے۔

الم مظفرنگری

کائنات حسن ذہن معجزہ پرور میں ہے
تو سمجھتا ہے کہ نقش آذری پتھر میں ہے

اصلاح سیماب

کائنات حسن ذہن روشن بت گر میں ہے
تو سمجھتا ہے کہ نقش آذری پتھر میں ہے

توجیہ سیماب: پہلے مصرع میں 'ذہن معجزہ پروز' کی ترکیب بے معنی تھی۔ 'معجزہ پروز' بھرتی کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ اب 'ذہن بت گر' سے 'نقش آذری' اور 'پتھر' میں جان پڑگئی۔

یہاں شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ 'آذر' کا غلط استعمال ہوا ہے جو کاتب کی غلطی ہے یا صاحب شعر کی۔ آزر 'ز' سے لکھا جائے گا نہ کہ 'ذ' سے۔ بہرحال سیماب اکبرآبادی نے توجیہ کرتے وقت 'ذہن معجزہ پروز' کی ترکیب کو بے معنی قرار دیتے ہوئے اسے بھرتی کا ٹکڑا قرار دیا ہے اور اس کی جگہ 'ذہن بت گر' کا استعمال کرکے 'نقش آذری' میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سیماب نے جو اصلاح کی ہے وہ بامعنی نہیں ہے۔ اصل شعر زیادہ بہتر ہے۔ یہاں ذہن کے کمال کو یعنی بت گر کے ذہن کی خوبی کو بیان کرنا مقصود ہے اور ذہن کی خوبی اور کمال ظاہر کرنے کے لیے 'معجزہ پروز' کہنا زیادہ قوت رکھتا ہے نہ کہ 'ذہن بت گر'، 'ذہن روشن بت گر' کی ترکیب تو ٹھیک ہے یہ فصیح نہیں ہے، بمقابل 'ذہن معجزہ پروز' کے۔ 'ذہن معجزہ پروز' کی مثال چاہے نہ ملے لیکن معنی کے لحاظ سے یہ غلط نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ 'ذہن معجزہ پروز' بے معنی ترکیب نہیں ہے۔ بلکہ شعر میں 'ذہن معجزہ پروز' کو زیادہ قوت مل رہی ہے۔ شاید سیماب نے یہ سوچا ہوگا کہ یہاں 'بت گر' کا لفظ آنا چاہیے۔ اس لیے 'ذہن معجزہ پروز' کو 'ذہن روشن بت گر' سے بدل دیا۔

'دستورالاصلاح' میں آگے چل کر 'ایک اور موازنہ' کے عنوان سے شفیق اللہ خاں شفیق کوٹی کی غزل پر جگر بسوانی اور سیماب اکبرآبادی کی اصلاحیں ہیں۔ اس حصے کے مطالعے سے اس عہد کے اساتذہ کے طریقۂ اصلاح کا پتہ چلتا ہے۔ میں یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اس حصے میں سیماب اکبرآبادی نے کسی کی اصلاح کی توجیہ نہیں کی ہے۔ دستورالاصلاح میں 'موازنۂ اصلاح' کا حصہ بڑا دلچسپ ہے۔ سید عنایت علی آغاز برہان پوری کی دو غزلوں پر جلیل مانک پوری، نوح ناروی اور سیماب اکبرآبادی کی اصلاحیں پیش کی گئی ہیں۔

'ایک اور معرکتہ الآرا موازنہ' میں ایک غزل پر اس دور کے متعدد اساتذہ کی اصلاحوں کے ساتھ ساتھ سیماب کی بھی اصلاحیں درج ہیں۔ ان اساتذہ میں آرزو لکھنوی، ریاض لکھنوی، شاد عظیم آبادی، ناطق لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، شفیق عماد پوری، شوق قدوائی، فانی بدایونی، باقی غازی پوری، دلیر مارہروی، ریاض گورکھپوری، سائل دہلوی، عزیز لکھنوی، بزم اکبرآبادی، دل شاہ جہاں پوری، اطہر ہاپوڑی، صفی لکھنوی اور وحشت کلکتوی شامل ہیں۔ 'دستورالاصلاح' کے آخری صفحات میں سیماب اکبرآبادی نے اپنے شاگردوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو فارغ الاصلاح ہوچکے تھے اور دوسرے وہ جو فارغ الاصلاح ہونے کے قریب تھے۔

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'دستورالاصلاح' علامہ سیماب اکبرآبادی کی ایسی کتاب ہے جو موضوع کے لحاظ سے خاصی اہم تو ہے ہی، اپنے مشمولات کے اعتبار سے بھی اس میں ایسا مواد خاصی تعداد میں موجود ہے جس سے شعروشاعری سے شغف رکھنے والے حضرات خاصا استفادہ کرسکتے ہیں۔ آج کے ایسے دور میں جب شعروسخن کی باریکیوں کی طرف عموماً لوگوں کی توجہ کم ہوتی جارہی ہے، سیماب کی اس کتاب 'دستورالاصلاح' کا مطالعہ بہت سودمند ہوسکتا ہے۔

■

Moqeem Ahmad
I-23, 4th Floor, Abul Fazal Enclave
New Delhi - 110025
Mob.:9999555676

عنوان چشتی کی غزل گوئی

اسماء

عنوان چشتی کا شمار اردو کے اہم شاعروں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ ذوقِ جمال، نیم باز، چاند چکور اور چاندنی، بولتے ہیں سنّاٹے اور اظہار، ان کے اہم شعری مجموعے ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن غزل، نظم، رباعی، نعت، قطعہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی تاہم ان کی غزلیہ شاعری ہی ان کی اصل شناخت کا حکم رکھتی ہے۔ ان کا اصل تخلیقی جوہر غزل میں ہی کھل کے سامنے آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری کو کسی ایک تحریک یا رجحان سے جوڑ کے دیکھنا غلط ہوگا۔ ان کی غزلیہ شاعری میں جہاں سماجی حقیقت نگاری کا عنصر ملتا ہے وہیں انسانی جذبات و احساسات کی بہترین عکاسی بھی ملتی ہے۔

شاعری عنوان چشتی کے ہاں محض تفنن طبع کا ذریعہ نہیں ہے۔ وہ دراصل شاعری کو اپنی زندگی میں قدر اوّل کی حیثیت دیتے ہیں۔ انھوں نے وہی کچھ لکھا ہے جو انھوں نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری دل کے تاروں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تاریکیِ حیات کا کچھ غم نہیں مجھے
اک روشنی سی ہے مرے دل کی فضاؤں میں

گذشتہ پچاس سال میں اُردو شاعری متعدد نئے رجحانات و تجربات سے ہم آہنگ ہوئی، ہیئتی تجربے بھی ہوئے اور کئی اہم شاعر منظر عام پر آئے۔ ایسا نہیں ہے کہ عنوان چشتی ان تمام تر تبدیلیوں سے نابلد رہتے ہوئے اپنے شعری سفر پر گامزن رہے، بلکہ وہ ان تمام تر تبدیلیوں کو جذب کرتے ہوئے اپنی شاعری کی آبیاری کرتے رہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اب مجھ سے ضبطِ شوق کا دامن نہ چھوٹ جائے
اُن کی نظر نے آج تکلف اُٹھا دیا

وہ حادثے بھی دہر میں ہم پر گزر گئے
جینے کی آرزو میں کئی بار مر گئے

میرے خلوصِ عشق سے یہ بد گمانیاں
دیکھا نہیں ہے مجھ کو کسی نے قریب سے

عنوان چشتی کی شعری کائنات نہایت وسیع ہے۔ اُن کی غزلیں موضوعات کے لحاظ سے کلاسیکی شاعری اور جدید شاعری کے درمیانی خلا کو یوں پُر کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں کہ اُنھوں نے شعر کے معیار کو اگرچہ وہی کلاسیکی معیار گردانا لیکن زبان کے تقاضوں کو نئی تبدیلیوں سے ہم کنار کیا۔ ان کے یہاں عشقیہ مضامین اور جمالیاتی اُسلوب کی کارفرمائی اپنی پوری توانائی اور تحرک کے ساتھ نظر آتی ہے، جو کہ ایک مخصوص رومانی طرزِ احساس کا غماز ہے جہاں شاعر ایک حقیقی دنیا سے الگ ایک غیر مرئی شاعرانہ دنیا آباد کر کے عشق و محبت کا سہارا لیتا ہے۔ عنوان چشتی کی غزلوں میں مذکورہ کائنات اپنی واضح شکل میں ابھرتی ہے اور قاری کا رشتہ تھوڑی دیر کے لیے ایک ایسی دنیا سے استوار ہوجاتا ہے۔ جہاں سب کچھ اپنی نئی اور بدلی ہوئی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ ان کے مجموعے 'ذوقِ جمال' میں جہاں عشق و محبت اور جمالیاتی کیفیت کی لے بہت تیز ہے لیکن 'نیم باز' تک آتے آتے ان کی غزلیہ کائنات مزید وسعتوں سے ہمکنار ہوجاتی ہے۔ ان کے یہاں وجود کی بے قراری، شکستِ ذات، شکستِ آرزو کے سائے جابجا نظر آنے لگتے ہیں اور ان کی شاعری کا رشتہ سماج اور انسان سے گہرا اور مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں 'ذوقِ جمال' اور 'نیم باز' سے چند اشعار دیکھیے تاکہ اس کے ذریعے عنوان چشتی کے شاعرانہ مزاج اور ارتقا کی بہ آسانی تفہیم ہوسکے۔ ذوقِ جمال کے چند نمونے:

ابھی سے بخش دیے غم یہ کیا کیا تو نے
ابھی تو دل مرا شائستہ فغاں بھی نہیں

عنوان کام آتے ہیں ماضی کے تجربے
آنکھوں سے کیوں لگائے نہ سرمایۂ کہن

عنوان مرے شعر میں تاثیر نہ کیوں ہو
جب سوزِ دروں بڑھ کر الفاظ میں ڈھل جائے

بجھا چکا ہوں ترے انتظار کی شمعیں
کھلا ہوا ہے مگر شام ہی سے دروازہ

'نیم باز' سے چند اشعار دیکھیے:

ہر رات کو سپنوں میں اک چاند تو آتا ہے
دل ہی اسے چھونے کی حسرت میں نہ مر جائے

عنوان چشتی کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں ان کی شاعری میں گوناگوں خصائص ملتے ہیں جس میں ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ انھوں نے زمانے کے چلن کے مطابق خود کو ڈھالنا گوارا نہیں کیا بلکہ انھوں نے تمام تر شعری رجحانات اور تجربوں کے درمیان اپنا ایک مخصوص اسلوب قائم کیا اور پہلے سے موجود شعری کائنات کو مزید استوار اور مستحکم کیا جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے اور ان کا یہی رویہ انھیں ادب کی فیشن زدگی میں شامل ہونے سے بچا لیتا ہے۔

جنگل کی فضائیں بھی دل آویز ہیں لیکن
جنگل کے لیے شہر کو چھوڑا نہیں جاتا

یہ کیسا شخص ہے، کیوں جنگلوں کی بات کرتا ہے
کہ اس سے شہر کی شائستگی دیکھی نہیں جاتی

مذکورہ بالا اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ عنوان چشتی شہری زندگی اور مروجہ فیشن یا موسم سے الگ ہٹ کر اپنے احساس کو بنا کسی تردد کے بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ عنوان چشتی بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن ادب کے دوسرے شعبوں میں تسلسل کے ساتھ فعالیت نے ان کے تخلیقی سفر کو ہمیشہ متاثر کیا اور جس تسلسل کے ساتھ ان کے مجموعے یا شعری تخلیقات منظر عام پر آسکتی تھیں نہ آسکیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں خود بھی تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

پہچانتے نہیں ہیں مجھے اہلِ انجمن
اب تیرا کیا خیال ہے اے آبروئے فن

یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اگرچہ اہل انجمن نے

شاعر کی حیثیت سے عنوان چشتی کو نہ بہت فعال دیکھا نہ ان کے شعری آثار تسلسل کے ساتھ منظرِ عام پر آئے، لیکن ان کا کلام صوری اور معنوی جہات اور فنی نقطۂ نظر سے زبان کی شگفتگی اور بندش کی چستی کے مدنظر، تخیل کی پرواز اور زبان کی یکسانیت کے لحاظ سے نہ صرف آبروئے فن ہے بلکہ قدیم وجدید ادوار کی شعری روایات کا پاسبان بھی ہے۔

عنوان چشتی کی غزلیہ شاعری کا ایک اہم اور واضح پہلو جدید ہندوستانی زندگی میں اپنے طبقے کے تہذیبی و تمدنی زوال اور وقتاً فوقتاً ہونے والی قتل و غارت گری پر ان کا دردمندانہ ردّعمل ہے۔ ان کی غزلوں کے متعدد اشعار ان کے اس ذہنی کرب کو پوری شدت سے بیان کرتے ہیں جس میں ان کے ساتھ دوسرے بھی شامل ہیں مگر عنوان چشتی نے اسے گہرائی و گیرائی سے محسوس کیا اور جس حد تک اس کا تخلیقی اظہار کیا وہ نہ صرف تاثراتی ہے بلکہ ان کی انفرادیت کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

ہمارا شہر مدینہ نہیں مگر پھر بھی
ہر ایک گھر میں مہاجر قیام کرتے ہیں
ممکن ہو تو کچھ اشک ہی آنکھوں میں بچالو
سنتے ہیں کہ اب شہر میں پانی نہ ملے گا

یہ ایسے اشعار ہیں جو انسان کو اندر سے جھنجھوڑ دیتے ہیں۔

عنوان چشتی کا تعلق حضرت شاہ ولایت منگلوری کے سجادہ نشینوں سے تھا۔ لہٰذا مذہبی پس منظر اور بھرپور شاعرانہ روایت کے باوجود بھی ہمیں ان کی غزلوں میں ان کا وہ مزاجِ تصوف کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ تصوف ان کی شاعری کی رگوں میں دوڑتا پھرتا نظر آتا ہے جو زندگی سے پُر اور براہِ راست وابستہ بلکہ اکثر موقعوں پر زندگی کے ہی مسائل سے نبرد آزما ہوتا ہے اور یہی چیز انھیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے تصوف، مذہب اور شاعری کو روایت سے بالکل الگ ایک نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

میرا وجود ہے میرے عدم کا آئینہ
خود اپنی روح میں رقصاں ہوں میں خلا کی طرح

عنوان چشتی جدید عہد کے شاعر ہیں لیکن جدید شعرا کی طرح ان کے یہاں مایوسی، گھٹن، تنہائی، ناامیدی کی وہ فضا نہیں ملتی جو تمام عمر محبوب کو رونے اور رلانے پر آمادہ کردے بلکہ ان کے یہاں سرور وانبساط کی کیفیت پائی جاتی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے قاری کو غمِ دوراں کی تلخیوں سے نکال کر غمِ جاناں کی حسین وادیوں کی سیر کراتی ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''عنوان چشتی کی داستانِ عشق میں نفسیاتی پیچیدگیوں اور نوبہ نو تجربات کے رنگ شامل ہیں۔ ان کے یہاں نازک کیفیتوں کو شاعرانہ زبان مل گئی ہے جنھیں چھوتے ہوئے اوسط شاعر کی انگلیاں جلتی ہیں۔ مثلاً عنوان چشتی دل کے رشتوں کو اضطراری عمل کہہ کر محبوب کو بے ارادہ اپناتے ہیں۔ جب ان کا محبوب ضد میں آکر، ان کا دل دکھاتا ہے اور خود اس عمل سے خوش بھی نہیں ہوتا تو وہ وارداتِ عشق کو بالکل نئے اور اچھوتے زاویوں سے دیکھنے، سننے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ کل ملا کر عنوان چشتی کی شاعری کا آہنگ نشاطیہ ہے، المیہ نہیں۔''

(پروفیسر شہپر رسول، پیمانہ صفات، بیسویں صدی پبلی کیشنز، دسمبر 1995، ص 83)

مذکورہ بالا اقتباس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب ہم عنوان چشتی کی غزلیہ شاعری اور ان کی شعری تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات خاص طور سے سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے اردگرد کوئی مصنوعی حصار نہیں کھینچا۔ اور نہ ان کی شاعری نظریاتی اعتبار سے کلاسیکیت، نو کلاسیکیت، ترقی پسندی اور جدیدیت کے خانے میں رکھی جاسکتی ہے بلکہ ہمیں ان کی شاعری میں فکر وفن کا ایسا فنی ارتقا نظر آتا ہے جو ان کی ذہنی وسعت اور فکری تنوع پر دلالت کرتا ہے۔

جہاں تک عنوان چشتی کی شاعرانہ زبان کا تعلق ہے تو ہمیں ان کی غزلوں میں وہ تمام فنی محاسن نظر آتے ہیں جو ہر اچھی غزل کے لیے لازمی ہیں۔ ان کی غزلوں کی زبان نہایت صاف ستھری، سلیس، رواں دواں اور بامحاورہ ہے۔ بے تکلفانہ اندازِ بیان الفاظ کے الٹ پھیر سے مفہوم میں وسعت اور لطف پیدا کرنا عنوان چشتی کو خوب آتا ہے جس کی وجہ سے ان کی غزلوں میں سہلِ ممتنع کی خوبی در آئی ہے اور ظاہر ہے یہ خوبی اظہار پر مکمل گرفت کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ کیا کہ غیر رہیں اور تیرے کہلائیں
اگر یہ سچ ہے تو ہم کیا ہماری نسبت کیا؟
ہم فقیروں سے آشنائی کر
اور چاہے جہاں خدائی کر
عجیب شخص ہے،، جادو سا کیا بیان میں ہے
زبان اس کی ہے دل میں کہ دل زبان میں ہے
سنسان زندگی کی مسافت ہے اور میں
مجھ کو بھی اپنے ہاتھ میں اک ہاتھ چاہیے

درج بالا اشعار میں سلاست بھی ہے اور بے ساختگی بھی۔ عنوان چشتی کی غزلوں کی یہی خاصیت ہے کہ ہمیں ان کے یہاں نئے اور پرانے پن کا ایسا پُرلطف امتزاج ملتا ہے جو کلاسیکی روایت کا پاسبان بھی ہے اور جدیدیت کا علمبردار بھی۔ ان کے شاعرانہ ذوق کو نکھارنے میں بہت بڑا ہاتھ ان کی سلیقہ مندی اور شائستگی کا ہے۔ انھوں نے غزلوں کی قدیم روایت کو اپناتے ہوئے تازگی وندرت کو برقرار رکھا اور نئی نئی زمینوں میں تجربات کیے۔ جس کے سبب ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ انھوں نے بڑی خوش سلیقگی وشائستگی سے اپنے جذبات کو غزل کا پیکر عطا کیا۔ ان کی غزلوں میں وارفتگی، سرشاری اور شگفتگی کی ایک مخصوص فضا ملتی ہے۔ اور یہی شگفتگی جب نغمگی اور رجائیت میں ملبوس ہو جاتی ہے تو آرٹ کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اپنی غزلیہ شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے مجموعہ کلام ''ذوق جمال'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''غزلیہ شاعری شاعر کے دل کی دھڑکنوں کا حسین نتیجہ ہوتی ہے۔ پڑھنے والا کانوں سے ان دھڑکنوں کو نہیں سن سکتا لیکن اپنے دل کی تھرتھراہٹوں سے محسوس کرلیتا ہے۔''

ان کی غزلوں کا مطالعہ ان کے اس قول کی تائید کرتا ہے اور قاری ان کے اشعار کو واقعی دل کی تھرتھراہٹوں سے محسوس کرتا ہے۔

عنوان چشتی کو زندگی اور اس کی نسبت سے انسانوں سے بے حد محبت ہے اور ان کی اس محبت کا اظہار ان کے یہاں جگہ جگہ ملتا ہے جس میں سچائی کا رنگ غالب ہے۔

حد نگاہ تک چمن سا کھلا ہوا
یہ کون آ بسا مری پلکوں کی چھاؤں میں
خود اپنی ذات پہ کیا کیا ہمیں گماں گزرے
زمیں سے رقص میں جس طرح آسماں گزرے

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عنوان چشتی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور انھوں نے غزل کے ہیئتی تقاضوں کو اپنانے کے ساتھ ساتھ زندگی کے جذباتی و اخلاقی پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھا۔ نیز انھوں نے سماج اور کائنات کو جس طرح دیکھا اس کا اظہار اپنی غزلوں میں کیا۔ ان کے یہاں کلاسیکی انداز کی جھلک بھی ہے اور نئے پن کا احساس بھی اور ان کا یہی انداز انھیں دوسروں سے ممتاز بھی کرتا ہے۔ انھیں خود بھی اپنی انفرادیت کا احساس تھا جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں۔

فقیرِ عشق سے ملیو ضرور دلّی میں
وہ ایک شخص نہیں مستقل ادارہ ہے

■

Asma
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

اردو ادب کے فروغ میں ٹی وی کا حصہ

منظور احمد ملا

کبھی کبھی ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ترسیل کی تکنیک کی وجہ سے انسانی برتاؤ کے انداز میں تبدیلی آجاتی ہے۔ ترسیل کا نیا طریقۂ کار کسی خیال، کسی فکر، کسی معلومات یا کسی تجربے کی ترسیل کا نیا ڈھنگ ہی نہیں ہوتا بلکہ زندگی گزارنے کا نیا انداز بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا آج کا انسان اپنے ہر دن کا آغاز نئے انداز اور نئے طریقے سے کرتا ہے اور اس میں خصوصاً ٹیلی ویژن تکنیک کا بھی اہم رول ہے۔

لفظ ٹیلی ویژن دو الفاظ کا مرکب ہے ٹیلی (Tele) اور ویژن (Vision) ٹیلی ایک یونانی (Greek) لفظ ہے جس کے معنی ہیں بہت دور سے اور ویژن لاطینی (Latin) لفظ ہے جس کے معنی دیکھنا یا دکھائی دینا ہے۔ مجموعی طور پر اس کے معنی یہ ہیں کہ بہت دور سے دیکھ لینا۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد سے قبل ریڈیو ترسیل کی دنیا کی حقیقت بن چکا تھا۔ خاموش متحرک فلموں کو پردے پر پیش کرنے میں بھی کامیابی مل گئی تھی۔ پھر جلد ہی سائنسدانوں نے تصویر کی حرکت کے ساتھ آواز کو ہم آہنگ کرنے کے طریقے بھی ڈھونڈ لیے۔ جس کی وجہ سے متحرک فلمیں بیک وقت جنت نگاہ اور فردوس گوش بن گئیں۔ اس طرح کسی بھی مخصوص جگہ کو پردے پر ہی پیش کیا جا سکتا تھا ٹیلی ویژن نے اس محدودیت کو توڑا۔ یہ صورت و عکس کا خوبصورت امتزاج لیے ہر وقت آپ کے بیڈروم سے ڈرائنگ روم تک حاضر ہے۔ آپ بس، کار، ریل یا ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوں یا گھر میں ہوں، یہ کسی ہمدم دیرینہ کی طرح ہر وقت آپ کے ساتھ ہے۔

''ٹیلی ویژن آج اپنی چمک، رنگا رنگی، آواز و تصویر کی یکجائیت اور منظر و پیش منظر کی وجہ سے موثر ترین، مقبول ترین، نظر فریب اور مسحور کن ذریعہ ترسیل بن گیا ہے۔ اس سے ہر قوم، ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔ مستقبل میں اس کے خوب سے خوب تر ہونے کے امکانات بھی خاصے روشن ہیں۔''

(ابلاغیات، ص 249)

ٹیلی ویژن کا بنیادی نظریہ 1830 میں اس وقت وجود میں آگیا تھا جب فرانس کے ماہر طبعیات الیگزینڈر ایڈمنڈ بی کویرل (Alexander Edmond Becqural) نے برق کیمیاوی (Electrochemical) اثرات کی جانکاری حاصل کی۔ لیکن 1884 میں یہ نظریہ حقیقت میں بدل گیا۔ جب جرمن سائنسدان (Paul G Nipkon) پال جی نپکون نے اسکیننگ ڈسک کے ذریعے تصویر کو نشر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ نپکون اپنے اس طریقۂ کار کو مزید ترقی دینے میں کوشاں تھا کہ 1923 میں (John logi Bird) جان لوگی برڈ نے نپکون کی اسکیننگ ڈسک والے طریقے کو مزید ترقی دے کر تصویر کو ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک پہنچا دیا۔ پھر یہ برڈ ہی تھا جس نے 1926 میں پہلی بار متحرک تصویر کو ریڈیو کی آواز کی طرح نشر کیا۔ یہی وہ پہلا شخص تھا جس کی وجہ سے 1929 میں بی بی سی نے اپنے ٹیلی ویژن پروگرام نشر کیے۔ اسے نپکون اور برڈ کا میکینکل ڈسک ٹیلی ویژن کہا جاتا تھا۔

1924 میں مارکونی کی کمپنی نے ٹی وی کیمرہ ایجاد کیا جس میں گھومنے والی پلیٹ (Disc) کے بجائے (Electron Gun) استعمال ہوتی تھی۔ 1934 اور 1936 کے دوران برطانیہ میں اس بات پر کافی مباحثہ چلتا رہا کہ عوامی ٹیلی ویژن نشریات کے لیے کون سا طریقہ زیادہ موزوں ہے۔ برڈ کا یا مارکونی کا، 1937 میں برطانیہ کے پوسٹ ماسٹر جنرل نے اعلان کیا کہ مارکونی ہی کا طریقہ ترسیل کے لیے موزوں اور زیادہ مناسب ہے۔ برطانیہ میں بی بی سی کی جانب سے بہت سے پروگراموں کی نشریات شروع ہو گئیں۔ یعنی 1936 میں برطانیہ سے موسیقی پروگرام، کھانے پکانے کے اسباق، انٹرویو وغیرہ یہ سارے پروگرام 1939 تک نشر کیے جاتے تھے اور اس کے بعد بی بی سی ٹیلی ویژن سروس بند کر دی گئی، جو سات جون 1946 تک بند ہی رہی، شاید دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا۔ دوسری طرف سے امریکہ میں بھی نپکون کے اسکیننگ ڈسک کے طریقے میں برابر تجربے اور ترقی ہو رہی تھی۔ 1920 آتے آتے تصویر کافی صاف ہو گئی تھی۔ لیکن اس میں بھرپور کامیابی اس وقت ملی جب مکمل طور پر ٹیلی ویژن ایجاد ہوا۔

ڈاکٹر محمد شاہد حسین لکھتے ہیں:

''برطانیہ کے علاوہ دوسرے مغربی ممالک میں بھی اس سمت میں تحقیق و جستجو جاری تھی۔ فرانس، روس اور جرمنی بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے مگر بنیادی طور پر اس کے

دو مرکز تھے یعنی برطانیہ اور امریکہ۔''

(ابلاغیات، ص 251)

اسی دوران ایک نشریاتی کمپنی اپنے طور پر ٹیلی ویژن نشریات کے تجربے کر رہی تھی۔ اس کمپنی نے نیویارک میں 1930 میں ایک ٹیلی ویژن اسٹیشن بھی شروع کیا۔ اس اسٹیشن میں نشریاتی تجربے سے تصویر پہلے سے زیادہ صاف ہوگئی ہے۔ امریکہ میں 1936 میں ٹیلی ویژن نشریات کا دائرہ عمل صرف ایک میل تھا لیکن 1939 میں پہلی بار ورلڈ فیئر میں ٹیلی ویژن سیٹ فروخت کے لیے رکھے گئے یعنی ٹیلی ویژن عوام میں آیا۔ اس سال اس کا دائرہ عمل بڑھ کر 160 میل ہوگیا۔ اس کے سال بعد یعنی 1940 میں امریکہ میں ٹیلی ویژن کے سلسلے میں اہم ترقیات ہوئیں ان میں سے ایک رنگین ٹیلی کاسٹ کی ابتداء بھی ہے۔

آج ٹیلی ویژن ہماری زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اب ہم ٹیلی ویژن کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں کر سکتے لیکن اب سے کچھ برس پہلے ہماری زندگی ٹیلی ویژن سے بہت کم متاثر تھی۔ ٹیلی ویژن انٹرنیٹ کو چھوڑ کر ابلاغیات کے تمام ذرائع خصوصاً اخبار، فلم اور ریڈیو کے مقابلے میں جدید ترین ہے۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد تو کافی بعد میں ہوئی لیکن اس کا فروغ بہت ہی تیز رفتاری سے ہوا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ آج ٹیلی ویژن سب سے موثر اور طاقت ور ذریعہ ابلاغ ہے۔ ٹیلی ویژن کی نشریات کا آغاز سب سے پہلے 1920 میں امریکہ میں ہوا تھا۔ یہ نشریات تجرباتی طور پر کی گئی تھی، اس وقت تصویروں کے بدلنے کی رفتار کافی کم تھی اس لیے وہ آج کی طرح زندہ جاوید اور چلتی پھرتی تصویریں نہیں محسوس ہوتی تھیں۔ اس تجربے میں بڑے امکان نظر آتے تھے اور بہت تیزی سے اس سمت میں کام کیا جانے لگا۔ 1923 آتے آتے تکنیکی طور پر کافی سدھار ہوا اور اب یہ تصویریں زندگی سے زیادہ بھرپور تھیں۔ اگلے کئی برسوں تک سائنسدانوں نے کڑی محنت کی اور ان کے کافی بہتر نتائج حاصل کیے۔ ٹیلی ویژن نشریات کا وہ معیار ہوگیا کہ اس سے مستقل پروگرام نشر کیے جانے لگے۔ 1930 میں این بی سی (N.B.C) اور لندن سے بی بی سی (B.B.C) نام کے ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کا قیام عمل میں آیا اور یہ دونوں چینل مستقل طور پر اپنے پروگرام نشر کرنے لگے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اس سلسلے میں کوئی خاص ترقی نہ ہوسکی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد ٹیلی ویژن نشریات میں کافی تیزی سے ترقی ہوئی، اگلے 15 برسوں میں ترقی یافتہ ممالک جیسے امریکہ، جاپان، کناڈا اور یورپی ممالک میں ٹیلی ویژن زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکا تھا۔

ہندوستان میں نئی دہلی سے 15 ستمبر 1959 میں جب پہلی بار تجرباتی طور پر ٹیلی ویژن نشریات عمل میں آئی تو اس میں یونیسکو (UNESCO) کا مالی تعاون اور امریکہ وفلپس انڈیا (Philips India) کا تکنیکی تعاون شامل تھا۔ اس نشریات کا مقصد تھا کہ ٹیلی ویژن نشریات کے ذریعے رسمی تعلیم اور قوم کی ترقی کے امکانات پیدا کیے جائیں۔ یہ تجرباتی نشریات ٹیلی کلب کے 180 مخصوص ممبران پر مشتمل تھی جنھیں یونیسکو نے مفت میں ٹیلی ویژن سیٹ دستیاب کرائے تھے۔ اور یہ پروگرام صرف 40 کلو میٹر کے دائرے میں دیکھے جا سکتے تھے۔ 1961 میں اسکول ٹی وی کا آغاز ہوا اور مستقل طور پر پروگرام نشر کیے جانے لگے۔ یہ پروگرام تعلیمی ہوتے تھے خاص طور پر سائنس کے اساتذہ اور طالب علموں کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کیے جاتے تھے۔ 1959 سے 1965 تک ہفتے میں صرف ایک دن ایک گھنٹے کا پروگرام دکھایا جاتا تھا۔ 1965 سے روزانہ ایک گھنٹہ پروگرام دکھایا جانے لگا۔ 1965 میں پہلی بار کچھ تفریحی پروگراموں کا بھی آغاز ہوا لیکن تعلیم صحت، دیہاتی مسائل اور مختلف ترقیاتی پروگرام ابھی ان کی ترجیحات میں تھے۔ ٹیلی ویژن کو ہندوستانی سماج کے لیے مفید بنانے کے بنیادی نظریے کے تحت 1967 میں زراعتی پروگرام شروع کیا گیا تاکہ ان پروگراموں کا فائدہ وہاں کے لوگوں تک پہنچ سکے۔

1972 میں بمبئی کا ٹیلی ویژن سینٹر ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ سینٹر ہندستان میں پیشہ ورانہ مہارت کا حامل پہلا سینٹر ہے۔ اس کے لیے ساری مشینیں اور آلات جرمنی نے ہندوستان کو تحفے میں دے دیے۔ ابتداء میں اس کے پروگرام روزانہ ڈیڑھ گھنٹے کے ہوتے تھے مگر جلد ہی اس کے پروگراموں کو زیادہ دلچسپ بنا کر اس کے اوقات میں اضافہ کر دیا گیا۔ اب حکومت کی پوری توجہ ٹیلی ویژن کی طرف مبذول ہو چکی تھی لہٰذا بمبئی سینٹر کے ایک سال بعد یعنی 1973 میں سری نگر ٹیلی ویژن سینٹر قائم ہوا۔ اسی سال پونہ میں بھی ٹیلی ویژن سینٹر قائم ہوا اور اس کے ساتھ امرتسر میں بھی ایک ٹرانس میٹر قائم کیا گیا ہے۔ 1975 میں کلکتہ، مدراس اور لکھنؤ میں بھی ٹیلی ویژن سینٹر قائم کر دیے گئے ان ٹیلی ویژن سینٹروں میں مختلف قسم کے پروگرام نشر کیے جاتے رہے جیسے زراعت، آبپاشی، مویشی، پوداکاری صحت وصفائی اور ماحولیات کے عنوانات پر مختصر پروگرام نشر کیے جاتے رہے۔ یہ سلسلہ 1976 تک چلتا رہا، اسی سال ٹیلی ویژن سے کاروباری نشریات کا آغاز ہوا۔ اب تک ٹیلی ویژن اور ریڈیو ایک ہی شعبے کی دو شاخیں تھیں اور ایک ہی ڈائرکٹریٹ کے تحت تھے۔ ابھی تک یہ آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ منسلک تھا، اسی برس ٹیلی ویژن کو الگ مستقل ادارہ بنایا گیا جسے 'دوردرشن' کا نام دیا گیا۔

''دوردرشن کی قوت اس حقیقت سے واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے بہت ہی قلیل عرصے میں اپنی رسائی ملک کے 70 فیصد علاقوں تک کر لی ہے کہ عوام کو اطلاعات، تعلیم اور تفریح فراہم کرنا ہے۔ قومی اتحاد، سماجی تبدیلی عام لوگوں میں سائنسی بیداری اور ماحولیات میں توازن بنائے رکھنے کے لیے عوام میں بیداری پیدا کرنا ہے اس سے دوردرشن کا پورے ملک میں براہ راست ٹیلی کاسٹ ممکن ہو سکے گا۔''

(ٹی وی نیوز وپروڈکشن فن اور طریقہ کار، ص 14)

اس کے بعد 1982 میں ٹیلی ویژن میں انقلابی تبدیلیاں آئیں جب کہ سیٹ لائٹ کے ذریعے قومی جال (National Network) قائم کیا گیا جس کے ذریعے قومی نشریات کا آغاز ہوا جسے بیک وقت پورے ہندوستان میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس قومی نشریات کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ ہندوستان میں پہلی بار رنگین نشریات عمل میں آئیں۔ اسی سال ٹیلی ویژن پر پہلی بار براہ راست (Live Telecast) نشریات کا آغاز ہوا۔ ایشیائی کھیلوں اور غیر ممالک کی کانفرنس کو دوردرشن پر سیدھا دکھایا گیا۔ 1984 میں ہندوستان کا پہلا ٹی وی سیریل 'ہم لوگ' دکھایا گیا۔ اس امر نے ٹیلی ویژن نشریات کی پوری تاریخ بدل دی وہ 1992 میں واقع ہوا اسی سال سے کیبل ٹی وی کا آغاز ہوا اور دوردرشن کے علاوہ پرائیویٹ چینلوں کا آغاز ہوا، اس کمپنی کا پہلا پرائیوٹ چینل زی۔ ٹی۔ وی تھا جس نے ہندوستان میں پرائیویٹ چینلوں کی ایک مستحکم روایت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن نشریات کی رفتار اتنی تیزی سے بدلی اور ایسی ترقی کی کہ نہ صرف ٹیلی ویژن بلکہ پورے معاشرے پر بہت گہرے نقوش ثبت ہوئے۔ ان نجی چینلوں نے پروگراموں میں اس قدر تبدیلی کی کہ ان کا حساب لگانا ایک مشکل امر ہے۔

ستر کی دہائی یعنی ٹیلی ویژن کا زمانہ آتے آتے ہندوستان میں اردو کی حالت خستہ ہوگئی، سماج اور سرکاری دربار میں اس کی وہ قدر نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں اردو کا کوئی عمل دخل نہیں رہا۔ خبروں اور افسانوی

ادب پر مبنی پروگراموں میں لامحالہ اس کی ضرورت تو پڑتی ہے چونکہ عشق ومحبت ہمارے افسانوی ادب کا ایک جزو ہیں اس لیے وہاں اردو کے استعمال کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں تھا موسیقی پر مبنی پروگراموں میں اردو بھلے ہی خال خال استعمال کی جاتی ہو مگر جہاں تک غزلوں اور قوالیوں کا تعلق ہے تو وہاں اردو کی ایک طرح اجارہ داری رہتی ہے۔ ٹیلی ویژن چینلوں میں مسلمانوں اور مسلم معاشرت سے تعلق سیریل بنانے کا چلن رہا ہے۔ زہرہ محل، شاہین، حنا، مرزا غالب، حاتم طائی، شکوہ اور ٹیپو سلطان جیسے سیریل اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیب اور ان کی طرز رہائش دکھانے کے لیے اردو کا استعمال ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔ یہاں پر اردو ٹیلی ویژن چینل مثلاً ای ٹی وی اردو، ڈی ڈی اردو، عالمی سے، زی سلام کی خبروں اور حالات حاضرہ اور تفریحی پروگرام کا ایک مختصر تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ٹیلی ویژن میں اردو زبان وادب کا جائزہ لیا جا سکے۔

حیدر آباد سے نشر ہونے والا ای ٹی وی اردو 24 گھنٹے چلنے والا ایک اہم چینل ہے اس چینل سے 12 گھنٹے تفریحی اور 12 گھنٹے خبریں اور حالات حاضرہ کے پروگرام اردو میں نشر ہوتے رہتے ہیں۔ خبرنامہ، خاص بات اور ہمارے مسائل کے ساتھ تفریحی پروگرام میں محفل مشاعرہ، غزل سرا، بزم نسواں اور ٹیلی سیریل ناظرین کو باندھے رکھتے ہیں۔ چونکہ خبرنامہ کسی بھی نیوز چینل کی جان ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ٹی وی پر خبروں کا آغاز 15 اگست 1965 کو دوردرشن نے کیا اور پہلی بار اردو میں خبریں بھی یہیں سے نشر ہوئیں۔ لیکن کسی نجی ٹی وی چینل کے ذریعے اس سے پہلے اردو میں خبریں نشر کرنے کا شرف ای ٹی وی اردو کو حاصل ہے۔ اس چینل کے ذریعے پہلے قومی خبریں اور بعد میں علاقائی اور دیگر سماجی اور اقتصادی خبریں اور بین الاقوامی خبریں صرف اردو میں نشر کی جاتی ہیں۔

''پرنٹ میڈیا نے اردو زبان وادب کو ترقی تو دی لیکن پڑھے لکھے لوگوں کے بیچ۔ مگر ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اسے وہاں پہنچایا جہاں اردو کا ناخواندہ سماج بھی رہتا ہے۔ ایسے سماج کے بیچ اردو نے ایک عام فہم اور شیریں زبان کے طور پر اپنی پہچان بنائی ہے۔ ٹیلی ویژن کی وجہ سے دیگر زبانوں کے الفاظ ومحاورے متواتر اردو میں داخل ہو رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے زبان کو وسعت مل رہی ہے اور اردو زبان ایک ترقی یافتہ زبان کے سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے۔''

پرنٹ میڈیا نے اردو زبان وادب کو ترقی تو دی لیکن پڑھے لکھے لوگوں کے بیچ۔ مگر ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اسے وہاں پہنچایا جہاں اردو کا ناخواندہ سماج بھی رہتا ہے۔ ایسے سماج کے بیچ اردو نے ایک عام فہم اور شیریں زبان کے طور پر اپنی پہچان بنائی ہے۔ ٹیلی ویژن کی وجہ سے دیگر زبانوں کے الفاظ ومحاورے متواتر اردو میں داخل ہو رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے زبان کو وسعت مل رہی ہے اور اردو زبان ایک ترقی یافتہ زبان کے سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے۔

(الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت، ص 249)

خبروں کے ساتھ خاص بات بھی ای ٹی وی اردو کے مقبول پروگراموں میں سے ایک پروگرام ہے۔ ہندوستان کے تمام چینلوں میں نشر ہونے والا یہ واحد ایسا بلیٹن ہے جو اقلیتوں کے لیے وقف ہے۔ اس میں ہندوستان کی اقلیتوں کے سیاسی، سماجی اقتصادی اور تعلیمی مسائل کے علاوہ اردو کے تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں کا ایک بڑا حصہ رہا ہے۔ اس بلیٹن کی خاص بات کو دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اردو زبان وادب کا روزنامچہ ہے۔ ہمارے ملک میں جتنے بھی روزنامہ اردو کے متعلق اہم پروگرام ہوتے ہیں، خاص بات میں اسے پیش کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ اردو زبان وادب کی کارگزاریوں کو عوام تک پہنچا رہا ہے بلکہ اردو کی ترویج وترقی میں اہم رول بھی ادا کر رہا ہے۔ خاص بات کے ساتھ ای ٹی وی اردو عالمی منظر یعنی بین الاقوامی خبروں کو بھی نشر کرتی ہے۔ دیگر ہندی اور انگریزی چینلوں پر بین الاقوامی خبریں نشر کی جاتی ہیں لیکن اردو میں بھی بین الاقوامی خبریں نشر کی جاتی ہیں۔

حالات حاضرہ کے پروگراموں میں ہمیشہ تازہ اور اہم موضوعات شامل کیے جاتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر حالات حاضرہ کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں مثلاً سیاسی، سماجی سرگرمیاں، معاشی بحران، علم وادب وغیرہ ای ٹی وی اردو کی بلیٹن سے نشر کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بحث ومباحثے پر مبنی پروگرام ہمارے مسائل اور مذاکرے پر مبنی 'گفتگو' ای ٹی وی اردو کا اہم پروگرام ہے۔ 'گفتگو' پروگرام کے تحت ملک کی نامی گرامی ہستیوں کا انٹرویو لیا جاتا ہے اس میں ایسے اشخاص کو مدعو کیا جاتا ہے جن کو لوگ سننا چاہتے ہیں۔ جن کی باتوں سے عوام پر اثر ہوتا ہے اور کئی بار ان کا یہ انٹرویو نشر کیا جاتا ہے۔

محفل مشاعرہ اور غزل سرا ای ٹی وی اردو کے بہترین اور مقبول ترین پروگرام مانے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں میں پہلے اہم شعراء حضرات کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ان کے کلام کو شوٹ کر لیا جاتا ہے اور اگلے ہفتے یہ کلام نشر کیا جاتا ہے تاکہ سامعین اور ناظرین گھر بیٹھے مشاعرے سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ مشاعروں اور غزل سرا پروگراموں کے ذریعے اردو لوگوں کے گھروں میں داخل ہو رہی ہے۔ غزل سرا میں بہت سے لوگوں کا انتخاب ہوتا ہے اور غزلیں پیش کرتے ہیں بہترین غزل سنگر کا انتخاب کرتے ہوئے اس کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اس پروگرام نے کئی مشہور غزل کے شعرا کے کلام کو جلا بخشی ہے۔ بلاشک وشبہ محفل مشاعرہ اور غزل سرا نے اردو ادب وزبان کو گلی کوچوں تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ آج غیر اردو داں لوگ بھی اس پروگرام کے ذریعے اردو کے قریب آ رہے ہیں اور ان میں بھی اردو سیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔

ڈی ڈی اردو یعنی دوردرشن ہندوستان کی ایک قومی سروس ہے۔ اس کا شمار دنیا کے بڑے براڈ کاسٹنگ اداروں میں ہوتا ہے۔ ڈی ڈی اردو کا افتتاح اس وقت کے وزیر اعظم جناب من موہن سنگھ نے 15 اگست 2006 کو دہلی میں کیا تھا۔ انھوں نے قوم کے نام خطاب کیا، خبرنامے کے علاوہ ادبی اور مذہبی پروگرام بھی نشر کیے جاتے ہیں۔ دوردرشن میں کئی ادبی وثقافتی پروگرام بھی نشر کیے جاتے ہیں۔ ان میں مشاعرے کا پروگرام 'محفل سخن' صوفی موسیقی کا پروگرام 'محفل سماع' قوالی کا پروگرام 'رنگ۔ اے۔ قوالی' غزل کے پروگرام 'محراب غزل' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اردو تہذیب پر مبنی سیریل بھی ڈی ڈی اردو پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس طرح کے پروگراموں سے نہ صرف اردو اصناف کو فروغ مل رہا ہے بلکہ ملک میں اردو کی ایک فضا بھی بن رہی ہے۔ محمد یاسین گنائی لکھتے ہیں:

''جدید ذرائع ابلاغ میں دوردرشن ٹیلی ویژن ایک اہم ذریعہ ہے۔ یہ انسانی زندگی کا ایک اہم جز بن چکا ہے کیونکہ اس کے پروگرام معاشرے کے تمام طبقات میں دیکھے جاتے ہیں۔ اس میں تفریحی، سیاسی، سماجی، سیاحتی، عملی، ادبی، موسیقی معلوماتی، کھیل کود، موسم، زراعت غرض ہر قسم کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔''

(شیرازہ، اردو کانفرنس نمبر، ص 73)

ہندوستان کا اردو چینل زی سلام 2010 میں شروع

ہوا تھا۔ اردو زبان اور تہذیب کے لیے وقف یہ چینل سامعین کے لیے مفت ڈش ٹی وی کے چینل نمبر 786 پر مہیا ہے۔ ہمارے ملک میں اردو زبان و ادب کی روایت کافی شاندار رہی ہے اردو شاعری، طنز و مزاح اور صوفیانہ ادب ہماری تہذیب کا ایک حصہ ہے زی سلام کا مقصد اردو تہذیب و ثقافت کو زندہ رکھنا اور اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کرنا ہے۔ عالمی سے اور زی سلام چینلوں کی وجہ سے اردو صحافت کو ایک بلندی عطا ہوئی ہے۔ خبروں اور حالات حاضرہ کے پروگراموں کے علاوہ مشاعرے کے پروگرام، 'بزم ادب' سیمنار، سمپوزیم یا مذاکرے، حمد و نعت اور منقبت کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

ان دونوں چینلوں نے سماجی، سیاسی، ادبی و ثقافتی پروگراموں کی ترویج و ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ عالمی سے میں سیاسی، سماجی اور ادبی شخصیت سے ملاقات پر مبنی پروگرام 'ایک ملاقات' نشر ہوتا ہے جس میں اردو داں خواتین و حضرات کے ادبی، شعری، ذوق و شوق کو نکھارا اور اس کی آبیاری ملتی ہے۔ زی سلام نے 'سلام محفل' کے نام سے ایک پروگرام شروع کیا جس میں بڑے بڑے اور عمدہ شعرا حضرات کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ایک سنجیدہ محفل سجتی ہے اور ناظرین اردو شاعری کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ اردو کو ٹیلی ویژن پر مقبول بنانے میں اس طرح کے مشاعروں کا بڑا دخل ہے۔ قوالی اور صوفیانہ کلام بھی زی سلام پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ زی سلام پر پیش ہونے والا فکشن پر مبنی پروگرام 'سبق' بھی کافی اہم ہے۔ اس میں کسی سبق آمیز قصے، کہانی پر ٹیلی ویژن سیریل پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ تر کہانیاں اردو سماج سے ہی لی جاتی ہیں، جن میں اردو تہذیب و ثقافت کے ساتھ اردو زبان و ادب کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے۔

ہندوستان میں نشر کیے جانے والے مختلف زبانوں کے خبر ناموں میں ہندی زبان کو اولیت دی جاتی ہے۔ ان ہندی خبروں میں اردو بول چال ہمیشہ ساتھ دیتی ہے جیسے قتل، ملاقات، سلسلہ، قانون، گواہ، شکریہ، انجام، خلاصہ اعلان، قہر سیکڑوں الفاظ روزانہ بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ آج تک، این. ڈی. ٹی. وی، زی نیوز یا ڈی ڈی نیوز ان سبھی نیوز چینلوں نے اردو کے خزانوں سے اپنا دامن بھرا ہے۔ اس طرح جہاں اردو سے فائدہ اٹھایا وہیں دوسری طرف اردو کو بھی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ کیونکہ یہ چینل خبروں اور حالات حاضرہ کے پروگراموں میں اردو کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ان ہندی چینلوں کی بدولت اردو کا بہت فروغ ہو رہا ہے۔

اردو کے متعلق ایک بات اکثر کہی جاتی ہے کہ جب تک اس کا رشتہ ٹکنالوجی اور روزگار سے نہیں جڑے گا اس کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اس سمت میں الیکٹرونک میڈیا خاص طور سے ٹیلی ویژن میڈیا اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ٹی وی نے نہ صرف اردو کو اطلاعاتی ٹکنالوجی سے جوڑا ہے بلکہ اردو والوں کے لیے روزگار بھی پیدا کیا ہے۔ آج ٹی وی مفت میں ہزاروں اردو جاننے والوں کو روزگار فراہم کر رہی ہے۔ اردو چینلوں میں سیکڑوں کی تعداد میں اینکر، اسکرپٹ رائٹر، پروڈیوسر، ایڈیٹر، کیمرہ مین اچھی تنخواہ پر ملازمت کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف اردو چینلوں میں اردو جاننے والوں کی قدر و منزلت ہے ہندی چینلوں میں اچھی اردو جاننے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اینکر، وائس آرٹسٹ اور اسکرپٹ رائٹر کے طور پر ہندی اور انگریزی چینلوں میں اردو جاننے والوں کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ اگر چہ ٹیلی ویژن کا استعمال صحیح طریقے سے کیا جائے تو یہ ایک دلچسپ اور پر اثر میڈیم بن سکتا ہے۔ اپنی باتوں کو لاکھوں، کروڑوں لوگوں تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے اس سے تفریح بھی لی جاسکتی ہے کسی کی امیج کو بنایا بھی جاسکتا ہے۔ نوجوانوں کے ذہن کو صحیح سمت کی طرف موڑا جا سکتا ہے، اسی لیے ٹیلی ویژن کے ساتھ جڑے لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ جن سے ہمارے ملک کی روایت مزید مستحکم اور آپسی روا داری کو بڑھاوا ملے گا۔

بالآخر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹیلی ویژن نے اردو کی ادبی دنیا میں بہت کارآمد کام انجام دیے ہیں۔ جیسے کہ بہت سے پروگراموں کو نشر کرتے ہوئے ہمارے سامعین حضرات اور ناظرین کی توجہ اردو زبان و ادب کی طرف مبذول کیا۔ ٹیلی ویژن کی بدولت بہت سے پروگرام جیسے ایک ملاقات، کاروان، خاص بات، آؤ اردو سیکھیں، حالات حاضرہ کے پروگرام، انٹرویو، سبق، غزل سرا اور محراب غزل کے ساتھ ساتھ بارہ گھنٹے کی خبریں بھی نشر کرتے ہیں۔ یہ صرف ٹیلی ویژن کے اردو چینلوں اور نجی چینلوں کی بدولت سارے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ اس طرح سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ٹیلی ویژن ایک نہایت طاقت ور ذرائع ابلاغ ہے جس نے وقت وقت پر اردو زبان و ادب کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

کتابیات

(1) اطہر ڈاکٹر تنزیل: الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2016
(2) حسین ڈاکٹر محمد شاہد: ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2004
(3) حسین محمد شاہد: اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ، اردو اکادمی، دہلی 2013،
(4) خواجہ اکرام الدین: اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2014
(5) خواجہ اکرام الدین: اکیسویں صدی میں اردو کا فروغ اور امکان، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2014
(6) سمیع الرحمٰن: ٹی وی نیوز پروڈکشن فن اور طریقۂ کار، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2014
(7) شاداب زبیر: ریڈیو نشریات: تاریخ اصناف اور پیش کش، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 2008
(8) صدیقی کمال احمد: اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2011

رسائل و جرائد:
(1) اردو دنیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی 2008
(2) شیرازہ (اردو کانفرنس نمبر)، کلچرل اکیڈمی سرینگر، 2017
(3) ایوان اردو، اردو اکادمی دہلی 2016

ویب سائٹس:
1. http://pmindia.nic.in/speech/
2. www.dishtv.in/Resources/zee-salaam
3. www.bbcurdu.com
4. www.ddindia.gov.in

Manzoor Ahmad Mulla
Research Fellor, Depf of Persian Urdu & Arabic
Punjabi University, Patiala - 147002 (Punjab)

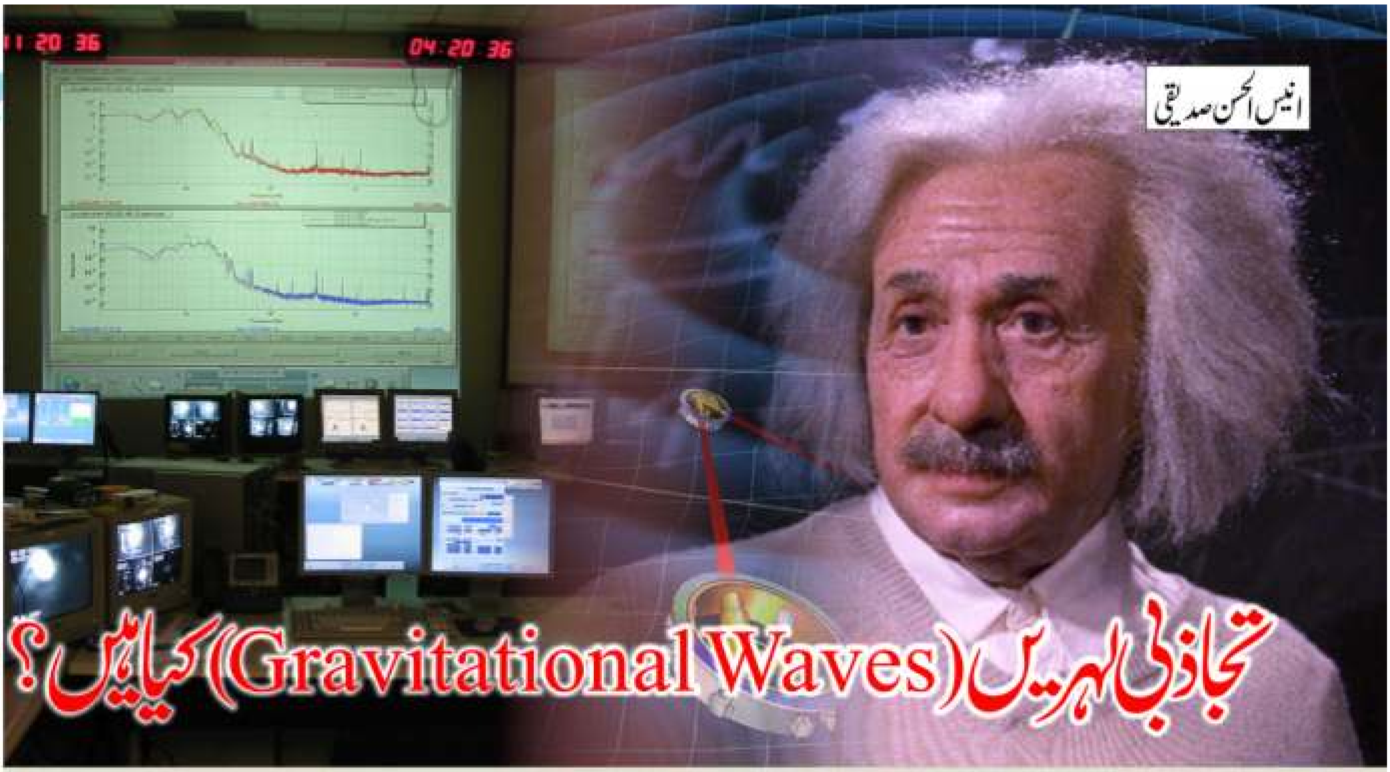

تجاذبی لہریں (Gravitational Waves) کیا ہیں؟

انیس الحسن صدیقی

تجاذبی لہروں کے بارے میں آج کل تقریباً تمام رسالوں اور اخباروں میں خوب تذکرہ ہو رہا ہے۔ اکیسویں صدی یعنی سائنس اور تکنیک کی صدی میں امسال تین مشہور سائنس دانوں کو اس سلسلے میں نوبل پرائز سے نوازا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر تجاذبی لہریں کیا ہیں؟ اس سے پہلے کہ یہ جانا جائے کہ تجاذبی لہریں کیا ہیں؟ ہمیں یہ جاننا ضروری ہوگا کہ ثقل (Gravity) یعنی زمینی کشش کیا ہے؟

دراصل، ثقل یا کشش ارض، وہ پراسرار طاقت ہے جو ہر چیز کو ہماری زمین کی طرف کھینچتی ہے۔ تجربات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہر جسم اپنی کشش رکھتا ہے اور اپنی طاقت کے حساب سے چیزوں یا اجرام کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یعنی دیگر زیادہ طاقت والا جسم کم طاقت والے جسم کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تجربات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کچھ اجرام جیسے کرۂ ارض، چاند، سورج و دوسرے خلائی اجرام کے مقابلے میں زیادہ کشش رکھتے ہیں۔ ایک جرم کتنی کشش ثقل کا حامل ہے یہ اس پر منحصر ہے کہ اس کا حجم کیا ہے۔ خاص طور پر کہ اس کے مادہ کی مقدار کیا ہے اور وہ دوسرے جسم سے کتنا نزدیک ہے۔ جتنا وہ نزدیک ہوگا اُس کی اُتنی ہی زیادہ کشش ثقل ہوگی۔ یہاں ہمیں کشش ثقل سمجھنے کے لیے وزن اور مادہ میں فرق سمجھنا ہوگا۔ وزن اور مادہ میں کیا فرق ہے؟ ایک جسم کا وزن اُس کی کشش ثقل کی طاقت پر منحصر ہوتا ہے یعنی کرۂ ارض ہم کو اپنی سطح کی طرف کتنی مضبوطی سے کھینچ رہا ہے۔ ہمیشہ وزن ایک جیسا نہیں رہتا ہے۔ زمین کی سطح سے جتنا اوپر یعنی دور جاتے جائیں گے ہمارا وزن کم ہوتا جائے گا۔ اسی لیے ایک خلا باز کا وزن خلا میں کم ہو جاتا ہے اور چاند اور چونکہ چاند پر اس کا ثقل کم ہے اس لیے اُس کی کشش بھی کم مادہ کا مطلب ہے کہ کسی بھی جسم میں کتنا خام مال یعنی کمیت (Mass) ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں کتنے مادّی ذرات موجود ہیں یعنی الیکٹران (e)1، پروٹان 2(p) اور نیوٹران 3 (n) ہیں۔ چونکہ الیکٹران (n) اور پروٹان (p) کے مقابلے میں ازحد کم کمیت رکھتے ہیں اس لیے مادہ کی مقدار (n) اور (p) کی تعداد ہی بتاتی ہے۔ اس لیے کسی بھی چیز کے مادہ کی کمیت خلا میں، چاند یا مریخ سیارہ کی سطح پر وہی رہے گا جو کرۂ ارض پر تھا۔

ثقل ہماری روزمرہ کی زندگی میں بہت اہم ہے۔ اسی کے ذریعے ہم کرۂ ارض پر آباد ہیں اور خلا میں لڑھکتے یا گرتے نہیں۔ اسی لیے کرۂ ارض کا درجہ حرارت نہ تو زیادہ گرم اور نہ ہی ٹھنڈا ہے۔ کرۂ ارض پر ثقل کی وجہ سے تمام پیڑ پودے اور جاندار زمین کی سطح پر رہتے ہیں اور اُن پر پھل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اور وہ پکنے کے بعد زمین پر ہی گرتے ہیں۔ چاند کی کشش یعنی اپنے ثقل کے ذریعے سے سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے۔ چاند پر اُس کا ثقل کرۂ ارض کی نسبت ایک چوتھائی ہے۔ لہٰذا چاند پر ہمارا وزن ایک چوتھائی ہوتا ہے۔ سیارہ مریخ پر ثقل کم ہے۔ اگر کسی جسم کا وزن کرۂ ارض پر 100 کلوگرام ہے تو سیارہ مریخ پر اُس کا وزن بہ نسبت کم ہے۔

دراصل کیونکہ اُس کی کمیت (Mass) زمین کے کسی بھی سیارے پر پہنچنے سے پہلے اُس کے ثقل کا حساب لگانا ہوگا اور جس کے لیے ہمیں کسی بھی خلائی جرم کا مادہ (Mass) جاننا ضروری ہوگا۔ جس خلائی جرم کا جتنا زیادہ مادہ ہوگا اتنا ہی زیادہ اُس کا ثقل ہوگا۔ انگریز سائنسداں اسحاق نیوٹن (Is saq Newton) (17ویں صدی) نے سب سے پہلے ریاضی کے ذریعے اجسام کی کشش کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اُن کا نظریہ ''نیوٹن کا کلیہ یا قانون تجاذب'' (Law of Gravitation) کہلاتا ہے۔ 1916 میں جرمنی کے مشہور سائنسداں البرٹ آئن اسٹائن (Albert Einstein) کے اس نظریے کو اور آگے بڑھایا جسے 'نظریہ اضافت' کہتے ہیں۔ (بحوالہ مضمون ''کشش ثقل کیا ہے؟'' مصنف انیس الحسن صدیقی شائع سائنس اردو ماہنامہ شمارہ اگست 2017) (صفحات 50 تا 52)۔

اب ہم اپنے عنوان 'تجاذبی لہریں کیا ہیں؟' کے متعلق بتانا چاہیں گے۔ لگو4 (L.I.G.O.) یعنی لیزر تداخل پیما تجاذبی رصدگاہ) نے اپنے ایک مضمون ''تجاذبی لہریں کیا ہیں؟'' انٹرنیٹ کے ذریعہ بتاریخ 6 اکتوبر 2017 کو شائع کیا ہے:

''بیسویں صدی سے ہی بہت ہی زیادہ نفیس ترین دوربینوں اور آلات کے ذریعے خلائی اجرام کے بارے میں روز بہ روز نئی نئی دریافتیں ہوتی ہیں۔ دودھیا کہکشاں (Milky way Galaxy) جس میں ہمارا سورج مع اپنے سیاروں کے موجود ہے اور جس کو نظام شمسی (Solar System) کہتے ہیں اس کہکشاں میں تقریباً 200 کروڑ ستارے مع اپنے انفرادی نظاموں کے موجود ہیں۔ ان ستاروں کی ماہیت میں ایک طرح کا ارتقا (Evolution) ہوتا رہتا ہے۔ انہی ارتقا کی بنا پر ستارے پھٹ بھی جاتے ہیں اور چھوٹے ٹکڑوں میں بکھر جاتے ہیں۔ البرٹ

آئین اسٹائین نے 1916 میں ہی اپنے نظریہ اضافت (General Relativity) کی بنا پر تجاذبی لہروں کی بھی پیشن گوئی کی تھی۔ انھوں نے اپنے نظریہ اضافت میں ریاضی کی مدد سے یہ ثابت کیا کہ زیادہ مادّہ رکھنے والے (Massive) اور سریع الحرکت (Accelerating) ستارے جیسے نیوٹرون ستارے یا کال کوٹھریاں (Black Holes) ایک دوسرے کے گرد گردش کرتے ہوئے مکاں اور زماں (Space-time) کی 'چادر' (Fabric) کو اس طرح منتشر کر سکتے ہیں کہ خلا میں تجاذبی لہریں پیدا ہو سکتی ہیں جس طرح پانی سے بھر پور تالاب میں ایک پتھر پھینکنے سے اُس کے پانی میں چھوٹی لہریں (Ripples) پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح کائنات میں روشنی کی رفتار سے سفر کرنے والی اور اپنے ساتھ اپنے طوفانی منبع کی طبعیاتی معلومات سے بھر پور تجاذبی لہریں، زماں و مکاں کی 'چادر' میں وہ چھوٹی لہریں ہیں جو کائنات میں انتہائی شدید اور لامتناہی توانائی کے عمل سے پیدا ہوتی ہیں۔ حالانکہ تجاذبی لہروں کے موجود ہونے کی نظریاتی پیشن گوئی 1916 میں کی گئی تھی لیکن اُن کے موجود ہونے کا عملی ثبوت 1974 تک نہیں مل سکا تھا۔ اس سال دو ماہر فلکیات جو ریڈیائی رصدگاہ (Arecibo in Puerto Rico) میں کام کر رہے تھے انہوں نے دریافت کیا کہ ایک پلزار 6 کے جوڑے (Binary pulsar) جو بہت ہی کثیف اور بھاری ستاروں پر مشتمل ہیں اور ایک دوسرے کے گرد گردش میں ہیں اُن کا نظام بالکل اسی قسم کا ہے جو نظریہ اضافت کے مطابق تجاذبی لہروں کو پیدا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ دریافت آئین اسٹائین کی پیشن گوئی کو جانچنے کے لیے استعمال ہو سکتی ہے، اُن فلکیاتی ماہرین نے ستاروں کی گردش کا وقفہ جو مستقل (Constant) نہیں تھا اور تبدیل شدہ تھا اس کو ناپنا شروع کیا۔ آٹھ سالوں کے مشاہدات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ستارے نظریہ اضافت کی پیشن گوئی کی گئی رفتار کے مطابق ایک دوسرے کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نظام کو 40 سالوں تک مانیٹر یعنی مشاہدوں کے ذریعے کیا گیا۔ ان ستاروں کے محور میں تبدیلیاں نظریہ اضافت کے بالکل مطابق معلوم ہوئیں کہ اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ یہ پلزاروں کا نظام ہی تجاذبی لہروں کا مخرج ہے۔ اُن معلومات سے بہت پہلے اُن فلکیاتی ماہرین نے پلزار کی ریڈیائی لہریں (Pulsar Radio Emissions) کے اوقاف (Periods) کا بھی مطالعہ کیا تھا جن کی بنا پر مزید تجاذبی لہروں کے موجود ہونے کی تصدیق کی تھی لیکن یہ تصدیق ہمیشہ بلا واسطہ (Indirect) ریاضی کے ذریعے سے حاصل ہوتیں بالواسطہ طبعیاتی مشاہدے سے حاصل ہوئیں۔

14 ستمبر 2015 کو لیزر تداخل پیما تجاذبی رصدگاہ نے پہلی مرتبہ طبعیاتی عمل سے خود زماں و مکاں میں انتشار پیدا کرتی ہوئی تجاذبی لہروں کا مشاہدہ کیا کہ یہ لہریں دو کال کوٹھریوں (Black Holes) کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئی تھیں اور جو 1.3 ارب نوری سالوں کی دوری پر پائی گئی تھیں۔ لیزر تداخل پیما تجاذبی رصدگاہ میں ان تجاذبی لہروں کی یہ دریافت تاریخ میں ایک سب سے بڑے انسانی سائنسی کارنامے کی مصداق ہیں۔

اس سلسلے میں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ تجاذبی لہریں، کرۂ ارض کے پہنچنے تک لاکھوں گنا چھوٹی ہو جاتی ہیں اور کم طاقت والی ہوتی ہیں جبکہ وہ طاقتور رہی ہو سکتی ہیں۔ حقیقت میں پہلے تجربہ کے وقت جب تجاذبی

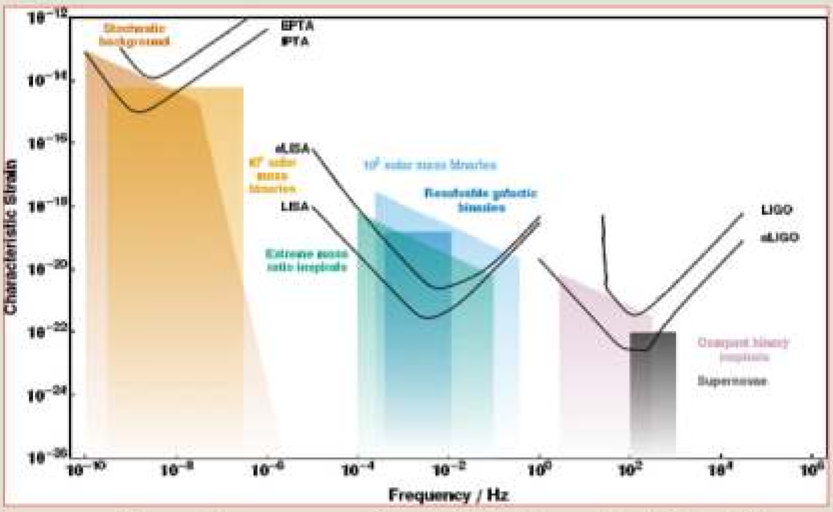

لہریں ریڈیائی رصدگاہ پہنچیں تو زماں و مکاں کی متغیرہ (Variable) مقدار جو انہوں نے پیدا کیں وہ ایک ایٹم کے مرکزے (Neuclus) سے ہزاروں گنا چھوٹی تھیں! ایسی ہی ناقابل تصور خُرد ترین پیائش ہیں جن کے لیے ریڈیائی رصدگاہ کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔

11 فروری 2016 کو ریڈیائی رصدگاہ سے اعلان کیا گیا کہ براہ راست پہلی تجاذبی لہر کا ستمبر 2015 کو مشاہدہ کیا گیا۔ اُن لہروں کا دوسرا مشاہدہ 26 دسمبر 2015 کو کیا گیا لیکن جس کا اعلان 15 جون 2016 کو کیا گیا۔ Wikipedia نے تجاذبی لہروں کے بارے میں اس طرح لکھا ہے:

''تجاذبی لہروں کا مشاہدہ کرنے کے لیے بہت سے نئے سائنسی اداروں کے تعاون کی ضرورت پڑی۔ زمینی سطح سے دریافت کرنے والا ایک عالمگیر نیٹ ورک ہے۔ تجاذبی لہروں کا مشاہدہ ایک بین الاقوامی اشتراک سے حاصل ہوا جو کہ امریکہ، یورپ، جرمنی اور جاپان پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر ترپاماسیرامنین، مصنف مضمون ''ہندوستان کے انعامات: فلائی کپس، تجاذبی ریڈیائی رصدگاہ میں شرکت:...... (ملاحظہ ہو انڈین ایکسپریس بتاریخ 11 اکتوبر، 2017 شائع ہوا) لکھتی ہیں:

''امسال طبعیات، عضویات اور کیمیا کا نوبل انعام یافتہ کا ہندوستانی سائنسدانوں اور اُن کے اداروں سے گہرا تعلق رہا ہے۔ امسال تین عالمی سائنسدانوں کو 2017 کا علم طبعیات نوبل انعام اور جاذبی لہروں کے مشاہدوں کے لیے عطا کیا گیا ہے۔ وہ ہیں Dr. Rainer Weis، Dr. Barry C. Barish اور Dr. Kips S. Thorne۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ 37 ہندوستانی سائنسداں اور ہندوستان کے متعدد سائنسی اداروں نے جیسے ادارۂ ریاضی (مدراس)، بین الجامعات ہیئت اور طبعیات کا مرکز (پونہ) اور دیگر سائنسی ادارے جو بنگلور، گاندھی نگر، ونتھا پورم، اندور میں واقع ہیں۔ یہ سب ادارے بھی تجاذبی لہروں کی رصدگاہ کے پروگرام میں شریک رہے ہیں۔

خلائی سائنس میں ایک 'نئے دور کی' پیدائش پر ڈاکٹر پراتک کانجی لال (Dr. Pratik Knjilal) نے اپنے ایک مضمون ''نیوٹرون ستاروں کے انضمام، بھاری کیمیائی عناصر کی فیکٹریاں ہیں، اب تصدیق ہو گئی ہے'' جو انڈین ایکسپریس اخبار بتاریخ 17 اکتوبر میں شائع ہوا ہے لکھا ہے:

''ایک تجاذبی لہر ایک چھوٹی لہر ہے جو زماں و مکاں

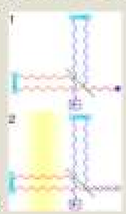

کی چادر کو منتشر کر رہی ہے۔ لفظی معنی میں کائنات میں خود پیدا ہوتی ہیں جب بھاری اجسام بہت ہی تیزی سے اسراع (Accelarating) کرتے ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ ایسا واقعہ بجائے جانچنے کے دیکھا گیا ہے اور متعدد دوربینوں کی مدد سے مدار زمین میں واحد منبع کی پہچان کے لیے مقابلہ کیا گیا ہے۔"

ڈاکٹر ایلنا پیان (Dr. Elena Pian) ایک اطالوی عالمی فلکی طبعیات 'قدرت' میں تازہ شائع ہونے والے مؤقر مقالوں کی ایک رہنما مصنف خود کو خلائی سائنس میں 'نئے دور' کی پیدائش کی شہادت پر خوش قسمت سمجھتی ہیں:

"پہلی مرتبہ ہم نے بصری/نزدیکی زیر سرخ شعاعیں (Infrared) طول موج میں شعاع افشانی بحثیت ایک تجاذبی لہروں کے منبع کے جانچی گئیں۔ یہ پہلے واضح ثبوت کی طرف لے جاتا ہے کہ انضمام نیوٹران ستارے بھاری عناصر کی فیکٹریاں ہیں۔"

3 اکتوبر 2017 کو لیزر تداخل پیا تجاذبی رصدگاہ کے بانی ڈاکٹر ریز ویس (Dr.Rainer Weiss)، ڈاکٹر بیری سی بیرش (Dr.Barry C. Barish) اور ڈاکٹر کپ ایس تھورنے (Dr. Kip S. Thorne) کو علم طبعیات میں نوبل پرائز سے 2015 میں تجاذبی لہریں جو دو کال کوٹھریوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئی تھیں اُن کو جانچنے کے لیے نوازہ گیا۔

اسی عرصے میں اسال اگست میں لیزر تداخل پیا تجاذبی رصدگاہ اور اٹلی میں ورگو مشاہدہ گاہوں دونوں نے ایک ساتھ دو نیوٹرون ستاروں، جن کو GW170817 کا خطاب دیا گیا تھا، کے طوفانی انضمام سے لہروں کو جانچا۔ اس کے فوراً بعد فرمی خلائی دوربین (Fermi Space Telescope) نے خلا میں اس علاقے سے گاما شعاعوں کے نکلنے کی جانچ کی تھی جو کہ بھاری ستاروں کے ٹکرانے کی تصدیق تھی۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ دونوں ہی ایک تھے؟

یورپی خلائی تنظیم نے اپنے اور اپنے سے شریک تنظیموں کی مدد سے طبعیاتی منابع کو ایک منظم ترتیب دی ہے۔ جوں ہی جنوبی امریکہ میں رات ہوئی چلی (Chile) میں اُس کی مشہور دوربینوں نے کہکشاں NEC4993 کی روشنی کے منبع کی صحیح جگہ کو ہائیڈرا جھرمٹ (Hydra) میں معلوم کیا۔ جیسے ہی رات ہوئی ہوائی (Hawai) میں اشارہ لیا گیا اور اسی ہفتوں کے دوران تقریباً 70 مشاہدہ گاہوں نے کھلا ہوا واقعہ دیکھا جب وہ کرۂ ارض کے اندھیرے والی طرف تھے۔ ہبل خلائی دوربین نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ مشاہدوں نے 130 نوری سالوں دور برقی مقناطیسی منبع جو کہ GW170817 کے فاصلے سے میل کرتا ہے۔ جب نیوٹرون ستارے ایک کلو نووا (Kilonova) سے ٹکراتا ہے تو گاما شعاعوں کا جھرمٹ منتشر (Burst) ہوتا ہے اور تجاذبی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔

کلونووا ایک نئے ستارہ کو کہتے ہیں جو عام ستارہ کی نسبت 1000 گنا چمکدار ہوتا ہے۔ اس کی پیشن گوئی تیس سال پہلے ایک نظریاتی واقعہ (Event) کے دوران کی گئی تھی۔ کلونووا کی موجودگی 30 سالوں پہلے ایک نظریاتی واقعہ (Event) کے دوران پیشن گوئی کی گئی تھی۔ دونوں واقعات کی اب مشاہدہ کے ذریعے تصدیق ہوگئی اور واحد واقعہ کی حیثیت سے ایک منبع کی پہچان ہوئی۔

ایسے واقعات کائنات میں پیدا ہونے اور لوہے سے زیادہ بھاری دھاتیں جو قیمتی دھاتیں سونا، چاندی اور پلاٹینیم پر مشتمل ہیں اُن کے خارج ہونے کا یقین کیا جاتا ہے۔ طیفی مشاہدوں سے اب نیوکلونو سنتھیسس (Neucleosynthesis) جیسے اعمال کی تصدیق کی جاتی ہے اور بذریعہ کلونووا کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ قیمتی اور صنعتی اعتبار سے کیمیائی عناصر کی مرتب جدول کے مطابق کارآمد دھاتیں ہیں۔ غیر معمولی طور پر اس بڑے تجربہ نے خلا میں مختلف قسم کی تصویروں کے حامل واقعات اور اجرام کے درمیان مطابقت پیدا کی ہے۔ یہ کہا جارہا ہے کہ "مختلف قسم کی دوربینوں اور جدید آلات جیسے تداخل پیا (Interferometer) اور برقی مقناطیسی سہولیات (بصری اور ریڈیائی دوربینوں اور گاما اور ایکسرے سیارچوں) کے ذریعے فلکی طبعیات آج کے دور میں کی جاسکتی ہے۔" ایسے ہی منابع، نیوٹران ستاروں کے ضم ہونے کی جانچ تجاذبی لہروں کی رصد گاہوں میں کی گئی ہے۔ ایک چھوٹی گاما شعاع کا انتشار بھی اسی کے ساتھ ساتھ فرمی سیارچہ (Fermi Sattelite) پر لدے ہوئے آلات کی مدد سے معلوم ہوئی تھی اور ایک بصری/نزدیکی زیریں سُرخ منبع کی جانچ بذریعہ بڑے میدانی دوربین کی مدد سے فوٹوگرافر نے کی تھی۔ اس وقت تب بحثیت ایک کلونووا (Kilonova) کی شناخت اور خاصیت طیف (Spectrum) پیمائی کے ساتھ خاص طور پر وی ایل ٹی (VLT) اور ایکس شوٹر (X-Shooter) طیف نگار جو طیف کو مع ایک اور خاصیت کے تمام بالائی بنفشائی (Ultra Violet) سے زیریں سرخ طیف (Infrared Spectrum) تک لے جاتا ہے کے ذریعے بیان کی گئی تھی۔"

"ظاہری طور پر کلونووا (Klonova) کے اخراج (Emission) سے دھات کے طیف کا مکمل طور سے میڈیلیف جدول (Mendelieef Table) کی مدد سے نقشہ بنایا جاسکتا ہے بعد اس کے کہ بہتر نظریاتی نمونوں کی نشوونما کی گئی ہو لیکن یوروپ کی خلائی تنظیم کے تجربہ نے ایک بہت ہی ضروری اصول قائم کیا ہے کہ اب آسمان میں مختلف طیفی رصدگاہوں اور آلات کے ذریعے سے دلچسپ اور انوکھے تجربات سے نتیجہ اخذ کیے جاسکتے ہیں۔"

حواشی

1۔ الیکٹران (Electron)۔ منفی برق کا حامل ایک مستقل بنیادی ذرہ جو ہر ایٹم میں پایا جاتا ہے۔
2۔ پروٹان (Proton)۔ ایک مثبت بار کا حامل ذرہ ہے۔
3۔ نیوٹران (Neutron)۔ وہ جوہری ذرہ جس کی کمیت پروٹان کے تقریباً برابر ہوتی ہے لیکن اس کا برقی بار صفر ہے۔ یہ تمام ایٹمی مرکزوں میں موجود ہوتا ہے ماسوائے ہائیڈروجن کے۔
4۔ لگو۔ یہ انگریزی میں مخفف ہے (L.I.G.O.) یعنی (Laser Interferometer Gravitational Observatory جس کا اردو ترجمہ ہے لیزر تداخل پیا تجاذبی رصدگاہ۔
5۔ نیوٹران ستارے۔ نیوٹران سے بنے بھاری اور کثیف ستارے جو مستقل برق و مقناطیسی پلز خارج کرتے رہتے ہیں۔
6۔ پلزار (Pulsar) دراصل ایک قسم کے دو نیوٹرون ستارے ہیں جو ایک دوسرے کے گرد تیز رفتار سے گردش کرتے ہیں اور جن سے ریڈیائی لہروں کے علاوہ برق و مقناطیسی (Electro-magnetic) لہریں خارج ہوتی ہیں۔

کتابیات

1۔ مصنف، ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ آر۔ انصاری، ہندو ایران میں ہندو دانشوروں کی سائنسی تحریریں، انڈین جرنل آف ہسٹری آف سائنس، نئی دہلی۔
2۔ مصنف، انیس الحسن صدیقی، "کشش ثقل کیا ہے؟"، سائنس، اردو ماہنامہ، نئی دہلی، شمارہ اگست، 2017، صفحات 50 تا 52۔
3۔ مصنف ڈاکٹر نیرو پاما سبرامنین "دی انڈین ایکسپریس، نئی دہلی بتاریخ 11 اکتوبر 2017۔ 'دی 2017 نوبل پرائزز اور ہندوستان' عنوان کے تحت 'ہندوستان کے پرائزز: فلائی لیمس "تداخل پیا تجاذبی رصدگاہ میں شرکت ...." صفحہ 16
4۔ مصنف ڈاکٹر پیٹرک کاتھی لال، "نیوٹران ستارے، بھاری کیمیائی عناصر کی فیکٹریاں ہیں، اب تصدیق ہوگئی ہے۔" دی انڈین ایکسپریس، نئی دہلی، بتاریخ 17 اکتوبر، 2017، صفحہ 16۔
5۔ مضمون 'کائنات کا مشاہدہ کرتے ہوئے' عنوان کے تحت 'جب ستارے ٹکراتے ہیں' دی انڈین ایکسپریس، نئی دہلی بتاریخ 27 اکتوبر 2017، صفحہ 23 (جملہ حقوق بشکریہ دی اکنومسٹ نیوز پیپر لمیٹڈ 2017)

A.H. Siddiqui
679, Sector-22B
Gurgaon- 122015 (Haryana)
Mob.:9654949434

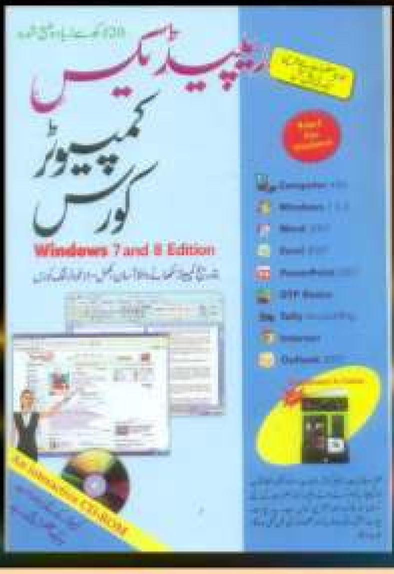

ونڈوز 7 کو موافق بنانا
Customizing Windoews 7

اس باب میں ہم ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کو صارف (یوزر) کے لیے موافق بنانے والی کچھ باتیں بتائیں گے، جیسے ٹاسک بار، ڈسپلے، ماؤس وغیرہ کی سیٹنگ بدلنا، شارٹ کٹ بنانا، ایک ہی فائل میں مختلف قسم کی اطلاعات کو جمع کرنا وغیرہ۔

ٹاسک بار کی شکل بدلنا (Changing Appearance of Task Bar)

ٹاسک بار ہمیں سبھی فعال (Active) پروگراموں

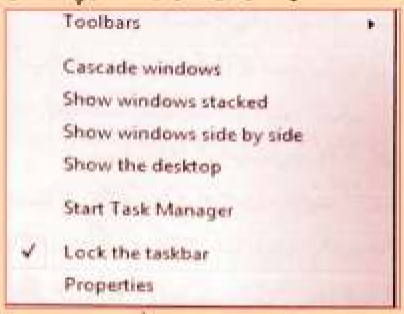

تصویر W-6.1: ٹاسک بار کا کانٹیکسٹ مینو

پر فوراً پہنچنے کا موقع عطا کرتا ہے۔ اس میں سبھی کھلے ہوئے پروگراموں کا ایک ایک باکس نظر آتا ہے۔ ہم کسی بھی باکس کو کلک کرکے فوراً اس پروگرام کی ونڈو میں پہنچ سکتے ہیں۔ ہم اسے اپنی ضروریات کے اور زیادہ موافق بنا سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں ٹاسک بار کی سیٹنگ کو درست کرنا چاہیے۔ یہ کام درج ذیل طریقے سے کیا جاسکتا ہے:

1۔ ٹاسک بار کی کسی بھی خالی جگہ پر رائٹ کلک کیجیے۔ کانٹیکسٹ مینو (Context Menu) کھل جائے گا۔

2۔ مینو میں پراپرٹیز (Properties) آپشن پر کلک کیجیے۔ 'Taskbar and Start Menu Properties' کا ڈائیلاگ باکس تصویر W-6.2 کی طرح کھل جائے گا۔

اس ٹیب شیٹ میں ٹاسک بار کی سیٹنگ کے لیے تین چیک باکس (Check Boxes) دیے جاتے ہیں۔ ان کا تعارف اور استعمال درج ذیل ہے:

(i) **Lock the Taskbar**: اس چیک باکس میں

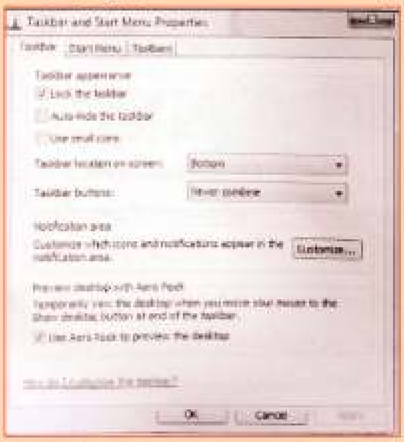

تصویر W-6.2: ٹاسک بار پراپرٹیز کا ڈائیلاگ باکس

کلک کرکے آپ ٹاسک بار کو تالا لگا سکتے ہیں، یعنی اسے ایک ہی جگہ پر محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے کبھی غلطی سے ماؤس کلک ہوجانے پر بھی ٹاسک اپنی جگہ اور سائز نہیں بدلے گا۔

(ii) **Auto-hide the taskbar**: اس چیک باکس سیٹ کرنے سے ٹاسک بار چھپ جاتا ہے، لیکن جہاں ٹاسک بار تھا یا ہونا چاہیے تھا، وہاں ماؤس پوائنٹر آنے پر فوراً نظر بھی آنے لگتا ہے۔ یہ سہولت اس لیے دی گئی ہے کہ آپ اسکرین کے زیادہ سے زیادہ حصے کا استعمال کرسکیں۔

(iii) **Use small icons**: اس چیک باکس کو سیٹ کرنے سے ٹاسک بار کے آئیکان چھوٹے ہوجاتے ہیں۔ یہ سہولت اس لیے دی گئی ہے، تاکہ آپ ٹاسک بار پر زیادہ سے زیادہ آئیکان جوڑ سکیں۔

اس ڈائیلاگ باکس میں دو ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس بھی دیے گئے ہیں۔ اس ڈراپ ڈاؤن باکس کو کلک کرنے پر مینو کھلتا ہے، جس میں سے آپ کوئی بھی ایک آپشن چن سکتے ہیں:

تصویر W-6.3: ڈراپ ڈاؤن باکس

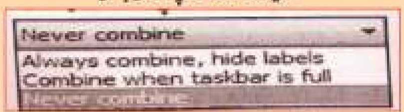

تصویر W-6.4: ڈراپ ڈاؤن باکس

(i) **Taskbar Location on Screen**: اس باکس کے آپشن کے ذریعے آپ اسکرین پر ٹاسک بار کی

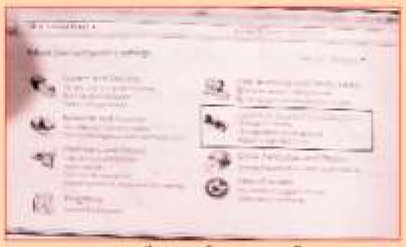

تصویر W-6.5: کنٹرول پینل ونڈو

جگہ بدل سکتے ہیں، جیسے کہ نیچے (Bottom)، بائیں طرف (Left)، دائیں طرف (Right) یا اوپر (Top)۔

(ii) **Taskbar Buttons**: اگر ایک پروگرام کی کئی ونڈو کھلی ہوں، تو ان سبھی ونڈو کے ٹاسک بار پر الگ الگ بٹن بن جاتے ہیں۔ اس باکس میں دیے گئے آپشن کے ذریعے آپ یہ چن سکتے ہیں کہ ایک پروگرام کئی ونڈو کے بٹنوں کا یا تو ایک مجموعہ بنے اور مجموعہ کا ایک ہی بٹن دکھائی دے یا پھر وہ سبھی بٹن الگ الگ نظر آئیں۔ آپ ٹاسک

بار پراپرٹیز کے ڈائیلاگ باکس میں اپنی خواہش کے مطابق آپشن کو سیٹ یا ری سیٹ کیجیے۔ ایک بار کلک کرنے پر آپشن سیٹ ہوجاتا ہے۔ دوسری بار کرنے پر ری سیٹ ہوجاتا ہے۔ اخیر میں 'OK' بٹن کو کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ٹاسک بار کی شکل آپ کی پسند کے مطابق بدل گئی ہے۔

ٹاسک بار کے دائیں طرف کی جگہ کو نوٹیفکیشن ایریا (Notification Area) کہا جاتا ہے۔ اس جگہ میں کمپیوٹر سے جڑے کئی نشان دکھائی دیتے ہیں، جیسے کہ وقت اور تاریخ، انٹرنیٹ کنکشن کا نشان، بیٹری چارجنگ کا نشان وغیرہ۔ تصویر W-6.2 میں 'کسٹمائز' (Customize) بٹن دبا کر اسے منتخب کرسکتے ہیں کہ ٹاسک بار پر کون سے نشان دکھائی دیں۔

اسکرین کی شکل بدلنا (Changing Appearnce of the Screen)

اسکرین آپ کے کمپیوٹر کا وہ حصہ ہے، جس پر آپ

تصویر W-6.6: اپیرنس اور پرسنلائزیشن ونڈو

کی آنکھیں لگاتار لگی رہتی ہیں۔ آپ کی آنکھوں کے لیے اچھا ہوگا کہ اس میں دکھائی جانے والی اشیا، تصویر وغیرہ ان کے موافق ہوں۔ اس کے لیے درج ذیل کام کیجیے۔

1۔ ڈیسک ٹاپ پر اسٹارٹ مینو کے آئیکان کو کلک کریں۔ اسٹارٹ مینو میں دائیں طرف دیے ہوئے آپشنز میں سے کنٹرول پینل (Control Panel) کے بٹن کو کلک کریں۔

2۔ کنٹرول پینل (Control Panel) کی ونڈو کھل جائے گی۔ ونڈو میں دائیں حصہ میں 'Appearance and Personalization' نام کے آپشن پر کلک کریں۔

3۔ Appearance and Personalization

تصویر W-6.10: اسکرین سیور ڈائیلاگ باکس

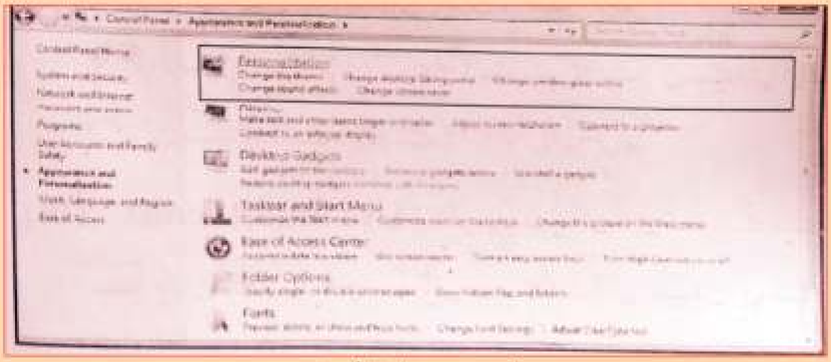

تصویر W-6.7: پرسنلائزیشن ونڈو

ونڈو پر کلک کرنے پر اسی نام کی ونڈو کھل جائے گی۔ اس ونڈو میں سب سے اوپر دیے ہوئے آپشن "Personalization' پر کلک کریں۔

4۔ Personalization ونڈو کھل جائے گی۔ اس ونڈو میں اسکرین کی شکل بدلنے کے مختلف طریقے دیے گئے ہیں۔

(i) **Desktop Background**: اس آپشن کے ذریعے آپ اسکرین پر دکھائے جانے والے بیک گراؤنڈ

کلک کریں، جسے آپ استعمال کرنا چاہتے ہیں اخیر میں سیو چینجز (Save Changes) بٹن پر کلک کریں۔ آپ کے ذریعے چنی گئی امیج یا تصویر ڈیسک ٹاپ پر آجائے گی۔

(ii) **Windos Color and Appearance**: اس آپشن میں آپ ونڈو کے مختلف عناصر (Components) اور ڈیسک ٹاپ کی صورت وشکل کی سیٹنگ کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ دی ہوئی متعدد سیٹنگ میں سے کسی ایک سیٹنگ کو چن کر لاگو کرسکتے ہیں یا پہلے سے چنی ہوئی سیٹنگ

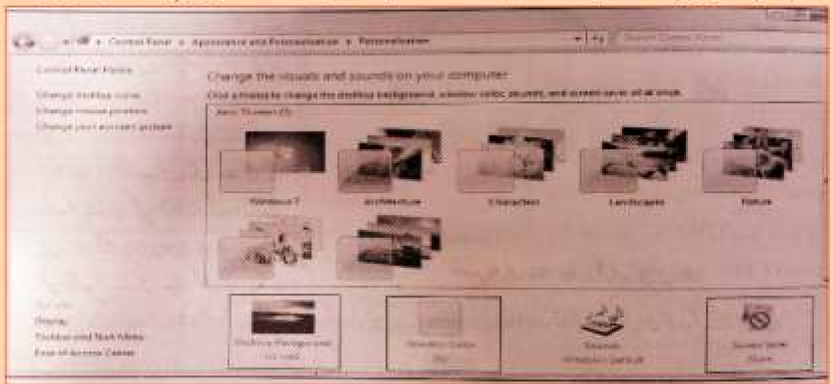

تصویر W-6.8: ڈیسک ٹاپ بیک گراؤنڈ ونڈو

اور اس پر وال پیپر (Wallpaper) چن سکتے ہیں۔ ونڈوز میں ان کے لیے کئی پیٹرن (Pattern) موجود ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ اپنے ڈیزائن یا تصویر بھی بنا کر استعمال کرسکتے ہیں یا پہلے سے بنی ہوئی تصویروں کو بھی وال پیپر کی طرح استعمال کرسکتے ہیں۔ بیک گراؤنڈ بدلنے کے لیے پرسنلائزیشن (Personalization) ونڈو میں ڈیسک ٹاپ بیک گراؤنڈ (Desktop Background) آئیکان پر کلک کریں، جس سے ڈیسک ٹاپ بیک گراؤنڈ (Desktop Background) ونڈو نظر آئے گی۔ (W-6.8)۔ کسی بھی امیج (Image) پر

میں خواہش کے مطابق رد و بدل کرسکتے ہیں۔ رنگوں کی سیٹنگ بدلنے کے لیے پرسنلائزیشن (Personalization) ونڈو میں ونڈو کلر (Window Color) کے آئیکان پر کلک کریں۔ ونڈو کلر اور اپیرنس (Window Color and Appeamance) ونڈو آجاتی ہے۔ (تصویر W-6.9)۔ مختلف رنگوں میں سے کسی بھی رنگ کو چنتے ہی آپ ونڈو اپنا

تصویر W-6.9: ونڈوز کلر اور اپیرنس ونڈو

رنگ بدل لیتی ہے۔ سیو چینجز (Save Changes) کا بٹن کلک کرتے ہی نئے رنوں کی سیٹنگ سیٹ ہو جاتی ہے۔ اس ونڈو میں آپ چنے ہوئے رنگ کی تیز چمک (Brightness) اور شفافیت دونوں ہی سیٹ کر سکتے ہیں۔

Screen Saver (iii): مانیٹر کو لمبے وقت تک کھلا رکھنا اس کی زندگی کی مدت کو کم کر دیتا ہے۔ اس لیے جب آپ

'Mous' نام کے آپشن کو کلک کریں۔ تصویر W-6.12 کی طرح ماؤس

تصویر **W-6.12**: ماؤس پراپرٹیز کا ڈائیلاگ باکس

ایک متعینہ وقت تک اس پر کام نہیں کرتے، تو ونڈوز اس وقت کی اسکرین کی اشیا کو صاف کر کے کوئی دوسرا پروگرام چلا دیتا ہے، جسے اسکرین سیور (Screen Saver) کہا جاتا ہے۔ ایسے پروگرام عموماً اسکرین پر کم سے کم اشیا رکھتے ہیں، تاکہ صرف یہ پتہ چلتا رہے کہ کمپیوٹر اب بھی کام کر رہا ہے۔ اسکرین سیور سیٹ کرنے کے لیے پرسنلائزیشن (Personalization) ونڈو میں اسکرین سیور (Screen Saver) ڈائیلاگ باکس نظر آئے گا (تصویر W-6.10)۔ اسکرین سیور کے ڈراپ ڈاؤن باکس کو کلک کرنے پر مینو کھلتا ہے، جس میں اسکرین سیور چننے کے مختلف آپشن ہوتے ہیں کسی بھی اسکرین سیور کو چن کر آپ پریویو (Preview) کا بٹن دبا سکتے ہیں، جس سے آپ اس اسکرین سیور کا پیش نظارہ کر پائیں گے۔ من چاہا اسکرین سیور چننے کے بعد 'OK' بٹن پر کلک کیجیے، جس سے اسکرین سیور سیٹ ہو جائے گا۔ ویٹ (Wait) آپشن کی مدد سے آپ وقت کو متعین کر سکتے ہیں، جس سے اتنے وقت کے بعد کمپیوٹر اسکرین پر اسکرین سیور دکھائی دینے لگے گا۔

ماؤس کی سیٹنگ بدلنا (Changing Settings of Mouse)

آپ پڑھ چکے ہیں کہ ونڈوز 7 میں ماؤس کے دونوں بٹنوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ اپنے ماؤس کو اپنی سہولت کے حساب سے سیٹ کر سکتے ہیں۔ ماؤس کی سیٹنگ کے لیے اسٹارٹ مینو کے ذریعے کنٹرول پینل کی ونڈو کھولیے (تصویر W-6.5) اور پھر بائیں طرف دیے گئے **'Hardware and Sound'** آپشن کو کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی **'Hardware and Sound'** ونڈو تصویر **W-6.11** کی طرح کھل جائے گی۔ اس ونڈو میں سب سے اوپر 'Devices and Printers' کا آپشن دیا گیا ہے۔ اس آپشن کے کئی ذیلی آپشن بھی دیے گئے ہیں۔ ان میں سے 'Mouse' نام کے آپشن کو کلک کریں۔ تصویر W-6.12 کی طرح ماؤس پراپرٹیز (Mouse Properties) کا ڈائیلاگ باکس آ جائے گا۔

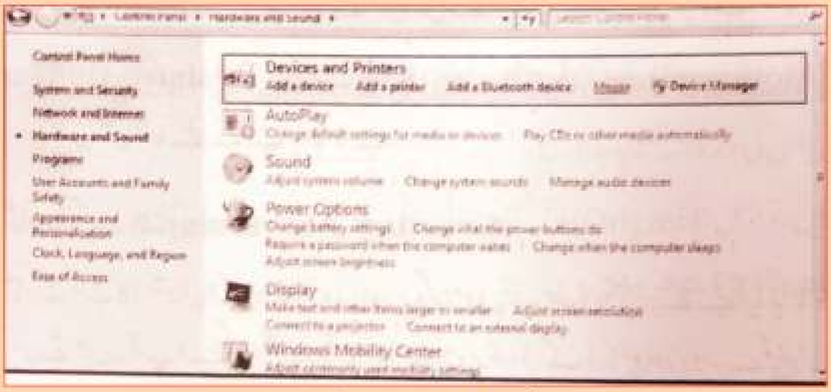

تصویر **W-6.11**: ہارڈ ویئر اور ساؤنڈ ونڈو

اس ڈائیلاگ باکس میں پانچ ٹیب شیٹ ہیں، جن میں سے بنیادی طور پر تین کو درج ذیل سیٹنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے:

Buttons: اس ٹیب شیٹ کا استعمال ماؤس کے بٹنوں کی سیٹنگ بدلنے میں کیا جاتا ہے۔ عام طور پر ماؤس کے بائیں بٹن کا استعمال عام انتخاب (Normal Select) اور عام کھنچاؤ (Normal Dragging) کے لیے اور دائیں بٹن کا استعمال کانٹیکسٹ مینو (Context Menu) اور خاص کھنچاؤ (Special Dragging) کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ دائیں ہاتھ سے کام کرنے والوں کی سہولیات کے لیے ہے، کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن، اگر کوئی صارف بائیں ہاتھ سے کام کرتا ہے، تو اس سیٹنگ کو الٹا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے Button Configuration کے تحت دیے گئے Switch primary and secondary buttons چیک باکس کو کلک کرنا چاہیے۔ اس سے دونوں بٹنوں کا استعمال آپس میں بدل جاتا ہے۔

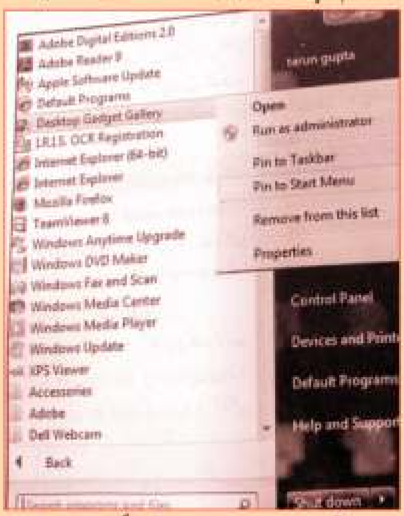

تصویر **W-6.14**: اسٹارٹ مینو میں پروگرام جوڑنا

اس ٹیب شیٹ کا استعمال ماؤس کی ڈبل کلک کرنے کی رفتار طے کرنے میں بھی کیا جاتا ہے۔ اگر آپ جلدی جلدی دو بار کلک کر سکتے ہیں، تو رفتار تیز (Fast) رکھیے اور اگر آرام سے کلک کرتے ہیں تو رفتار دھیمی (Slow) رکھیے۔ اس شیٹ میں سلائڈر (Slider) کو گھسیٹ کر زیادہ سے زیادہ انتظار (یعنی دو کلک کے درمیان کا وقفہ) کا وقت طے کیا جاتا ہے۔

Pointers: اس ٹیب شیٹ میں سیٹنگ کر کے آپ مختلف پوائنٹروں کی شکل بدل سکتے ہیں۔ اس میں 'Browse' بٹن کو کلک کر کے سبھی دستیاب کرسروں کی لسٹ دیکھی جا سکتی ہے، جن میں سے آپ اپنی پسند کے کرسر مختلف استعمال کے لیے منتخب کر سکتے ہیں۔

Pointer Options: اس ٹیب شیٹ کا استعمال ماؤس کی حرکت (Movement) کے ساتھ ساتھ اس کے پوائنٹر کی حرکت کی رفتار میں تال میل بٹھانے کے لیے کیا جاتا ہے۔

شارٹ کٹ بنانا (Creating Shortcuts)

شارٹ کٹ کا استعمال ایسی دستاویزوں اور پروگراموں تک جلدی پہنچنے کے لیے کیا جاتا ہے، جن کا آپ بار بار (یا کثرت کے ساتھ) استعمال کرتے ہیں۔ آپ اپنے کسی بھی پروگرام، دستاویز، پرنٹر، ڈسک ڈرائیو

اور دوسرے کمپیوٹر کے لیے بھی اپنے ڈیسک ٹاپ پر یا کسی بھی فولڈر میں شارٹ کٹ بنا سکتے ہیں۔ ایسا کرنے کے بعد جب بھی آپ کو اس آبجیکٹ کی ضرورت ہو، تو آپ اس کے شارٹ کٹ کو ڈبل کلک کرکے فوراً اس آبجیکٹ تک پہنچ سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر آپ کسی ایسی دستاویز کو کھولتے اور بند کرتے ہیں، جس کی اطلاعات روز ہی بدلتی رہتی ہیں، تو آپ اس کا شارٹ کٹ بنا کر اپنا کافی وقت بچا سکتے ہیں، کیونکہ تب آپ کو وہ دستاویز ڈھونڈنی نہیں پڑے گی اور ڈیسک ٹاپ پر اس کے شارٹ کٹ کو ڈبل کلک کرکے اسے کھول سکیں گے۔

شارٹ کٹ بنانے سے کسی فائل یا فولڈر کی جگہ نہیں بدلتی، بلکہ اسے فوراً کھولنے کی سہولت مل جاتی ہے۔ یہ زیادہ تر (یعنی بار بار) استعمال کی جانے والی چیزوں تک پہنچنے کا آسان طریقہ ہے۔

کیجیے، جس سے کانٹیکسٹ مینو کھل جائے گا۔

3۔ کانٹیکسٹ مینو میں 'Create Shortcut' ہدایت کو چنیے۔ ایسا کرنے سے اس جگہ پر اس آبجیکٹ کی ایک شارٹ کٹ فائل بن جائے گی۔ اس آبجیکٹ کو کھینچ کر ڈیسک ٹاپ پر لے آیئے۔ اب آپ کا شارٹ کٹ تیار ہے۔

شارٹ کٹ کا آئیکان اس آبجیکٹ کے اصل آئیکان جیسا ہی ہوتا ہے، لیکن اس میں بائیں طرف نیچے کی جانب ایک چھوٹے تیر کا نشان بھی ہوتا ہے، جس سے اسے پہچانا جاتا ہے۔ کسی آبجیکٹ کے شارٹ کٹ کو ڈبل کلک کرنے سے وہ آبجیکٹ یا فائل کھل جاتی ہے۔ اگر شارٹ کٹ کسی پروگرام کے ذریعے بنائی گئی کسی فائل کا ہے، تو اس شارٹ کٹ کو ڈبل کلک کرنے سے وہ پروگرام شروع ہوجاتا ہے اور اس میں وہ فائل کھل جاتی ہے۔

ڈیسک ٹاپ کے ساتھ آپ کسی فولڈر میں بھی شارٹ کٹ بنا سکتے ہیں۔ اس کا بھی طریقہ وہی ہے، جو

طرح جب آپ اصل فائل کو ہٹاتے ہیں، تو شارٹ کٹ بھی خود بخود نہیں ہٹتا۔ اسے بھی الگ سے ہٹانا پڑتا ہے۔

پروگراموں کو جلدی کھولنا (Keeping Programs Handy)

آپ اپنا کام اور بھی جلدی کر سکتے ہیں، اگر سب سے زیادہ استعمال کیے جانے والے پروگرام فوراً دستیاب ہوں۔ اس کا ایک طریقہ تو ڈیسکٹ ٹاپ یا کسی دیگر فولڈر میں اس کا شارٹ کٹ بنانا ہے۔ دوسرا طریقہ نیچے بتایا گیا ہے:

اسٹاٹ مینو میں پروگرام کو جوڑنا

(Pinning a Program in Start Menu)

1۔ اسٹارٹ بٹن پر کلک کریں، جس سے اسٹارٹ مینو کھل جائے گا۔

2۔ سب سے نیچے دیے گئے آپشن 'All Programs' کے آئیکان پر کلک کریں، سبھی پروگراموں کی فہرست

تصویر W-6.13: کچھ آبجیکٹ کے شارٹ کٹ

اس کے لیے درج ذیل کام کیجیے:

1۔ شارٹ کٹ بنانے کے لیے پہلے اس آبجیکٹ کی ونڈو کو کھولیے، جس کا شارٹ کٹ آپ بنانا چاہتے ہیں۔

2۔ پھر اس آبجیکٹ کے آئیکان نشان پر دایاں کلک

ڈیسک ٹاپ پر بنانے کا ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ آبجیکٹ کے آئیکان کو اس فولڈر کے آئیکان یا اس کی ونڈو تک کھینچا جاتا ہے۔

جب آپ کسی شارٹ کٹ کو ہٹاتے (Delete) ہیں، تو اصل (Original) فائل نہیں ہٹائی جاتی۔ اسی

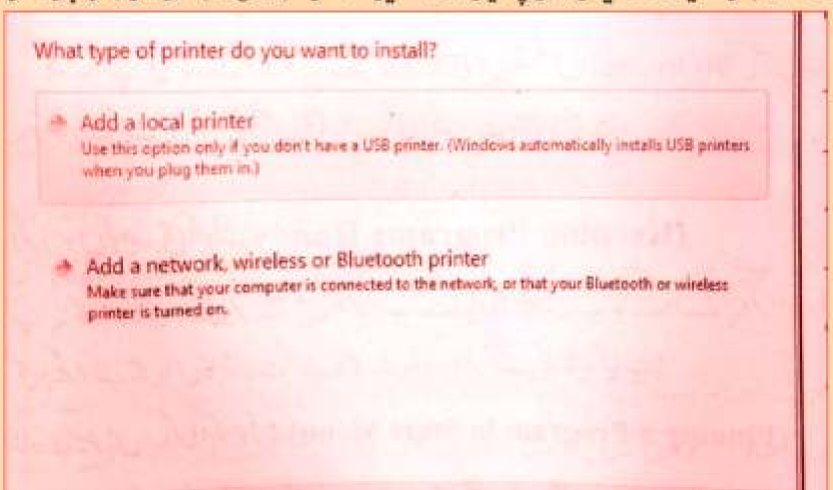

تصویر Add a Printew-6.15 آپشن پر کلک کرنے سے کھلی ونڈو

آجائے گی۔

3۔ کسی بھی پروگرام (جس کا آپ زیادہ استعمال کرتے ہیں) پر دایاں کلک کیجیے، جس سے اس کا کانٹیکسٹ مینو کھل جائے گا۔

4۔ کانٹیکسٹ مینو میں 'Pin to Start Menu' ہدایت کو چنیے۔ ایسا کرنے سے یہ پروگرام اسٹارٹ مینو کے اوپری حصے میں ہی آجائے گا اور آپ اس پروگرام کو اسٹارٹ مینو کھولتے ہی آسانی سے چلا سکتے ہیں۔ 'All Program' آپشن تک (یا اس سے بھی آگے) جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اگر آپ اس پروگرام کو اسٹارٹ مینو سے ہٹانا چاہتے ہیں، تو اسٹارٹ مینو کھولنے کے بعد اسی پروگرام پر دایاں کلک کریں کانٹیکسٹ مینو میں "Unpin from Start Menu' آپشن پر کلک کریں۔ اس سے یہ اسٹارٹ مینو سے ہٹ جائے گا۔

پرنٹر کو انسٹال کرنا (Installing a printer)

ونڈوز میں کسی پرنٹر کو کمپیوٹر کے ساتھ جوڑنا بہت آسان ہے۔ اس میں ونڈوز کے 'Add a Printer' پروگرام کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پرنٹر کو سیٹ کرنے سے پہلے آپ کو اس کے ماڈل اور بنانے والے کا نام معلوم ہونا چاہیے۔ پرنٹر کے ساتھ ایک انسٹالیشن سی ڈی بھی دی جاتی ہے۔ کام شروع کرنے سے پہلے پرنٹر کے کنکشن کا پلگ اپنے پی سی میں متعینہ جگہ پر لگا دیجیے۔ اب آپ پرنٹر سیٹ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے لیے درج ذیل کام کیجیے:

1۔ اسٹارٹ مینو میں 'Control Panel' آپشن پر کلک کیجیے اس سے کنٹرول پینل کی ونڈو تصویر W-6.5 کی طرح کھلے گی۔

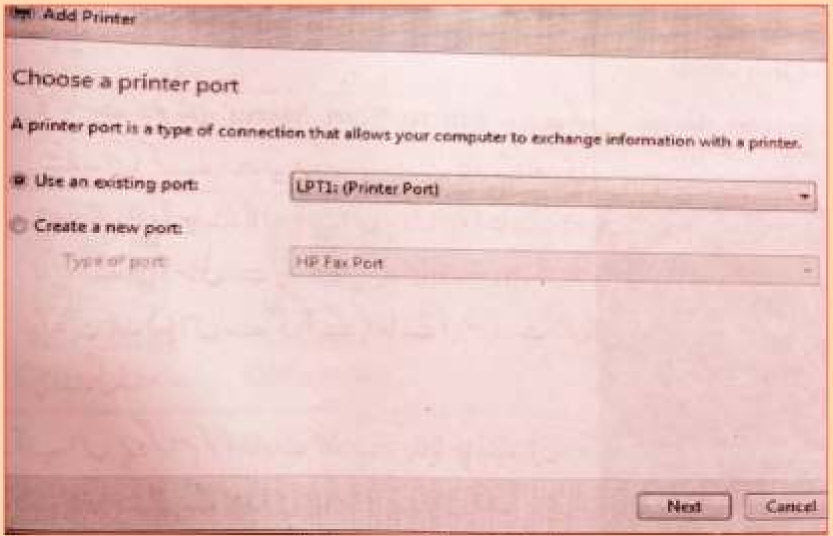

تصویر W-6.16: پرنٹر کے مناسب پورٹ کا انتخاب

2۔ کنٹرول پینل کی ونڈو میں 'Hardware and Sound' آپشن کو کلک کیجیے، جس سے تصویر W-6.11 کی طرح 'Hardware and Sound' ونڈو کھل جائے گی۔

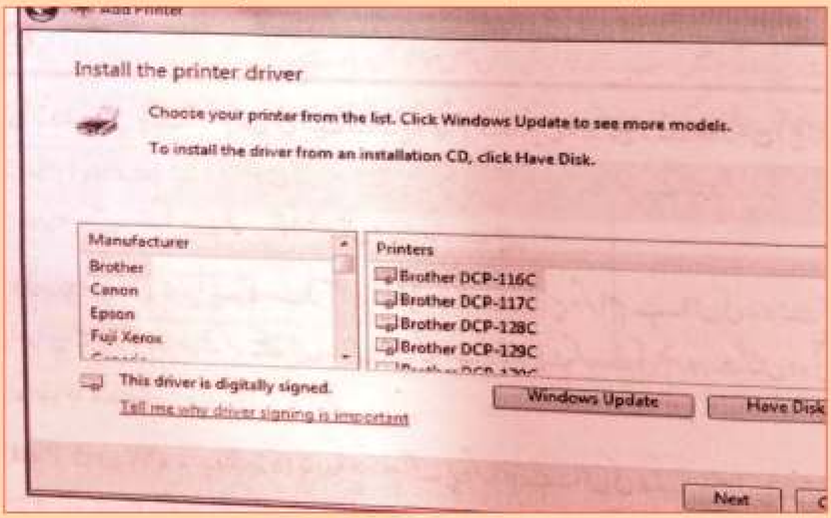

تصویر W-6.17: پسندیدہ پرنٹر منتخب کرنا

3۔ 'Hardware and Sound' ونڈو میں سب سے اوپر 'Devices and Printers' کا آپشن دیا گیا ہے۔ اس آپشن کے ذیلی آپشن 'Add a Printer' پر کلک کیجیے۔

4۔ 'Add a Printer' آپشن پر کلک کرنے سے تصویر W-6.15 کی طرح ایک نئی ونڈو میں 'Add a Local Printer' آپشن پر کلک کیجیے۔

5۔ اس کے بعد آپ کو اپنے پی سی اور پرنٹر کے درمیان کنکشن کی قسم کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اسکرول ڈاؤن لسٹ سے مناسب آپشن چنیے اور 'Next' پر کلک کیجیے۔ پرنٹر کا پورٹ عموماً 'LPT' ہوتا ہے (تصویر W-6.16)۔

6۔ 'Next' بٹن پر کلک کرنے پر آپ کو 'Add Printer' ڈائیلاگ باکس تصویر W-6.17 کی طرح دکھایا جائے گا۔ اس ڈائیلاگ باکس میں دنیا کے بھی مشہور پرنٹروں اور ان کے بنانے والوں کا نام دکھایا جاتا ہے۔ دکھائی گئی فہرست میں سے صحیح پرنٹر کا انتخاب کرکے 'Have Disk' کے بٹن پر کلک کریں۔ پرنٹر پروگرام CD کے ذریعے انسٹال ہونے لگے گا۔

7۔ اس کے بعد آپ کا پرنٹر انسٹال ہو جائے گا، جس کا نوٹی فکیشن بھی آپ کی تصویر W-6.18 کی طرح دکھایا جائے گا۔ 'Finish' پر کلک کیجیے یا پرنٹر کی چھپائی دیکھنے کے لیے 'Print a test Page' پر کلک کیجیے۔

آج کل بازار میں یو ایس بی پرنٹر دستیاب ہیں، جنھیں انسٹال کرنے کے لیے دیے گئے طریقے کے مطابق چلنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پرنٹر کا پلگ یو ایس بی پورٹ پر لگاتے ہی ونڈوز خود اسے انسٹال کر دیتی ہے۔ ■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2

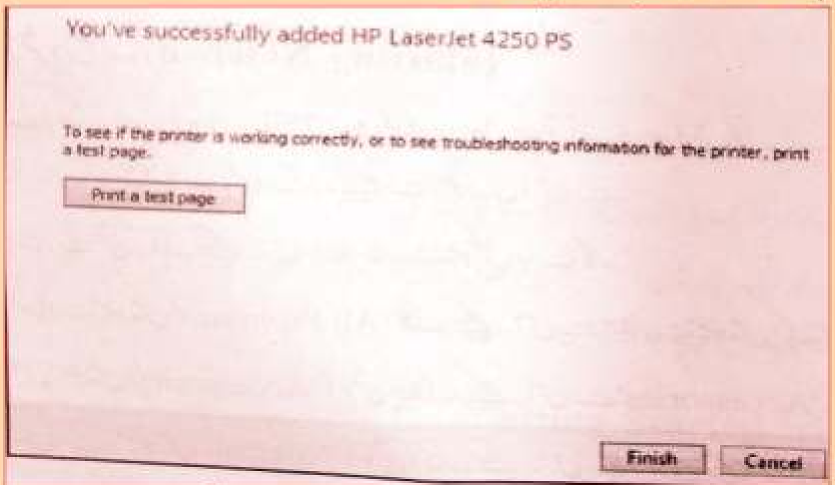

تصویر W-6.18: پرنٹر کامیابی کے ساتھ انسٹال ہو جانے پر دکھایا جانے والا نوٹی فکیشن

تبصرہ و تعارف

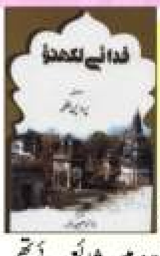

فدائے لکھنؤ

مصنف: پروین طلحہ، مترجمہ: صبیحہ انور
صفحات: 182، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر معصوم شرقی، آر ایل بی لین۔ 743194 (شمالی کولکاتا)

پروین طلحہ کی کتاب 'فدائے لکھنؤ' انگریزی زبان میں 1913 میں شائع ہوئی تھی اور بہت مقبول بھی ہوئی تھی۔ اسے لکھنؤ کے ناشر 'نیوگی بکس' نے شائع کیا تھا اور اس انگریزی کتاب کا نام بھی 'فدائے لکھنؤ' (Fida-e-Lucknow: Tale of The City and Its People) تھا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ڈاکٹر صبیحہ انور نے کیا جو خود ایک افسانہ نگار ہیں اور اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر دسترس رکھتی ہیں۔

کتاب کے آغاز میں 'ہم بھی ہیں فدائے لکھنؤ' کے عنوان سے مشہور ادیبہ ذکیہ مشہدی نے 'فدائے لکھنؤ' اس کی مصنفہ پروین طلحہ اور مترجم صبیحہ انور کے بارے میں بہت مختصر مگر بے حد دلچسپ پیرائے میں بے حد قیمتی معلومات قارئین تک پہنچائی ہیں۔ اگر اس کتاب میں پیش کیے گئے مضامین کو راست پڑھا جائے تو یہ مختصر افسانے معلوم ہوتے ہیں جو انشائیہ کے انداز میں تحریر کیے گئے ہیں لیکن ذکیہ مشہدی کی تحریر پڑھ کر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ 'افسانے' دراصل چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں جسے مصنفہ نے کہانی کے انداز میں بیان کیا ہے اور تقریباً تمام واقعات کا تعلق مصنفہ پروین طلحہ کی ذاتی زندگی سے ہے۔ پروین کا اسلوب اتنا دلکش اور سحر انگیز ہے کہ قارئین کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا ہے۔ ذکیہ مشہدی نے بالکل سچ لکھا ہے کہ لکھنؤ داستان گویوں کا شہر تھا۔ پروین طلحہ اس کی زندہ مثال ہیں۔

ہم نے لکھنوی تہذیب کو نوابوں اور جاگیرداروں یا پھر شاہانِ اودھ سے قریب شاعروں اور داستان گویوں کی نظروں سے دیکھا ہے، لیکن زیر نظر کتاب میں اس تہذیب کو عام شہریوں کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں جو واقعات درج کیے گئے ہیں وہ 1947 کے بعد کے ہیں۔ جب تقسیم ہند کے بعد لکھنؤ کے خاندان کے خاندان بھی تقسیم ہوگئے۔ اس میں جو کردار ہیں انھوں نے لکھنوی تہذیب کے انتشار کا کرب جھیلا ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس کتاب میں لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیبی کی ان باریکیوں کو بھی پیش کیا گیا ہے جو عام شہریوں کے روزمرہ کے واقعات میں اس طرح ظاہر ہوتے ہیں جیسے یہ کہانی صرف لکھنؤ کی نہیں ہماری اور آپ کی بھی ہے۔ یہاں ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے دو بھائی ہیں وہ جو ہندوستان کی تقسیم کے بعد ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں۔ ایک بھائی جب عرصۂ دراز کے بعد لوٹ کر واپس آتا ہے تو اپنا گھر تو رہنے کے لیے مل جاتا ہے لیکن وہاں ایک کرائے دار کی حیثیت سے رہتا ہے اور وہ مبارکن جن کی قبر پر لگے ہوئے سنگ مرمر کے کتبے ہیں جب دراڑ پڑ جاتی ہے تو اسے بھرنے کے لیے ان کے بیٹوں کو کیا کیا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ کون بلائے گا اس میر صاحب کو جنھوں نے اس پرآشوب دور میں جب غدر کے بعد لکھنؤ کی گلیوں اور کوچوں میں موت رقص کر رہی تھی وہ ایک انگریز کی بچی کو رات کے سناٹے میں تلاش کرتے ہیں اور پھر اسے انگریز کے حوالے کر دیتے ہیں مگر انعام کے لیے جاگیر لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہی اس انگریز کا باورچی لڈن میاں بھی انعام سے انکار کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ پرنس حارث حسین کے واقعات بھی کم المناک نہیں۔ لکھنؤ کے نوابی دور کی روایتوں کے اسیر پرنس اپنی بیٹی زہرہ کو پڑھانا چاہتے ہیں لیکن اعلیٰ تعلیم دلانے کے وقت سماجی روایتوں کی دیوار سامنے آجاتی ہے مگر جب ان کے دونوں بیٹے عیاشیوں میں ساری دولت لٹا دیتے ہیں اور ایک ایک کر کے گھر کے تمام قیمتی اثاثے فروخت کرنے کے بعد اپنی بہن کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں تب پرنس کو اصل اقدار اور شرافت کا خیال آتا ہے اور زہرہ کو نہ صرف

ادھوری تعلیم مکمل کرنے کی اجازت دیتے ہیں بلکہ سارا خاندان ملازمت کرنے لگتا ہے کیونکہ نواب آصف الدولہ نے بدترین قحط کے دوران بڑا امام باڑہ تعمیر کر کے اپنی سلطنت کے عوام اور خواص کو یہی تو سکھایا تھا کہ کام کرنے سے شان نہیں گھٹتی۔

پروین طلحہ نے ایک طرف نواب سعید الدلہ کے واقعات قلمبند کیے ہیں جنھوں نے ایک چابک خریدنے کے لیے پوری دکان تین لاکھ روپے دے کر خریدی اور اس دکان کا سارا سامان غریبوں کی نذر کر دیا لیکن دکاندار کے ساتھ ایسی شرافت کا نمونہ پیش کیا جو نوابان اودھ کی تہذیب کی اصل روح تھی وہ تہذیب جو بڑے امام باڑے کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئی، دوسری طرف کلن کی لاٹ کی وہ غلیظ، میلی کچیلی گھسیکرن ہے جو اپنے شوہر اور اپنے عاشق کے ساتھ بڑی بے حیائی سے رہتی ہے اور جب سارا محلّہ اس کے خلاف ہو جاتا ہے اور اسے نکال کر سماج کی تطہیر کرنا چاہتا ہے تو وہ مقابلے پر ڈٹ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پنچایت بھی اس کے سوال بلکہ اس کے مطالبے کے سامنے بے بس ہو کر لوٹ جاتی ہے۔ گھسیکرن جاہل ہے، گنوار ہے لیکن عورتوں کے حق کے لیے جب پنچایت سے مطالبہ کرتی ہے تو کھوکھلی روایتوں اور کمزور اقدار کی طنابیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔

کلن کی لاٹ میں تو ایک دنیا آباد ہے جو انگریزوں کا قبرستان ہے اس سے متصل مسلمانوں کا قبرستان بھی ہے، ماموں بھانجے کی قبر ہے۔ اسی طرح علی گنج کا ہنومان مندر، جہاز لعل کی حویلی، درگاہ جہاں زر دوزی کا اڈہ ہے۔ غرض کہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں لکھنوی تہذیب کے نمونے آج بھی اپنی جھلک دکھا دیتے ہیں۔

پروین طلحہ نے لکھنؤ کو آصف الدولہ کی تعمیر کردہ عمارتوں، حویلیوں یا امام باڑوں میں پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی انیس و دبیر کے مرثیوں یا شرر اور سرشار کے ناولوں میں تلاش کیا ہے بلکہ ان سینوں میں تلاش کیا ہے جہاں یہ تہذیب آج دفن ہے۔ اگر لکھنؤ کی تہذیب یہی جو 'فدائے لکھنؤ' میں پیش کی گئی ہے تو مصنفہ کا کرب میں ڈوبا ہوا یہ جملہ تہذیبوں کی تاریخ رقم کرنے والوں کے لیے ایک بڑا سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے کہ "یہ بات یقیناً بہت عجیب ہے کہ لکھنؤ والوں کی عام امیج آرام پسند تفریحات کے شوقین اور ایک بے عمل شخص کی کیسے بن گئی؟"

جہاں تک کتاب کے ترجمے کا سوال ہے تو ذکیہ مشہدی کی یہ بات بالکل درست ہے کہ اگر کتاب کے بارے میں یہ پتا نہ چلے کہ انگریزی سے اردو میں ڈھالی گئی ہے تو کوئی اسے ترجمہ نہیں سمجھے گا۔

عبدالقوی دسنوی (مونوگراف)

مصنف: دیوان حنان خاں

اشاعت: 2017، قیمت: 70 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عادل حیات (شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

عبدالقوی دسنوی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اردو زبان و ادب کی خدمت اور اس کے فروغ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ ایک استاد کی حیثیت سے مشہور و معروف تو ہوئے ہی، ادب کی زیادہ تر اصناف میں کتابیں تحریر کر کے امتیاز حاصل کیا۔ ان کی تصنیف و تالیف کردہ کتابوں کی تعداد پچاس سے بھی زیادہ ہے۔ وہ مختلف اعزازی عہدوں پر فائز رہے۔ قدر شناسی کے طور پر انھیں مختلف سرکاری اور نیم سرکاری اداروں، تنظیموں اور اکادمیوں کے ذریعہ ایوارڈوں سے نوازا گیا، ان پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے اور ان کی شخصی اور ادبی زندگی پر کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ زیر نظر مونوگراف بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جسے دیوان حنان خاں نے خوش اسلوبی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ حرف آغاز کے علاوہ اس مونوگراف میں چار باب ہیں۔ جن میں پہلا شخصیت اور سوانح، دوسرا ادبی و تخلیقی سفر اور تصانیف کا جائزہ، تیسرا تنقیدی محاکمہ اور آخری باب کا عنوان مصنف کی تحریروں کا جامع انتخاب ہے۔

اس مونوگراف کے پہلے باب میں صاحب کتاب نے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے سوانحی حالات کو مشاہیر شعر و ادب کے خیالات کی روشنی میں مختصراً مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ اس باب میں چھوٹے چھوٹے عنوانات مثلاً پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے سوانحی حالات، اعزازی عہدے، انعامات و اعزازات، اعزازی عہدے بہ زمانۂ تعلیم، قوی صاحب بحیثیت طالب علم، قوی صاحب بحیثیت استاد اور وفات قائم کیے گئے ہیں۔ جس کی ورق گردانی سے قارئین کے ذہن پر عبدالقوی دسنوی صاحب کی شخصیت اور سوانح کے تمام مثبت پہلو ثبت ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عبدالقوی دسنوی ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ادب کی بیشتر جہتوں میں اپنے جوہر دکھائے، لیکن تحقیق سے انھیں خاص شغف تھا۔ جس کا تفصیلی جائزہ دیوان حنان خاں نے 'ادبی و تخلیقی سفر اور تصانیف کا جائزہ' کے تحت لیا ہے۔ اس باب میں بھی انھوں نے چھوٹے چھوٹے کئی عنوانات قائم کیے ہیں، جیسے تحریر کردہ کتب، مرتب کردہ کتب اور اشاریے وغیرہ۔ جس سے قوی صاحب کی ادبی زندگی اور ان کے کارناموں سے آگہی ہوتی ہے۔ قوی صاحب کی ادبی زندگی اور ترقی پسند تحریک کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔ وہ ترقی پسند تحریک کے اچھے برے دنوں سے واقف تھے۔ ان کی دوستی بہت سے ترقی پسند شعرا و ادبا سے تھی۔ کئی ترقی پسند شعرا و ادبا پر ان کے مضامین اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ انھیں سیفیہ کالج اور بھوپال سے گہرا لگاؤ تھا چنانچہ انھوں نے بھوپال کو موضوع بنا کر ایک کتاب بھی تحریر کی، جسے اردو ادب میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ علاوہ ازیں اردو کے کلاسیکی ادب سے دلچسپی نے ان سے کئی کتابیں لکھوائیں۔ جن میں مرزا اسداللہ خاں غالب، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد پر ان کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی شہرت ملی۔ نظریاتی سخت گیری سے مبرا ان کی تحقیق و تنقید میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ شعور کی بالیدگی اور فکر و نظر کی وسعت دکھائی دیتی ہے۔

قوی صاحب کے تخلیقی و تنقیدی امور کا جائزہ 'تنقیدی محاکمہ' کے تحت لیا گیا ہے۔ دیوان حنان خان نے اس باب میں بھی کئی ضمنی عنوانات لگائے ہیں۔ ان میں قوی صاحب اور بھوپال، قوی صاحب اور سیفیہ کالج، بحیثیت اقبال شناس، بحیثیت غالب شناس، بحیثیت آزاد شناس قوی صاحب اور اردو کے علاوہ قوی دسنوی پیغام بر اردو جیسے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ ان عنوانات کے تحت قوی صاحب کی تخلیقات پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مونوگراف کے آخری باب 'مصنف کی تحریروں کا جامع انتخاب' میں دسنہ، بمبئی اور بھوپال کے شب و روز کو پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں مختلف عنوانات کے تحت عبدالقوی دسنوی کی تحریریں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر بمبئی سے بھوپال کا سفر، سینٹ زیویرس کالج بمبئی، کاروان ادب بمبئی، ملازمت سے سبکدوشی، میں کیوں لکھتا ہوں، ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا، راجندر سنگھ بیدی اور اردو اور نئی نسل (حقائق کی روشنی میں) وغیرہ عنوانات کے تحت قوی صاحب کے خیالات و نظریات اور ان کے مشاہدات کو خود ان ہی کی تحریروں میں پڑھ کر ایک طرف جہاں حقیقت کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے تو دوسری طرف ان کی تحریر کی سحر انگیزی سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔

اس مونوگراف کے مطالعے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ دیوان حنان خاں نے ایمانداری کے ساتھ اپنے اس اہم کام کو انجام تک پہنچایا ہے۔ عبدالقوی دسنوی کے تعلق سے چھوٹے بڑے تمام جزئیات زیر بحث کے سبب قوی صاحب کی ادبی زندگی اور سوانح کے مختلف پہلو روشن ہوگئے ہیں۔ اس مونوگراف سے ادب دوست تو مستفیض ہوں گے ہی، طالب علم کے لیے بھی یہ کتاب کارآمد ثابت ہوگی۔

آؤ سائنسی خط لکھیں

مصنف: عبدالودود انصاری

صفحات: 106، قیمت: 35 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: رفیع الدین ناصر

مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ہندوستان میں پہلی بار مکتوب نگاری کے ذریعے اردو میں سائنسی معلومات فراہم کرنے کا سہرا عبدالودود انصاری کے سر جاتا ہے جنھوں نے تمیں مکتوب کے ذریعے سائنسی معلومات بچوں کے لیے پیش کی ہیں۔ عبدالودود انصاری بچوں کے سائنسی ادب میں مسلسل تحقیق کرتے چلے آرہے ہیں۔ کبھی مکالمہ نگاری کے ذریعے تو کبھی مکتوب نگاری کے ذریعے' تو کبھی ڈرامہ نگاری کے ذریعے۔ مختلف اصناف پر مضامین منظر عام پر لارہے ہیں۔ یقیناً ان کی یہ کوششیں اور خدمات برسوں یاد رکھی جائیں گی۔

عبدالودود انصاری صاحب مسلسل 25 سالوں سے بے لوث طریقے سے ادبی وسائنسی خدمات میں سرگرداں ہیں۔ ماہنامہ سائنس کی ادارت سے وابستگی کا انھوں نے مکمل حق ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی آل انڈیا ریڈیو، ملک کے کئی اخبارات ورسائل میں ان کی مسلسل اشاعتوں نے انھیں عظیم مقام عطا کیا ہے۔ کئی ریاستوں کی جانب سے ان کی خدمات کا بشکل ایوارڈ اور اعزازات کی پیشکش ان کی قابلیت کا اعتراف ہے۔ عبدالودود انصاری صاحب صرف پاپولر سائنس سے ہی وابستہ نہیں بلکہ بہ حیثیت استاد وہ اپنے طلبہ اور تشنگان اردو کے لیے مسلسل نصابی کتب اور اس کے مددگار مواد پر خامہ فرسائی نے 25 سے زائد کتابوں کے متعدد ایڈیشن پیش کرکے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ کی کڑی کے طور پر موجودہ کتاب 'آو سائنسی خط لکھیں' ان کے خوبصورت تاج میں ایک چمکدار ہیرے کا اضافہ کرنے جارہی ہے۔

'آو سائنسی خط لکھیں' دراصل خطوط کا ایک مجموعہ ہے جس میں قابل مصنف نے پیچیدہ سائنسی عنوانات کو انتہائی آسانی سے عام فہم سادہ زبان میں خطوط کے ذریعے سمجھایا ہے۔ آو سائنسی خط لکھیں میں فاضل مصنف نے ایک دوست ریحان کا اپنے ساتھی کو خطوط کے ذریعے ہماری روزمرہ کی زندگی سے جڑے ہوئے 15 اہم عنوانات کو پیش کیا۔ یہ عنوانات حیاتیات، کیمیا، طبعیات، ریاضیات، صحت وغیرہ پر محیط ہیں' قرآن اور سائنس' و 'اسلام اور سائنس' یہ عنوانات مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کی بہترین کوشش ہے۔ اس کتاب کے اداریے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ارتضی کریم رقم طراز ہیں کہ' عبدالودود انصاری نے سائنسی خطوط کا مجموعہ تیار کیا ہے۔ انھوں نے خط کو سائنسی معلومات کی ترسیل کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح نا صرف یہ کہ بچوں کا سائنسی شعور بیدار ہوگا بلکہ وہ سائنسی مضامین کی اردو میں ادائیگی کا سلیقہ بھی سیکھ سکیں گے۔''

کتاب کے دیگر خطوط میں فاضل مصنف نے بڑے ہی بہترین انداز میں اس سوال کا جواب دیا کہ کیا مذہب اسلام سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ اسی طرح سائنس کیا ہے؟ سائنس کے طریقہ کار کیا ہیں؟ اس کی وضاحت عام فہم انداز میں کی گئی ہے۔ ساتھ ہی مسلمان سائنسدانوں کی خدمات کو پیش کرکے ہمارے ماضی کو منور کرنے کی کوشش کی ہے۔ حیاتیات سے جڑے اہم معلوماتی عنوانات جیسے، ہمنگ برڈ، شترمرغ، تربوز، چیونٹی ہمارے جانور، کنگارو چوہا اور چھچھوندر بڑے دلچسپ اور تجسس سے پُر انداز میں تحریر کیے گئے ہیں۔ ریاضی جیسے خشک مضمون پر دو خطوط 'حسابی ارکان' اور 'عدد 495' کو انتہائی دلچسپ انداز میں پیش کرکے قارئین کی ریاضی کی طرف رغبت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہماری صحت سے متعلق 'ہم اور ہماری غذا' پر معلومات پہنچا کر ایک عام اردو قاری کی غذا کے تعلق سے بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح تانبہ اور سُسر تا جیسے موضوعات پر معلومات پیش کرکے اردو قاری کے ہمہ جہت علم میں اضافہ کی کامیاب جدوجہد کی گئی ہے۔

'آو سائنسی خط لکھیں' اس کتاب کی دوسری خاص بات یہ ہے کہ فاضل مصنف نے خط پر لکھنے والے دوست ریحان کا پتہ درج کیا ہے وہ بھی قابل تعریف ہے۔ گویا ہر ایک پتہ اردو تہذیب اور سائنسداں کی شناخت کو واضح کرتا ہے مثلاً سائنس منزل، عمر خیام روڈ کولکتہ، کہکشاں کالونی، البیرونی مارگ، شاداب نگر، بوعلی سینا سڑک کانپور، دلدار نگر، ابن بطیار سڑک اورنگ آباد وغیرہ۔ ملک کے مختلف شہروں سے تحریر کیے گئے یہ خطوط پوری تہذیب و سائنسی کارنامے انجام دینے والے ماہرین سے واقف کراتے ہیں۔ پوری کتاب کی زبان انتہائی سادہ عام فہم اور مناسب جگہوں پر انگلش اصطلاحات کا استعمال سائنسی مفروضوں کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ جابجا اشعار کا استعمال مضمون کو پرکشش بناتا ہے تو وہیں پر فاضل مصنف کے ادبی ذوق کا پتہ دیتا ہے۔

زبان اتنی آسان' سہل اور تسلسل آمیز ہے کہ کوئی بھی عنوان شروع کرنے کے بعد آپ ختم کیے بغیر رہ نہیں سکتے' خواہ وہ بچے ہوں' بڑے ہوں یا کسی بھی مسابقتی امتحان میں شرکت کرنے والے طلباء ہوں۔ میں تمام اردو میڈیم اسکولوں سے درخواست کرتا ہوں کہ بچوں کو یہ کتاب ضرور دیں تاکہ ان کے اندر سائنسی دلچسپی پیدا ہو اور وہ بھی کچھ کر گزرنے والے بن سکیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

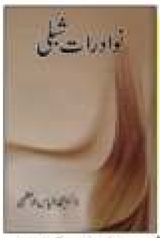

نوادرات شبلی

مرتب/ ناشر: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
صفحات: 256، قیمت 400، سنہ اشاعت: 2017
مبصر: وسیم مینائی
تارین، جلال نگر، شاہجہاں پور۔ 242001

شبلی نعمانی پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور آئے دن مختلف پہلوؤں پر کتابیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں اس کے باوجود تشنگی کا احساس رہتا ہے۔ اب بھی قدرے وقفے سے شبلی نعمانی کی کچھ ایسی ان چھوئی تحریریں وتقریریں منظر عام پر آ رہی ہیں جن کی قدر و منزلت کسی طرح قارئین کی نظر میں ہلکی یا معمولی نہیں معلوم ہوتی۔ اس طرح کی تخلیقات منظر عام پر آ کر شبلی کی شخصی، علمی وفنی اور تہذیبی تصویر کو نہ صرف واضح کرتی ہیں بلکہ روشن و تابناک بھی بناتی ہیں۔ اسی زمرے میں حالیہ مطبوعہ 'نوادرات شبلی' ہے جسے اکتوبر 2017 میں ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے ترتیب دے کر اصیلہ پریس نئی دہلی سے شائع کرایا ہے۔

'نوادرات شبلی' کے نام سے مطبوعہ اس کتاب کے دیباچے میں مرتب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کتاب میں مشمولہ مضامین ومکتوبات وتقاریر کسی مجموعے میں نہیں ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

''نوادرات شبلی میں علامہ شبلی کی وہ تحریریں، تقریریں، دیباچے، منظومات، مکتوبات اور مراسلات شامل ہیں جو دارالمصنفین سے شائع ہونے والے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں اور جو باقیات شبلی میں بھی شامل نہیں ہیں۔ اس طرح گویا یہ کتاب علامہ شبلی کی تحریروں کا پندرھواں اور نیا مجموعہ ہے۔ مجھے خوشی بلکہ فخر ہے کہ سو سال بعد اس کی ترتیب وتدوین کا کام میرے حصہ میں آیا۔'' (نوادرات شبلی: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی: دیباچہ، ص 13)

''باقیات شبلی کی اشاعت 1964 کے بعد علامہ شبلی کی جو تحریریں (مکتوبات، شذرات، مراسلات، نوادرات) دریافت ہوئیں وہ شبلی صدی کے مقالہ نگاروں کو پیش نظر نہیں رہیں۔ ان کا اگر مطالعہ کیا گیا ہوتا تو شبلی کی سوانح اور ان کے فکر ونظر کے بعض پہلو روشن سے روشن تر ہو جاتے اور بعض انتہائی اہم اور نئے پہلو سامنے آتے اور علامہ شبلی کے حوالے سے بعض ہرزہ سرائیوں کا سد باب بھی ہو جاتا۔''

(نوادرات شبلی: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی: دیباچہ، ص 13)

مرتب کے اس دعویٰ سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تمام تحریریں عالم وجود میں محفوظ تھیں اور مختلف رسائل و جرائد میں طبع تھیں۔ البتہ یہ مطبوعات ناپید نہ سہی نایاب ضرور تھیں جہاں تک ہر کسی کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ غرض مرتب کے باعث ستائش یہ ہے کہ جستہ جستہ مطبوعات کو نہایت مستعدی اور دیدہ ریزی سے تلاش کر کے صحت متن اور گرانقدر آرا کے ساتھ پیش کیا اور اس طرح انتخاب کیا کہ دوسری باقیاتی مطبوعات میں تکرار طبع نہ ہوں۔ واقعی ان میں کوئی ایسا مشمولہ نہیں جو کسی طرح کتابی شکل میں آیا ہو۔ 256 صفحات پر مشتمل اس مطبوعہ میں سات ابواب ہیں۔ ہر باب خاص رنگ میں ہے۔ مضامین، خطبات، دیباچہ و تقاریظ، مکتوب، مراسلات، منظومات اور آخیر میں ایک باب متفرقات پر بھی مبنی ہے۔ اس طرح 84 عنوانات کے تحت مختصر مگر جامع و مستند دستاویز کی شکل میں سات ابواب میں شبلی کی باقیات کو جمع کیا ہے۔ ان مشمولات کی افادیت کے مدنظر اس کتاب کا نام 'نوادرات شبلی' رکھا جو یقیناً اسم بامسمیٰ ہے۔

تحقیق وتاریخ میں شبلی نعمانی طاق ہیں۔ ان کا کثرت مطالعہ، ذہن رسا اور عماقت فن وہ تمام نایاب اور نادر جواہر کو ڈھونڈ ہی نکال لیتا ہے جن کی ضرورت ایک محقق کو ہوتی ہے۔ ان کی فارسی دانی پر کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مصداق ہے۔ انھوں نے ایک مضمون 'غضاری رازی' پر لکھا جسے ماہنامہ غنچہ جاوید بمبئی نے شائع کیا۔ اس مضمون میں جس طرح مختلف تذکروں کے حوالے سے نام کی سہویات کو استدلال کے ساتھ درست فرمایا ہے۔ دور حاضر کے محققین کو ان کے طریقۂ کار سے استفادہ کرنا چاہیے۔ 'غضاری رازی' کے احوال وکوائف کا مصدقانہ اور مدلل بیان کرنا فن تحقیق کی پاسداری کا عمدہ نمونہ ہے۔

علامہ شبلی نعمانی محض ایک شاعر، ادیب، ناقد، محقق، مورخ، سیرت نگار اور انشا پرداز ہی نہیں تھے بلکہ ایک متکلم یعنی عمدہ خطیب بھی تھے۔ اس قدر مدلل اور جامع خطاب کرتے کہ دوسروں کو لاجواب کر دیتے تھے۔ انداز تخاطب کا جوہر ان میں اتنا تھا کہ سامعین پر سکتہ طاری ہو جاتا تھا۔ ان کے خطبات معانی ومطالب اور استدلال کے اعتبار سے ایک رسالہ کے مانند تھے چنانچہ تعلیم وتربیت سے متعلق ایک خطبے کو بھی اس کتاب میں جگہ دی ہے جو 1909 میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی جانب سے منعقد جلسہ میں دیا تھا۔

آج جس طرح فارسی زبان وادب کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کیا جا رہا ہے ویسا برتاؤ انگریزوں کے دور حکومت میں بھی ہو چکا ہے جس کے لیے علامہ شبلی نے آواز بلند کی اور ایک جلسے میں اس موضوع پر خطاب بھی کیا۔

مرتب کتاب نے سات خطبات کو شامل کیا ہے جو نہایت اہم موضوعات پر مبنی ہیں۔ کتابوں پر دیباچے یا تقاریظ دونوں تعریفی ہو سکتے ہیں مگر صدق دلی اور تعمیری نقطۂ نظر سے جس طرح شبلی نعمانی نے لکھے ہیں ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ شبلی جیسا باریک بیں اور کھری کھوٹی لکھنے والا ناقد شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ انھوں نے 'تاریخ النوائط' پر دیباچہ لکھتے وقت اصول تاریخ نگاری پر زبردست نکتہ چینی کی ہے۔ یوں رقمطراز ہیں:

''قدیم زمانے میں شخصی سلطنت کے اصول نے فن تاریخ پر یہ اثر کیا تھا کہ تاریخی تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا تھا صرف سلاطین کے واقعات اور حالات ہوتے تھے ملک اور قوم کے حالات سے مطلق بحث نہیں ہوتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ سیکڑوں ہزاروں تاریخوں کو پڑھ کر اگر پتہ لگانا چاہو کہ اس زمانہ کا تمدن، تہذیب ومعاشرت کیا تھی تو تم کو بالکل ناکامی ہوگی۔'' (نوادرات شبلی: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی: دیباچہ، ص 129)

دیباچے کے علاوہ ایک مضمون 'موجودہ زمانے میں تاریخ کا فن' کے عنوان سے بھی شامل ہے۔ اس مضمون میں بھی قدیم تاریخ نگاری کی کمیوں کو گنوایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''قدیم تاریخوں کو پڑھ کر اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ فلاں عہد میں طریق تمدن اور طرز معاشرت کیا تھا؟ حکومت اور فصل مقدمات کے کیا آئین تھے؟ خراج ملک کیا تھا؟ فوجی قوت کس قدر تھی؟ ملکی عہدے کیا کیا تھے؟ تو ان باتوں میں سے ایک کا پتہ لگنا بھی مشکل ہوگا۔ خود فرمانروائے وقت کے طور طریقے اور عام اخلاق وعادات کا اندازہ کرنا چاہو تو وہ جزوی حالات اور مفید تفصیلیں نہ ملیں گی جس سے ان کی اخلاقی تصویر ایک بار آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔'' (نوادرات شبلی، ص 40)

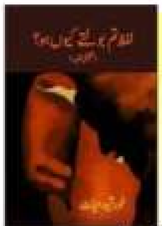

لفظ تم بولتے کیوں ہو؟

مصنف: خورشید حیات
صفحات: 352، قیمت: 211 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: نورالحسنین، 31-12-1 پرگتی کالونی، گھاٹی، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'لفظ تم بولتے کیوں ہو' یہ خورشید حیات کے تنقیدی مضامین کی پہلی کتاب ہے اور اپنے اسلوب کے لحاظ سے بھی یہ تنقید کی پہلی کتاب ہے۔ جو تنقیدی زبان کے بجائے

تخلیقی زبان میں لکھی گئی ہے۔ یہ غور و فکر کی دعوت بھی قاری کو دیتے ہیں اور تخلیقی سرور و انبساط کی دنیا میں بھی لے جاتے ہیں اور اپنے حرفِ مدعا پر اس طرح سب کچھ پہنچا دیتے ہیں کہ بے مزہ بھی ہونے نہیں دیتے۔ اور قاری ہی سے سوال کرتے ہیں:

''یہ کیسی تنقید کر رہا ہے / لکھ رہا ہے
میرے رحمٰن
کیا یہ تخلیقی تنقید ہے
میرے لفظ / میرے جملے
''لفظ تم بولتے کیوں ہو''
تلاش کرنے دو انھیں

تخلیق افضل ہے۔ اُس کی پیدائش ہی تنقید کے پیدا ہونے کا سبب بنتی ہے۔ یہی سبب تھا کہ ترقی پسند تحریک کے دور میں تخلیق کار اور تنقید نگار ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ تنقید نے ہاتھ پیر نکالنا اور آنکھیں دکھانا شروع کر دیا تھا اور بجائے اس کے کہ تخلیق کے پیچھے پیچھے چلتی، اُس نے آگے آگے چلنا شروع کیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تخلیق گمراہ ہوتی چلی گئی اور تخلیق کو سر پر بٹھانے والے قارئین نے اُسے زمین پر یہ کہہ کر پٹخ دیا کہ یہ سرسبز و شاداب وادیوں کو چھوڑ کر ہمیں بھی فکر کے ریگستانوں میں گھسیٹ رہی ہے۔ آخر کار تخلیق نے خود ہی اپنا راستہ ڈھونڈھ نکالی، تو تنقید کے بڑے بھائیوں نے اس راستے کے مسافروں ہی کو نظر انداز کر دیا۔

خورشید حیات خداداد صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوئے۔ پھر اپنے بچپن کو کھیل کود میں ضائع نہیں کیا۔ اپنے وقت کے بہترین ادیبوں اور شاعروں میں اُٹھنا بیٹھنا نصیب ہوا۔ آنکھوں میں شرارت کی چنگاریاں اور مزاج کی بذلہ سنجی لیے وہ جس محفل میں قدم رکھتے اکثر لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگتیں۔ ان ہی شرارتوں نے اُن کے اندر بھی ایک تخلیق نگار کو جنم دیا۔ اُن ہی کے الفاظ میں ایک ایسا مٹی بدن شہزادے کا جنم ہوا، جو ادب کی گھنی جھاڑیوں میں فکر کی تیر کمان سنبھالے اُس ہرنی کے تعاقب میں نکلا، جو اچھے اچھوں کو بھی دھول چٹاتی رہی ہے لیکن خورشید حیات نے اُسے کسی بابا کی کٹیا میں پہنچنے سے پہلے ہی دھر دبوچ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ادب پر کسی کی چھاپ نہیں ہے۔ اُس نے افسانے لکھے، شاعری کی اور تنقید بھی لکھی اور ہر جگہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ یہاں مجھے اُن کی ناقدانہ بصیرتوں سے متعلق لکھنا ہے۔ اس لیے اُن کی دیگر نگارشات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اصل موضوع پر آتا ہوں۔ خورشید حیات نے تنقید کو صرف نیا اسلوب ہی نہیں دیا بلکہ مروجہ تنقیدی اصطلاحوں کے بجائے بہت سارے نئے الفاظ، نئی تشبیہات، نئے استعارے اور نیا انداز بھی دیا ہے۔ جس نے اُن کی تنقید نگاری کو اوروں سے مختلف اور ایک منفرد اسلوب بھی بخشا ہے۔ اُن کی تخلیقی تنقید کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں:

''نئی کہانی روشنی میں نہائی ہوئی زندگی کی سڑک کی پیاس ہے، جس کی چوڑی چھاتی ہر عہد کی تاریخ کی خاموش گواہ بنتی جا رہی ہے۔ زخم سے کہانی نہیں بنتی۔ زخم کی یاد سے بڑی کہانی بن جاتی ہے۔ کہانی تو جذبات و محسوسات اور مشاہدات کی تہذیب کی ایک صورت ہے۔ مگر کیا کہیں ہم اس صورت کو، کم بخت ہمیشہ ایک ہی نہیں رہتی۔ دیواروں کے کبھی ختم نہ ہونے والے سلسلوں کی جب شروعات ہوئی الگ الگ وچاروں کے خیموں میں جب کہانی قبیلہ بننے لگا۔ کالی تحریروں اور وجودیت کی کھوکھلی علامتوں کے نام پر پنڈولم جھولنے لگا اور اُس کا ٹائم پریڈ معلوم کیا جانے لگا تو فیشنی جدیدیت کے علمبرداروں کی کہانی ایک ایسے درخت کی زبان بن گئی جسے قاری کی سماعت نہیں سن سکی۔''

ناول 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' پر خورشید حیات نے ایک طویل تنقیدی نہیں تخلیقی مضمون لکھا ہے۔ نثر کی خوبصورتی دیکھیے اور نثر نگار کو داد دیجیے:

''نورالحسنین نے زمینی تناظر میں نفرتوں اور عداوتوں سے دور نئے گلیاروں میں قصوں / کہانیوں کے لیے ایک نیا راستہ ہموار کیا ہے۔ ناول کی فنی روایت اور مشرقی مزاج سے خود کو ہم آہنگ کرتے ہوئے ناول نگار نے محبت کے ایک نئے تاج محل کی تعمیر کی ہے۔ اس ناول کو پڑھتے وقت محسوس ہوا کہ لیلیٰ کے چہرے پر ایک ایسی دائمی مسکان پھیلتی جا رہی ہے جیسے کسی نے مرجھائے ہوئے چہرے اور پپڑائے ہوئے ہونٹ پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا مارا ہو۔ عشق اگر ہوش کھو دیتا ہے تو وہ ایک جنون بن جاتا ہے۔ تخلیقی لمحات میں چاند حسنین کے بہت قریب آ گیا ہے جہاں حمایت باغ کی گل یاسمین، چاند مینار سے اپنی ظفر مندی کا اعلان کر رہی ہے۔ عشق کی وادی پُر خار میں پاؤں کے چھالوں سے لہولہان داستان سے پھوٹتی ہوئی سبز کونپلوں کا نام چاند ہم سے باتیں کرتا ہے۔''

تو شائستہ فاخری کی فنکاری کو وہ ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''نئی صدی کی داستان گو کا نام شائستہ فاخری ہے جو خانقاہ کی اونچی اونچی دیواروں، محرابوں سے جب باہر نکلتی ہیں تو مسخ شدہ چہروں کی بھیڑ میں روشن تہذیب چہرہ کی تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔ شائستہ فاخری ناولوں میں عورت کے اُن گوشوں کو بڑی بیباکی، سفاکی سے اُبھارتی ہیں جو مخفی رہ گئے تھے۔ اپنے تخیل کے سہارے اُڑن کھٹولے پر سوار، شائستہ اپنے داستانی اسلوب میں ماضی کی عورت کو حال کے آئینہ میں دیکھتی ہیں۔''

حقانی القاسمی کی تنقید نگاری سے بحث کرتے ہوئے خورشید حیات نے اُن کے فن کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے:

''موجِ قلندر نے دشت و کوہ پر تنقید کی بور کر دینے والی یک رنگی کو، ایک نیا رنگ عطا کیا ہے۔ ایک ایسا رنگ جو تنقید کے املی کے درخت کے نیچے فاتحہ پڑھنے والوں کی محدودیت کو آفاقیت عطا کرتا ہے۔ جہاں چشم و لب اور ہتھیلی کی اُنگلیاں، اپنے نئے لفظی کائنات کو خلق کرتی نظر آتی ہیں۔ حقانی تخلیق و تنقید، ادب و صحافت کی فطرت سے غالب ہوتے جا رہے کنوارے پن کے ہر صفحے پر چڑیوں کی نئی اُڑان اور بہتی ہوئی فضاؤں کی فطری ساختیات لکھ رہے ہیں۔''

352 صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب اپنے اندر بے شمار موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے، بے شمار مٹی بدن شہزادوں کی کہانی کائنات کے در کھولتی ہے۔ کسی کو صندلی کشتی میں سوار کرتی ہے۔ تو کسی کو ان کے فن محل تک پہنچاتی ہے، کبھی بابا کالے شاہ کا پتہ پوچھتی ہے، کسی کو بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکوں کے ساتھ آٹھویں در کا پتہ دیتی ہے، کہیں لفظیات مشک کی طرح مہکتی ہیں تو کہیں شہری بن کر گھومنے والے بابوؤں کو اُن کے گاؤں کا پتہ بتاتی ہیں۔ اس چھوٹے سے تبصرے میں کس کس کا احاطہ ممکن ہے؟ آخر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ خورشید حیات نے فنکاروں کے فن کو اُن کے تخلیقی لمحوں میں اُتر کر تخلیق کی بازیافت تخلیقی فکر کے ساتھ کی ہے۔

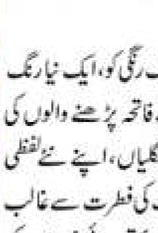

اردو ناول اور اودھ

مرتب: ڈاکٹر عباس رضا نیر
صفحات: 276، قیمت: 300 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: جمال اختر، D238 چوتھی منزل، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی 25

حیات انسانی کے وجود میں آنے سے لے کر موجودہ عہد تک دنیا پر مختلف قوموں، نسلوں اور قبیلوں نے حکمرانی کی، لیکن ایک مقررہ مدت کے بعد اس صفحۂ ہستی سے وہ اس طرح

غائب ہوئے کہ آنے والی نسلوں میں کوئی ان کا نام تک لینے والا نہ بچا۔ لیکن انھیں قوموں میں سے بعض نے فکری اور علمی صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنے تہذیبی رشتوں کو اتنا مستحکم کرلیا کہ رہتی دنیا تک ان کو یاد کیا جائے گا۔ ہندوستان صدیوں سے ہی مخلوط معاشرے اور مختلف تہذیب وثقافت کا حامل رہا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ جب ٹمٹمانے لگتا ہے تو وہاں کے شعرا و ادبا، دانشور اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین اودھ کی طرف رخ کرتے ہیں۔ جہاں کے حکمرانوں نے علوم وفنون کے ماہرین کی دل کھول کر سرپرستی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مختصری مدت میں یہ علاقہ تہذیب وثقافت کا گہوارہ بن گیا۔

تہذیب اودھ کا رشتہ اردو ناولوں سے اس کے ابتدائی دور سے ہی جڑ جاتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے ناولوں سے پرے جتنے بھی ابتدائی ناول وجود میں آئے یا تو وہ لکھنؤ میں لکھے گئے یا ان میں لکھنوی تہذیب وثقافت اپنی سانسیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'اردو ناول اور اودھ' مختلف شخصیات کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ دراصل یہ مضامین لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے منعقد سیمینار میں پڑھے گئے مقالات ہیں جنھیں ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب نے ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ 'اودھ کے ناولوں میں مسلم معاشرت کی عکاسی' کے عنوان سے علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے اپنے مضمون میں مختلف ناولوں میں تہذیب اودھ کی عکاسی کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور اس تہذیب کے مثبت پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم کا مضمون 'ناول: تعریف، تاریخ اور تجسیم' کافی اہمیت کا حامل ہے، جس میں انھوں نے ناول کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کے پس منظر، فارم، انداز پیش کش اور زبان وبیان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کا مضمون 'رتن ناتھ سرشار کے ناول' سرشار کے فن سے متعلق مختلف نئے در وا کرتا ہے۔ سرشار اور مولوی نذیر احمد کے فن کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے ان کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مشرقی تہذیب وثقافت کو قرۃ العین حیدر نے جتنی کثرت کے ساتھ اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے شاید ہی کسی دوسرے ناول نگار نے کیا ہو۔ لہذا فاروق جائسی اور ڈاکٹر رشید اشرف خان نے اپنے مضامین میں اس پہلو پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ 'لہو کے پھول' ایک ایسا ناول ہے جس میں نہ صرف اودھ کی بلکہ پورے ہندوستان کی جغرافیائی کیفیات، ملکی، معاشی، اقتصادی حالات، سماجی نوعیت اور ان سب پر حاوی سیاسی ہنگامہ خیزی کی عکاسی نہایت ہی تفصیلی انداز میں کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عشرت ناہید نے اپنے مضمون 'لہو کے پھول میں ڈھلتی شام اودھ' میں ان گوشوں کی طرف بخوبی روشنی ڈالی ہے۔

امراؤ جان ادا اور رسوا پر چار مضامین ہیں جن میں ڈاکٹر اعظم انصاری کا مضمون 'ناول امراؤ جان ادا: طوائف اور اودھ' نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ مصنف نے نشتر اور شاہد رعنا ناولوں کا حوالہ دیتے ہوئے رسوا کے امراؤ جان ادا میں اخذ واستفادہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ساجد غفران ندوی کے مضمون 'اودھ کے ناولوں میں مسلم خاندان اور معاشرہ کی عکاسی' میں اس خطہ میں لکھے گئے ناولوں میں بیان ہوئے مسلم معاشرے کے مختلف مسائل جو لکھنؤ کی بیمار اور انتشار پذیر معاشرت میں خاندانوں کی تباہی کے باعث تھے، کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید علی سلمان رضوی نے اپنے مضمون میں اودھ اور اس کے باہر لکھے گئے ناولوں میں مسلم تہذیب ومعاشرت کا احاطہ کیا ہے۔ اعجاز احمد، آصف علی اور ڈاکٹر عبیدالرحمن نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں میں لکھنوی تہذیب وثقافت اور مسلم کلچر کے گوناگوں پہلوؤں کی طرف قارئین کی توجہ دلائی ہے۔ احسن فاروقی کے ناول 'شام اودھ' کو لکھنوی تہذیب کی ترجمانی کرنے والے ناول کے حوالے سے کافی مقبولیت حاصل ہوئی، ڈاکٹر منتظر مہدی اور ڈاکٹر محمد جعفر نے اپنے مضامین میں 'شام اودھ' کی اہمیت اور معنویت کو اپنے نظریے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ اکثر ادیبوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ ان کی کوئی تخلیق بہت زیادہ مشہور ہوگئی ہوتو ان کی دیگر تخلیقات کی طرف سے ناقدین اور قارئین کی توجہ ہٹ جاتی ہے اور سبھی لوگ اسی ایک تخلیق کے حوالے سے اس مصنف کو یاد کرتے ہیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ ان کے ناول 'امراؤ جان ادا' کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کے دیگر ناول پردہ خفا میں چلے گئے، اور ان پر آج کوئی گفتگو کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے اس روش سے ہٹتے ہوئے مرزا رسوا کے ناول 'اختری بیگم' کو اپنا موضوع بنایا اور اس کے فکری وفنی امتیازات سے قارئین کو بخوبی واقف کرایا ہے۔ اس کے علاوہ مسلم معاشرہ کی خوبیوں اور خامیوں کے پس منظر میں جو ناول تخلیق کیے گئے ان کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر دلشاد حسین، صبغۃ اللہ، اختر سعید، محمد یاسر انصاری، اجے کمار سنگھ، محمد حنیف خاں، کلب عباس اشہر، کرار حسین اور سید محمد عابد رضوی نے مجموعی اعتبار سے ان ناولوں کی اہمیت ومعنویت کو اجاگر کیا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کتاب اردو ناول پر تحقیق کر رہے طلبا اور اساتذہ کے لیے نہایت ہی کارآمد ثابت ہوگی۔

پریم چند کے فسانوی ادب سے قبل کا منظر نامہ

مصنف: ڈاکٹر حاذق فرید

صفحات: 160، قیمت: 107، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: نفیس عبدالحکیم

51، ایم بی ہاؤس، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد (یوپی)

اردو ادب اور دوسری زبانوں میں بھی پریم چند پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ ہندوستانی جامعات یا اس کے باہر پریم چند پر جو بھی تحقیقی کام ہوا ہے، اس میں ایک باب پس منظر کے طور پر پریم چند سے قبل کا فسانوی منظر نامہ رہا ہے۔ یہ پس منظر سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ادبی مباحث کو محیط ہوتے ہیں۔ لیکن مبارکباد کے مستحق ہیں ڈاکٹر حاذق فرید صاحب جنھوں نے اس موضوع (پریم چند کے فسانوی ادب سے قبل کا منظر نامہ) پر ایک مکمل کتاب تحریر کردی۔ حالانکہ ادب میں کچھ بھی حرف آخر نہیں ہوتا۔ دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی قاری کو تشنگی اور کمی کا احساس کھٹک سکتا ہے لیکن اس اہم موضوع پر کتاب لکھنا اپنے آپ میں ایک بڑا کام ہے۔ اس کتاب میں انیسویں صدی کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی تحریکات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ پریم چند کے سامنے اپنے عہد اور اس سے قبل کے سیاسی حالات اور ادبی روایات تھیں۔ اس لیے پریم چند کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پریم چند سے ماقبل ادبی، سیاسی اور سماج صورت حال کو جانا جائے، تاکہ پریم چند کے فکر وفن کی کلی تکشیف ممکن ہوسکے۔

مصنف نے اس کتاب کو چار باب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں سیاسی حالات کو بیان کیا ہے۔ اس میں غدر کے بعد ہندوستان کے سیاسی اور ثقافتی بحران کا جائزہ لیا ہے۔ اس باب کے تحت راجا رام موہن رائے کی تحریک اور سرسید احمد خاں کی تحریک کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ چونکہ راجا رام موہن رائے ہندوستانی معاشرہ کی اصلاح چاہتے تھے۔ وہ توہم پرستی اور بت پرستی کے خلاف تھے۔ مصنف نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ راجا رام موہن رائے کو ہندوؤں کا آئیڈیل سمجھا جاتا تھا اور سرسید کا مشن

بھی کم وبیش یہی تھا اس لیے سرسید کو مسلمانوں کا آئیڈیل سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک طبقے نے سرسید کی مخالفت بھی کی۔ بہت بعد میں سرسید اور ان کے کام کو تسلیم کیا گیا۔

باب دوم میں بیسویں صدی کی اقتصادی، تہذیبی اور ادبی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کے تحت مختلف ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں جیسے روسی انقلاب، علامہ سر محمد اقبال، آزادی کی لہر، جوش ملیح آبادی وغیرہ۔ ان ذیلی عنوانات کے ارتباط معدوم معلوم ہوتے ہیں۔ ادبی حوالے سے روس میں انقلاب کے پیش رو کی حیثیت سے ٹالسٹائی اور فیودر دوستوئسکی کے ادبیات کو متاثر کن بتایا ہے۔ جس کی وجہ سے نوجوان اور عوام کا باشعور طبقہ اپنے معاشرے میں تبدیلیوں کا خواب دیکھتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے مارکس کے نظریے سے تحریک حاصل کر کے روس کے موجودہ نظام کو درہم برہم کر دیا۔ اس کے بعد علامہ اقبال اور جوش کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کے اندر سیاسی تحریک اپنے عروج پر تھی اور اس نے ہماری زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ مہاتما گاندھی کی سودیشی تحریک اور عدم تعاون کی تحریک نے ایک طرف انگریزوں کے اقتدار کو متزلزل کیا تو دوسری طرف ہمارا ادب بھی ان خارجی حالات سے بے خبر نہیں تھا۔ علامہ نے بھی فکری سطح پر حالات کا جائزہ لیا اور اپنے نظریے کی تشکیل کی۔ مصنف نے اپنی بات کی تائید میں مختلف اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

تیسرے باب میں انیسویں صدی کی اردو داستان پر ایک نظر اور اس صدی کے ناول نگاروں کی تخلیقات پر اس عہد کا اثر ہے۔ جس میں ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور مرزا ہادی رسوا کی تخلیقات کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ اردو داستان کے سلسلے میں غواصی کی سیف الملوک سے بات شروع کی گئی ہے۔ پھر فورٹ ولیم کالج اور میر امن کی باغ و بہار اور رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب تک کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی طرح ناول کے ضمن میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت، رتن ناتھ سرشار کے ناول فسانہ آزاد اور مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں دیگر ناول کا بھی ذکر کیا جاسکتا تھا۔

چوتھے اور آخر باب میں خلاصہ کلام کے طور پر دیگر ناقدین کی تحریروں کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پریم چند کے فن پر ان سابقہ ناول نگاروں کا عکس موجود ہے۔ پریم چند نے اسرار معابد پنڈت رتن ناتھ سرشار کے طرز پر لکھا ہے۔ پلاٹ بھی سرشار کے ناولوں کی طرح ڈھیلا ڈھالا ہے اور بعض کردار بھی خوجی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ناول کو اصلاحی بنانے میں وہ نذیر احمد سے متاثر ہوئے اور انداز بیان کے اعتبار سے ان پر رتن ناتھ سرشار کا اثر نظر آتا ہے۔

بہار کی یونیورسٹیوں میں اردو زبان و ادب کی توسیع و ترقی میں اساتذہ کی خدمات

مصنف: ڈاکٹر احمد صغیر

صفحات: 384، قیمت: 350 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: ابراہیم افسر

وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت: سیوال خاص، میرٹھ 250501

زیر تبصرہ کتاب 'بہار کی یونیورسٹیوں میں اردو زبان و ادب کی توسیع و ترقی میں اساتذہ کی خدمات (تحقیق و تنقید)' ڈاکٹر احمد صغیر (مشہور فکشن نگار اور گیا کے انوگرہ میموریل ڈگری کالج میں اُردو کے استاد) کا ایسا ادبی، تحقیقی و تنقیدی دستاویز ہے، جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ موصوف نے جس عرق ریزی، گہرائی، گیرائی، انہماک اور جاں فشانی سے اس کتاب کو مکمل کیا ہے وہ قابل تعریف و ستائش ہے۔ دراصل یہ تحقیقی پروجیکٹ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے مکمل کیا۔ ڈاکٹر احمد صغیر نے اس کتاب کا انتساب ''اُن اساتذہ کے نام جنھوں نے کئی نامور قلم کار پیدا کیے'' کے نام کیا ہے۔ موصوف نے اس تحقیقی و تنقیدی کتاب کو آٹھ (8) عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب 'پٹنہ یونیورسٹی ایک تعارف' کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں پٹنہ یونیورسٹی کی تاریخی اہمیت و افادیت کے ساتھ اس ادارے کے شعبۂ اُردو سے وابستہ اساتذہ کرام کی اُردو زبان و ادب کے فروغ میں دی گئی خدمات کو منصۂ شہود پر لانے کی سعی کی ہے۔ باب میں جن اساتذہ کی فہرست اور قلمی خاکہ پیش کیا گیا ہے اُن کی تعداد 25 ہے جن میں اختر اورینوی، ممتاز احمد، کلیم عاجز، اسلم آزاد، اسرائیل رضا، کلیم الدین احمد، عبدالمغنی اور نذر امام کے نام فہرست میں شامل کیے گئے ہیں۔ باب کے آخر میں پٹنہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل اُن 198 طلبا کی فہرست دی گئی ہے جنھوں نے اس ادارے سے تحقیقی مقالے سپرد قلم کیے ہیں یا کرنے جا رہے ہیں۔

دوسرا باب 'بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی: بہار یونیورسٹی۔ ایک تعارف' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس باب میں اس درس گاہ کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کی کارکردگی کا طائرانہ جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ شعبۂ اُردو سے وابستہ جن 20 اساتذہ کا قلمی خاکہ ڈاکٹر احمد صغیر نے کھینچا ہے ان میں عبدالماجد اختر، عبدالواسع، شکیل الرحمٰن، شمیم احمد، توقیر عالم، نعیم کوثر، ممتاز احمد خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس یونیورسٹی کے تحت لکھے گئے تحقیقی مقالوں کی فہرست (348 وہ تحقیقی مقالے جن پر ڈگریاں تفویض ہو چکی ہیں اور 32 مقالے وہ جن پر تحقیقی کام ہو رہا ہے) بھی ساتھ میں منسلک ہے۔

تیسرا باب 'مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا۔ ایک تعارف' کے نام سے لکھا گیا ہے۔ اس باب میں اس یونیورسٹی کی تاریخی اہمیت، شناخت اور اس کے قیام کے مقصد پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ساتھ ہی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کی خدمات کا بھی اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ شعبہ میں جن 97 اساتذہ نے خدمات انجام دیں ان کی فہرست کے علاوہ یونیورسٹی سطح پر کیے گئے 245 تحقیقی مقالات کی فہرست بھی باب کے آخر میں دی گئی ہے۔

چوتھے باب 'للت نارائن متھلا یونیورسٹی۔ ایک تعارف' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ اس باب کے تحت اس یونیورسٹی کے قیام کا مقصد اور شعبۂ اُردو سے وابستہ 20 اساتذہ کے اسما کی فہرست اور ان کے قلمی خاکے قابل مطالعہ ہیں۔ باب کے اختتام پر 21 ریسرچ اسکالرس کے نام کی نامکمل فہرست دی گئی ہے۔

پانچویں باب کے تحت 'تلکا مانجھی بھاگل پور یونیورسٹی۔ ایک تعارف' کے عنوان سے اس یونیورسٹی کے قیام کے اغراض و مقاصد اور شعبۂ اُردو کی کارکردگی کو صفحۂ قرطاس پر بیان کیا گیا ہے۔ جن اساتذہ نے اس ادارے کے شعبۂ اُردو میں خدمات انجام دیں یا خدمت انجام دے رہے ہیں، ان کی تعداد 11 بتائی گئی ہے۔ ان کے بھی قلمی خاکے سلیقگی کے ساتھ قاری کے سامنے رکھے گئے ہیں۔ 61 طلبا کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے جنھوں نے اس یونیورسٹی کے تحت تحقیقی مقالے تحریر کیے۔

چھٹا باب 'ویر کنور سنگھ یونیورسٹی۔ ایک تعارف' کے نام سے لکھا گیا ہے۔ یونیورسٹی کا قیام، تاریخی پس منظر اور شعبۂ اُردو سے منسلک رہے 9 اساتذہ کے اسما اور ان کے قلمی

خاکے تحریر کیے گئے ہیں، جن 16 طلبا نے اس یونیورسٹی کے تحت تحقیقی مقالے سپردِ قلم کیے ان کے اسما بھی باب کے آخر میں دیے گئے ہیں۔

ساتواں باب 'جے پرکاش نارائن یونیورسٹی۔ایک تعارف' کے تحت لکھا گیا ہے۔ اس یونیورسٹی کے مختصر تعارف کے ساتھ اس کے علمی و ادبی کارناموں اور شعبۂ اُردو میں درس و تدریس کی خدمات انجام دینے والے 11 اساتذہ کے اسما، ان کے قلمی خاکے ڈاکٹر احمد صغیر نے پیش کیے ہیں۔اس یونیورسٹی کے تحقیقی مقالوں کی فہرست منسلک نہیں کی گئی ہے۔

آخری اور آٹھواں باب 'بی۔این۔منڈل یونیورسٹی۔ایک تعارف' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔یونیورسٹی کے مختصر تعارف کے ساتھ 10 اساتذہ کے اسما اور ان کا مختصر قلمی خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی اُن 43 ریسرچ اسکالرس کی فہرست بھی دی گئی ہے جنھوں نے اس یونیورسٹی کے تحت مقالے رقم کیے ہیں۔

المختصر! یہ کتاب بہار کے ادبی افق پر ایک نئے دور کے آغاز کی غماز ہے۔ڈاکٹر احمد صغیر نے اس تحقیقی کام کو وسیع مطالعے، سخت محنت اور لگن کے ساتھ انجام دیا ہے۔پیش لفظ کے مطابق اس پروجیکٹ کے شروع میں جو سوال نامے اساتذہ کو بھیجے گئے تھے اس میں سے صرف اور صرف ڈھائی فی صدی نے ہی انھیں پُر کیا۔خیر! یہ ادبی اور علمی کارنامہ اکیلے شخص کی کاوش اور جہت کا نتیجہ ہے۔اس ادبی دستاویز کے منظرِ عام پر آنے سے بہار ہی نہیں بلکہ ملک اور بیرونِ ملک کے طلبا اور اساتذہ کو تحقیق کے میدان میں یہ فائدہ ہوگا کہ ان کے پاس تحقیقی موضوعات کی فہرست ہوگی اور تحقیقی مقالات کے عنوانات وموضوعات کا انتخاب کرتے وقت مماثلت اور یکسانیت سے بچا جا سکے گا اور نئے تحقیقی عنوان پر مقالے لکھے جا سکیں گے۔

صحت اور طب

علاج و معالجہ

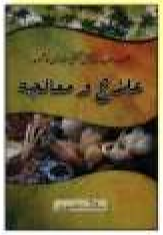

مصنف: سالک دھامپوری

صفحات: 116، قیمت 83، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: جے پی ایس پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: زبیر خاں سعیدی

ایف 33، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ تصنیف معروف صحافی و ادیب سالک دھام پوری کے صحت وطب سے متعلق لکھے گئے کچھ تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔یوں تو سالک دھام پوری ایک ادیب، مضمون نگار، شاعر، افسانہ نگار اور سیاسی وسماجی اور مذہبی مضامین کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح میں بھی پختہ کار ہیں لیکن صحت وطب کے حوالے سے یہ ان کی پہلی کاوش ہے۔جس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں کہ اس کے پیچھے ایک خاتون کا ہاتھ ہے وہ اس طرح کہ جن دنوں حکیم سید احمد خان سی سی آر یو ایم کے ابوالفضل انکلیو میں واقع یونانی اسپتال میں بیٹھا کرتے تھے ان دنوں مصنف بھی ان کے پاس بہ سبب رفاقتِ خاص بیٹھ جایا کرتے تھے،اسی دوران ایک برقع پوش خاتون انھیں ہی حکیم سمجھ لیتی ہیں اور ان سے اپنے مسائل پر گفتگو شروع کر دیتی ہیں جس کے سبب انھیں علاج و معالجے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔انسان کی شخصیت مختلف مراحل میں گوناگوں پہلو لے کر سامنے آتی ہے، سالک دھام پوری کی فن طب سے متعلق کی گئی یہ کاوش بھی اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

مصنف نے اپنی گفتگو کا آغاز عہد نبوی کے طب سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ظہور اسلام کے بعد جب طب نبوی سے اس فن کی نشاۃ ثانیہ ہوئی، عرب میں اس وقت ایک معروف طبیب حارث بن کلاوہ تھا، رفتہ رفتہ فن طب کی کتابیں سریانی، عبرانی اور یونانی سے عربی زبان میں منتقل ہونی شروع ہوگئیں۔ ہندوستان میں بھی اس وقت ویدک طریقہ علاج رائج تھا،مغل بادشاہوں کی آمد کے ساتھ طب یونانی کا رواج بھی شانہ بشانہ شروع ہوگیا۔اہل یورپ نے دیسی جڑی بوٹیوں کے استعمال کو ہمارے ملک ہندوستان سے ہی حاصل کیا۔

اس مجموعے میں پہلا تحقیقی مقالہ طب یونانی کے خاموش خادم حکیم محمد اجمل خاں مرحوم سے متعلق ہے۔شاید کم ہی لوگوں کو علم ہو کہ حکیم اجمل خاں مرحوم حافظ قرآن بھی تھے اور دینی علوم میں خاصی دسترس بھی رکھتے تھے، علم طب انھوں نے اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید خان حاذق الملک سے حاصل کیا اور عملی تربیت اپنے والد محترم حکیم محمد محمود خان اعظم سے حاصل کی۔آپ نے 19 سال کی کم عمری میں ہی منطق، فلسفہ، طبیعات، ادب، حدیث، تفسیر اور فقہ جیسے موضوعات پر بھی مکمل عبور حاصل کرلیا تھا۔

فاضل مولف نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں حکیم اجمل خان کی مکمل مختصر سوانح کے ساتھ ساتھ خود حکیم محمد اجمل خاں کے خطبات سے استفادہ کرتے ہوئے ان کی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔

مصنف نے پہلا طبی مقالہ کولیسٹرول کے بارے میں تحریر کیا ہے جس میں ایک ماہر فن کی طرح جسمانی ہارمون، اعصاب، وٹامن، پتے کا بائل، Suburn (وہ مادہ جو جلد کو نرم رکھتا ہے) وغیرہ موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور بے حد آسان الفاظ میں خون میں کولیسٹرول کی اوسط مقدار کا خاکہ پیش کیا ہے، ساتھ ساتھ روزمرہ کی خوردنی اشیاء میں موجود کولیسٹرول کی مقدار سے بھی آگہی فراہم کرائی ہے۔

دوسرا مقالہ آب زم زم اور کینسر سے متعلق ہے جس میں مراقش کی ایک معروف اداکارہ کی داستان پیش کی ہے کہ کس طرح وہ کینسر میں مبتلا ہوتی ہے اور تمام جتن کرنے کے بعد جب مکہ مکرمہ کا رخ کرتی ہے اور زم زم کا استعمال کرتی ہے تو اسے مکمل شفا حاصل ہوجاتی ہے۔اس کے فوراً بعد یہ دوسرا مقالہ کینسر، علامات، اسباب اور اس کے علاج سے متعلق پیش کیا ہے، جس میں کینسر کی مختلف اقسام، اسباب سے بحث کی ہے۔

چوتھا مقالہ بادام کی افادیت سے متعلق ہے۔میوہ جات میں بادام کو میوؤں کا بادشاہ کہا جاتا ہے، بادام نہ صرف ایک غذا ہے بلکہ یہ بہت سی بیماریوں کے لیے شفا کا کام بھی کرتا ہے۔بادام کھانے سے دماغ تیز ہوتا ہے سے لے کر بادام کے صحت بخش فوائد سے متعلق تفصیلی گفتگو اسی مقالے کے ضمن میں کی گئی ہے۔

پانچواں مضمون بلڈ گروپ کے مطابق غذاؤں کے انتخاب پر تحریر کیا گیا ہے جیسے کہ جن لوگوں کا بلڈ گروپ 'بی' ہے، اس گروپ کے لوگوں کو اناس، کیلے، انگور، دالیں اور ہرے پتوں والی سبزیوں کا زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔'او' گروپ والوں کو اعلیٰ درجے کی پروٹین والی غذاؤں کا استعمال زیادہ کرنا چاہیے۔وغیرہ۔

اگلے مقالے میں ایک جنرل فزیشین کی طرح علاج و معالجے سے عوامی سیر اصل گفتگو ہے۔اس کے بعد نشے کا تذکرہ ہے کہ لوگ کس طرح نشے کے عادی ہوجاتے ہیں اور اس سے بچاؤ کس طرح ممکن ہے؟

دل کو صحت مند رکھنے کے لیے 32 کارآمد نسخے بھی ایک الگ مضمون کی شکل میں شامل ہیں وہیں یادداشت بڑھانے کے 9 آسان طریقے بیان کیے ہیں جو عام قاری کو ضرور پسند آئیں گے، پھر انسانی صحت کے لیے غذا کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے لحمیات، نشاستہ غذائیں، روغنیات، نمکیات، پانی، حیاتین جیسے اہم موضوعات پر کارآمد

باتیں نقل کی ہیں۔ انسانی غذا میں انڈے کا رول کیا ہے یہ الگ سے مضمون ہے، اس کے بعد صفائی (طہارت) جو اسلام میں نصف ایمان کا درجہ رکھتا ہے اس سلسلے میں ایک طویل مضمون تحریر کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ٹی بی۔ چکن گنیا جیسے موذی امراض کے سلسلے میں تدابیر اور حکمتیں بیان کی ہیں۔

میری ذاتی رائے کے مطابق یہ مجموعہ نہایت اہم، دلچسپ اور معلوماتی مضامین کا ایک مجموعہ ہے جسے عام قاری کے علاوہ ماہرین فن طب کے حلقوں میں بھی پذیرائی حاصل ہونے کے قوی امکانات ہیں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے تو اس کی اہمیت بہرصورت محقق اور تسلیم شدہ ہو جاتی ہے۔ میری نیک خواہشات کتاب اور صاحب کتاب کے لیے ہیں۔

مکاتیب

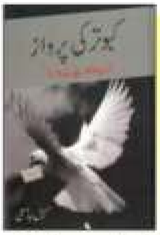

کبوتر کی پرواز (باپ کا خط بیٹے کے نام)

مصنف/ ناشر: سہیل جامعی

صفحات: 136، قیمت 92، سنہ اشاعت: 2017

مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر

C024، اوکھلا وہار جامعہ نگر، نئی دہلی 25

پیش نظر کتاب 'کبوتر کی پرواز' سہیل جامعی کے 36 خطوط کا مجموعہ ہے جس کا مکتوب الیہ شارق نام کا ایک نوجوان ہے جو تعلیمی ادوار سے گزر رہا ہے۔ خلاف معمول مصنف نے 'پیش لفظ' سے صرف نظر کرتے ہوئے کتاب کے شروع میں اپنے بچوں کے نام انتساب کیا ہے۔ مجموعے میں شامل خطوط 3 فروری 2007 سے 24 نومبر 2014 کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے ہیں۔

یہاں خط لکھنے کا انداز بالکل سہل و سادہ ہے اور خود کلامی کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ مصنف کے دل میں آنے والے، خیالات ہر خط میں برابر جگہ پا لیتے ہیں۔ خطوط کے اس مجموعے کے مطالعے کے دوران قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جس طرح ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے جیل سے 'اپنی بیٹی اندرا کے نام' خط لکھے تھے اور جو بعد میں 'باپ کا خط بیٹی کے نام' سے منظر عام پر آیا اسی طرح یہاں بھی اس کا عکس نظر آتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مصنف آزادی کی فضا میں سانس لے رہا ہے۔

پہلے خط میں بیٹے کو تعلیم کے حصول کے لیے شہر بھیجنے کا ذکر ہے تاکہ وہاں رہ کر وہ تعلیم حاصل کر سکے ساتھ یہ نصیحت بھی کی گئی ہے کہ:

''...انسان کو دنیا میں آنے کے بعد ایسے کام انجام دینا چاہیے کہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو تو مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر قائم رہے اور اس مسکراہٹ کو دیکھ کر تمام نگاہیں آنسوؤں سے لبریز ہو کر چھلک پڑیں یعنی تمام لوگوں کو اس کے جانے کا افسوس ہو اور لوگ ہمیشہ اسے اپنی یادوں میں شامل رکھیں۔'' (ص 9)

یہاں معاشرتی زندگی میں خود کو جذب کرنے اور اپنی امتیازی شان بنائے رکھنے کا درس ہے۔ اگلے خط میں ہر مشکل وقت میں ہمت اور استقلال کے ساتھ کھڑے ہونے کا حوصلہ دلایا گیا ہے اور تمثیلی طور پر ایک راجہ اور اس کے غلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

ایک خط میں موجودہ نظام تعلیم کی خامیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اکثر والدین دوسروں کی ضد یا نقل میں اپنے بچوں پر بے جا دباؤ ڈالتے ہیں کہ تم بھی اس کی طرح پڑھائی کرو تاکہ ترقی کر سکو۔ جبکہ یہ بات جگ ظاہر ہے کہ ہر بچہ یا انسان منفرد صلاحیتوں کو لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اسے اسی طرح کی تعلیم دینی چاہیے جس کی جانب وہ راغب ہو۔ اس لیے مصنف کا یہ کہنا درست اور حقیقت کے قریب ہے:

''ہر ایک کو ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کی اس دیوانگی نے بچوں سے اس کا بچپن، بچپن کی خوشیاں و مسکراہٹیں اور بچپن کا حسن و لطافت ہی نہیں چھینا ہے بلکہ ان سے ان کی شخصیتیں بھی چھین لی ہیں۔ وہ انمول خزانے چھین لیے جو فطرت نے ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر رکھا تھا۔ ساتھ ہی عظیم الشان کارناموں کے وہ لامحدود امکانات چھین لیے ہیں جو ان کی مخصوص شخصیتوں سے وابستہ تھیں۔'' (ص 26-25)

یہاں مصنف کے خیال میں بچوں کی فطری صلاحیت کو بروئے کار لانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ مستقبل کا ایک کامیاب شخص بن سکے۔

ایک خط میں مطالعے کی مشق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک ہی وقت میں اتنا ہی سبق یاد کرنا چاہیے جسے بخوبی یاد رکھا جا سکے اور دلچسپی بنی رہے، اکتاہٹ پیدا نہ ہو۔ اس کے کئی حصے بنا کر یاد کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ تب ہی یہ پوری طرح ذہن نشیں ہو سکتی ہے۔

یہ کتاب جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے تو وہ کئی حقائق سے پردہ بھی اٹھاتی جاتی ہے جن میں مجاہدین آزادی کا ذکر بھی شامل ہے جنھوں نے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں کوئی بھی کسر نہیں چھوڑی۔ ان میں سب سے پہلا نام سید احمد شہید رائے بریلوی کا ہے، جنھوں نے عوام میں ایسا دینی انقلاب پیدا کر دیا تھا جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ آخر کار 6 مئی 1831 کو فرنگیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کے بعد مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا کفایت اللہ کافی، مولانا احمد شاہ مدراسی کے علاوہ بے شمار ایسے نام آتے ہیں جن کی روح میں آزادی کا جذبہ پوری طرح سرایت تھا۔ آج بھی ان مجاہدین کے اعلیٰ کارناموں کو یاد رکھنے کی پوری طرح ضرورت ہے۔

ایک خط میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد حقوق والدین کا ذکر کیا گیا ہے جس کی قرآن کے علاوہ احادیث میں بھی خوب تاکید کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت اویس قرنیؓ کا ذکر بھی آیا ہے کہ والدین کی تیمارداری کرنے کی وجہ سے ان کا مقام کس قدر بلند ہو گیا تھا جس کی تصدیق خود ہمارے نبیؐ نے بھی کی تھی۔

خطوط کے اس مجموعے کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے جس سے قاری کو کہیں بھی دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ وقت میں اس طرح کے پند و نصیحت کی ضرورت ماضی کے مقابلے کہیں زیادہ ہے۔ آج کل تیز تر زندگی میں جہاں مذہبی اقدار اور اخلاق کی دھجیاں بکھر رہی ہیں وہاں بہت سے لوگوں کے سینے ان علوم سے یکسر خالی ہیں جو مذہب و اخلاق کے زوال کی علامت ہے۔ اس پس منظر میں سہیل جامعی واقعی قابل تعریف ہیں کہ اس مجموعے کے ذریعے انھوں نے نہ صرف ایک بیٹے کی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے بلکہ اس سے دوسرے بھی فیضیاب ہو سکتے ہیں تو کچھ عجب نہیں۔

■

حرف کار سافٹ ویئر

اسلام آباد: جب سے موبائل میں با آسانی اردو ٹائپ کرنے کی سہولت آگئی ہے تب سے اردو رسم الخط نے بھی سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کی دنیا میں اپنی شناخت بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے ورنہ اردو رسم الخط سے واقف کار بھی اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کو مجبور تھے۔ اسی لیے ایک عرصے تک فیس بک، ٹویٹر اور وہاٹس ایپ جیسے ایپ میں رومن رسم الخط ہی آسان ذریعہ ترسیل بنا ہوا تھا۔ اب اردو رسم الخط بھی خیر خوبی سے ان ذرائع میں مستعمل ہونے لگا ہے اور اردو داں افراد اردو رسم الخط کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ اس معالے میں نئی نسل اپنے بزرگوں سے ایک قدم آگے ہے۔ اس لیے وہ موبائل/ ٹیب یا اس طرح کے دیگر الیکٹرانک آلات پر اردو رسم الخط لکھنے میں زیادہ آگے ہیں، بزرگ نسل کے ادبا و شعرا کو ٹائپنگ میں دشواریاں ہیں کیونکہ وہ ٹیکنالوجی سے کتراتے رہے ہیں۔ اس لیے بعض بزرگ نسل کے لکھنے والوں اور اسی طرح نوجوانوں کو بھی اردو لکھنے میں املا اور جملے کی غلطیوں کا خوف رہتا ہے کیونکہ ٹائپنگ میں اکثر املا اور جملہ کی غلطیاں سرزد ہوجایا کرتی ہیں۔ اس پریشانی سے نجات پانے کے لیے انگریزی میں ورڈ پروسیسنگ جیسے سافٹ ویئر میں خودکار اصلاح الفاظ (Autocorrect) کا نظام ہے جس کے تحت املا اور جملوں کی نحوی ساخت وغیرہ اگر غلط ٹائپ ہوجائے تو خودکار اصلاح کا نظام ان خامیوں کو درست کر دیتا ہے۔ ایک خودکار اصلاح الفاظ کا نظام تو موبائل صارفین جانتے ہی ہیں مثلاً جب ہم کچھ ٹائپ کرنا شروع کرتے ہیں تو ہمارے ادھورے الفاظ کو مکمل کرنے کے لیے خودکار اصلاح الفاظ نظام کے تحت کچھ متبادل الفاظ نظر آتے ہیں۔ یہ سہولت اردو میں بھی دستیاب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی اس خودکار اصلاح الفاظ کے چکر میں بے محل الفاظ بھی ٹائپ ہوجاتے ہیں لیکن جملوں کی نحوی ساخت اور املا وغیرہ کے خودکار اصلاح کا نظام اردو میں اب تک نہیں تھا۔ پاکستان کے مشہور ادیب اختر رضا سلیمی اور ان کی ٹیم نے اس جانب توجہ دی ہے۔ ان کی ٹیم اردو داں طبقے کو انگریزی کے طرز پر ایک ایسے سافٹ ویئر کا تحفہ دینے والی ہے جس کی مدد سے موبائل اور دیگر الیکٹرانک آلات پر بے جھجک لوگ اردو ٹائپ کر سکتے ہیں ان کی تحریر کی املائی اور نحوی غلطیوں کو یہ سافٹ ویئر خود بخود درست کر دے گا۔ اس طرح اسکرین پر اردو لکھنے والوں کو املا اور قواعد کی غلطیوں سے نجات مل سکے گی۔ اس سافٹ ویئر کا نام اختر رضا سلیمی نے 'حرف کار' رکھا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے پاکستان کے انگریزی اخبار ٹریبون کو بتایا کہ انھوں نے سافٹ ویئر پروگرامر سعید رضا خان کے ساتھ ایک ٹیم بنائی اور عالمی سطح پر اردو کے ادبا کی ڈیجیٹل ضرورتوں کے پیش نظر اس جانب کام کرنا شروع کیا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ جب ہم نے کام کرنا شروع کیا تو ہمارے سامنے انگریزی زبان کے سافٹ ویئر کا نمونہ موجود تھا۔ انگریزی زبان کے لیے ورڈ پروسیسنگ پروگرام (Word Processing Programme) میں جس طرح خودکار اصلاح کے سافٹ ویئر انسٹال ہوتے ہیں کی مدد سے کوئی لفظ اگر غلط بھی لکھ دیا جائے، تو وہ لفظ اپنی اصلاح خود کر لیتا ہے۔ اسی بنیاد پر ہم نے بھی خاص توجہ خودکار اصلاح (Auto correction) پر مرکوز کی۔ اس سافٹ ویئر کی مدد سے نہ صرف غلط ٹائپ شدہ الفاظ کی اصلاح خودکار طریقے پر ہوگی بلکہ اردو طرز تحریر کے مطابق جملے کی ساخت بھی درست کی جاسکے گی۔ یہ سافٹ ویئر تیار ہوجائے تو یقینی طور پر ڈیجیٹل دنیا میں اردو زبان کے ساتھ اردو رسم الخط کا وجود مزید مستحکم ہوگا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 فروری 2018

نابینا بچہ قرآن پاک اور ہزاروں قصائد کا حافظ

قاھرہ: غیر ملکی خبر رساں ادارہ کے مطابق مصر میں کمسن نابینا بچہ عبداللہ عمار السید نے صرف 3 ماہ میں نہ صرف قرآن پاک حفظ کیا بلکہ قرآن کا انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں

ترجمہ بھی یاد کر رکھا ہے۔ عبداللہ شمالی گورنری کے الرمل شہر میں تل الجراد کا رہائشی اور جامعہ الازھر کے ایک اسکول میں زیر تعلیم ہے۔ مصر کی وزارت اوقاف اور مذہبی امور کی جانب سے نابینا حافظ کے اعزاز میں خصوصی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں حافظ عبداللہ نے تلاوت کے بعد اس کا انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ کر کے تقریب کے حاضرین اور عالم اسلام کو حیران کر دیا۔ مصر کے وزیر اوقاف ڈاکٹر محمد مختار نے تقریب سے خطاب

طلبا کے لیے 35 زبانیں سیکھنے والی ٹیچر 'گلوبل پرائز'

کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے نابینا کمسن بچے کا ذاتی طور پر ٹسٹ لیا تو انکشاف ہوا کہ اس نے بغیر غلطی کے قرآن کی آیات اور صفحات کے نمبر بھی یاد کر رکھے ہیں۔ نابینا حافظ کے والد عمار محمد السید نے بتایا کہ ان کے بچے نے 8 سال کی عمر میں صرف تین ماہ کے عرصے میں پورا قرآن کریم مکمل حفظ کر لیا تھا۔ حفظ کے بعد بچے نے قرأۃ عشرہ میں مہارت حاصل کی اور بعد میں انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ جبکہ عبداللہ السید نے زمانہ جاہلیت، اموی دور اور جدید دور کے ہزاروں عربی قصائد بھی یاد کر رکھے ہیں۔ بچے کے والد کے مطابق جامعہ الازہر کے سربراہ الشیخ احمد الطیب نے بچے کو شعر و ادب اور دیگر علم وفنون سکھانے کی تجویز پیش کرتے ہوئے بچے کے تمام تعلیمی اخراجات پی ایچ ڈی تک سرکاری سطح پر ادا کرنے کا اعلان کر رکھا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 2 اپریل 2018

طلبا کے لیے 35 زبانیں سیکھنے والی ٹیچر 'گلوبل پرائز'

لندن: دنیا میں گھر کے بعد اسکول وہ جگہ ہے جہاں بچے سب سے زیادہ وقت اور اپنی ابتدائی زندگی کے اہم سال گزارتے ہیں اور جب اسکول میں انھیں ان کی اپنی زبان میں خوش آمدید کہنے والا کوئی موجود ہو، تو اس سے زیادہ خوشگوار بات شاید ہی کوئی اور ہو۔ برطانیہ کے شہر برینٹ کے 'ہلپرٹن کمیونٹی اسکول' کے بچوں میں بڑی تعداد تارکین وطن بچوں کی ہے۔ 39 سالہ اینڈریا ظفیر اکاؤ اسی اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ اینڈریا نے اپنے اسکول کے بچوں اور ان کے والدین سے رابطوں کو بہتر بنانے کے لیے 35 مختلف زبانوں میں بچوں اور والدین کو اسکول میں خوش آمدید اور الوداع کہنا سیکھا اور اب ان زبانوں کو ان سے رابطے کے لیے نہایت خوش اسلوبی سے استعمال کرتی ہیں۔ اینڈریا نے جو زبانیں سیکھیں ان میں اردو، عربی، ہندی، تامل، گجراتی، پرتگالی، صومالی، رومانین اور پولش زبانیں شامل ہیں۔ اینڈریا کے کام کی لگن اور جانفشانی نے پوری دنیا کو متاثر کیا اور وہ نہ صرف دنیا کی 10 اساتذہ کی فہرست میں شامل ہوئیں، بلکہ انھیں 'وارکی فاؤنڈیشن گلوبل ٹیچر پرائز' کے لیے بھی شارٹ لسٹ کیا گیا۔ برطانوی اخبار 'ڈیلی میل' نے اینڈریا کے حوالے سے بتایا کہ اینڈریا کا کہنا ہے کہ ''میرے طلبا جب مجھ سے مانوس ہوئے اور مجھے اپنے گھروں اور حالات کے متعلق بتایا تو مجھے پتا چلا کہ وہ کتنے مسائل اور پریشانیوں کا شکار ہیں۔ کسی کو اس کی اپنی زبان میں خوش آمدید کہنا بہت سی رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے۔''

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 17 فروری 2018

سچیترا نے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام درج کرایا

دبئی: دبئی میں رہنے والی یہ لڑکی ساتویں جماعت کی طالبہ ہے۔ اس نے حال ہی میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے دو اعزازات اپنے نام کیے ہیں۔ ایک تو اس نے 102 زبانوں میں گانے سنائے۔ اور دوم مسلسل 6 گھنٹے 15 منٹ تک اس نے کنسرٹ میں گانے پیش کیے جو اس کی ہمت اور یادداشت کو ظاہر کرتے ہیں۔ دلچسپ

بات یہ ہے کہ سچیترا نے ایک سال قبل اس کی تیاریاں شروع کیں اور مسلسل محنت سے مختلف زبانوں میں گانے یاد کرنے شروع کر دیے۔ اس سے قبل وہ کئی بھارتیہ زبانوں میں گاتی رہی ہیں جن میں ہندی، ملیالم، اور تامل کے علاوہ انگریزی زبانیں بھی شامل ہیں۔ 25 جنوری 2018 کو سچیترا نے دبئی میں بھارتی سفارت خانے کی ایک تقریب میں اپنے منفرد فن کا مظاہرہ کر کے دنیا بھر کو حیران کر دیا اور 102 زبانوں میں 6 گھنٹے 15 منٹ تک گانے گائے۔ ان کا تعلق بھارت میں کرناٹک کے ایک موسیقار گھرانے سے ہے۔ انھوں نے 8 برس سے کلاسیکی موسیقی کا آغاز کیا اور 2016 میں مختلف زبانوں میں گانے کی مشق شروع کی۔ نومبر 2017 میں سچیترا نے جاپانی زبان میں گانا گایا۔ انھوں نے اپنے والد کے دوست ایک جاپانی ڈاکٹر سے سیکھا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے عربی میں گانے گائے پھر پائی زبان میں بھی کوشش کی۔ اس کے بعد وہ ہر ہفتے ایک نئی زبان کا گانا سیکھتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی ذہن میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کا خیال آیا۔ سچیترا نے بتایا کہ مجھے ایک گانا سیکھنے اور یاد کرنے میں دو گھنٹے لگتے ہیں اور اگر اس کا تلفظ آسان ہو تو صرف آدھے گھنٹے میں بھی گانا یاد ہو جاتا ہے۔ کسی مشکل گانے کو یاد کرنے کے لیے وہ اسے بار بار سنتی ہیں لیکن ان کے مطابق فرانسیسی، ہنگری اور جرمن زبانوں کے گانے یاد رکھنا سب سے مشکل امر ہے اور انھیں یاد کرنے میں کبھی دو دن بھی لگ جاتے ہیں۔ قبل ازیں 2008 میں ایک غزل گائیک ڈاکٹر کیسی راجوسری نواس نے 76 مختلف زبانوں میں گانے گا کر ایک ریکارڈ بنایا تھا جس کے بعد انھوں نے مزید 85 زبانوں میں گیت پیش کیا تھا تاہم سچیترا نے مسلسل محنت سے یہ ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ رومانیہ کی ایک گلوکارہ اینڈرے گوگن نے مسلسل 3 گھنٹے 20 منٹ تک گانا گیا تھا جو ایک ریکارڈ تھا اور سچیترا نے اسے بھی توڑ ڈالا۔

سچیترا جن زبانوں میں بہ آسانی گانا گاتی ہیں ان میں سنسکرت، البانوی، آسامی، آذر بائیجانی، بڈاگو، بلوچی، باسک، باروی، میتھلی، افریقی، بنگالی، بھوجپوری، بھوٹانی، بلغارین، کینٹونیس، چیک ڈینش، دھیوہی، ڈوگری، ولندیزی، انگریزی، جاپانیسٹونین، فنش، فرنچ، گڑھوالی، جرمن، یونانی، گورانی، گجراتی، کیورک، کونکانی، کوریائی، مادری، مراٹھی، نیپالی، رومین، ملاگاسی، ملائی، مالٹیز، کیوشیا، راجستھانی، رومانی، روسی، سربیائی، سندھی، سنالی، سلواکی، سلووینین، صومالی، ویڈش، تاگلوک، تاجک، تامل، تھائی، تبتی، تیلو، یوکرینی، ازبک، ویتنامی، ویلش، وودشہ، یاکوتی، یوروبا، زولو، اطالوی، جاپانی، آئس لینڈی، کرد زبان، پشتو، ترک، آرمینیائی، ہسپانوی، پرتگالی، اردو، عربی اور ہندی وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 22 فروری 2018

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قومی اردو کونسل تعاون سے

اردو ادب کی دوصدیاں

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے انجمن ترقی اردو (ہند) اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والا چار روزہ بین الاقوامی سمینار بہ عنوان 'اردو ادب کی دو صدیاں: تاریخ، تہذیب اور ادب' 15 مارچ کو پانچ بجے شام ایوان غالب میں شروع ہوا۔ سمینار کے کلیدی خطبے میں عہد ساز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ قوم، قومیت، قوم پرستی وغیرہ تصورات ہمارے یہاں غیر ممالک سے آئے ہیں اور وہاں بھی یہ یوروپین روشن فکری کے پیدا کردہ ہیں۔ پروفیسر گوتم چکرورتی نے کہا کہ اردو کے عظیم ادب کو خصوصاً ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ اردو اداروں کو اپنے سمیناروں کو بامعنی بنانے اور ان میں شرکا کی تعداد بڑھانے کے لیے ہر ممکن کوششیں کرنی چاہئیں۔ افتتاحی اجلاس میں پرنسٹن یونیورسٹی کی پروفیسر فوزیہ فاروقی بھی موجود تھیں۔ نئی طرز کی فلموں کے موجد اور سنگاپور میں مقیم اقبال کے نئے سوانح نگار ظفر انجم بھی تشریف فرما تھے۔ افتتاحی اجلاس کے اختتام کے بعد ثقافتی محفل آراستہ کی گئی جس میں رادھیکا چوپڑا نے اپنی غزل گائکی سے سماں باندھ دیا۔

دوسرے روز کے پہلے اجلاس میں 'اردو ہے جس کا نام' عنوان کے تحت پروگرام کا انعقاد ہوا، جس میں اے جے تھامس، حنا کوثر، آسیہ ظہور اور معاذ بن بلال نے شرکت کی۔ اس اجتماعی مکالمے میں اردو کے فروغ وارتقا پر ایک عمومی گفتگو کی گئی، جس میں غالب کے کلام کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر سنایا گیا اور اردو کے فروغ کے بہتر امکانات پر غور وفکر کیا گیا۔ دوسرا اجلاس 'ہندوستانی عوامی قصے: اردو ادب اور ڈرامہ' حبیب تنویر کی یاد میں، کے عنوان کے تحت منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام کو معروف

ٹی وی اینکر نغمہ سحر نے موڈریٹ کیا، جس میں داستان گو محمود فاروقی نے گفتگو کی۔ تیسرے اجلاس 'ادبی شعور اور اجتماعی زندگی' میں پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر رضوان قیصر، ڈاکٹر عرفان اللہ فاروقی نے گفتگو کی۔ اس اجلاس کو موڈریٹ ڈاکٹر محمد کاظم نے کیا۔ چوتھے اجلاس 'امیر و کبیر کا ہندوستان' کو موڈریٹ کرتے ہوئے معروف قلم کار فاروق ارگلی نے حضرت امیر خسرو، کبیر کی شاعری اور اس میں پائے جانے والے مشترکہ تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالی۔ تصدق حسین، ڈاکٹر حسین رضا خان، ڈاکٹر نریش نے گفتگو کی۔ پانچواں اجلاس 'اردو میں تانیثی ادب' کے عنوان کے تحت منعقد ہوا، جس میں باراں فاروقی، ثنا فاطمہ اور رحمٰن عباس نے شرکت کی۔ شام شہریاراں کے تحت سعید عالم اور دانش اقبال نے 'سر اقبال' کے نام سے ڈرامہ پیش کیا۔

تیسرے روز کے پہلے اجلاس میں ترجمہ نگاری مسائل: اسباب اور سدباب میں محمد اسدالدین، انجم حسن، پروفیسر انیس الرحمٰن، عبدالنصیب خان شرکائے گفتگو تھے۔ دوسرے اجلاس نثری نظم: تجربات واثرات میں عہد ساز نقاد اور معروف ناول نگار و شاعر پروفیسر شمس الرحمان فاروقی نے کہا کہ سب سے پہلے اگر کسی نے قرار واقعی اردو میں نثری نظم کہی ہے تو وہ احمد ہمیش ہیں۔ نثری نظم بہرحال نظم ہے۔ نظم کے لیے موزونیت شرط نہیں۔ اس جلسے میں فوزیہ فاروقی نے بھی اظہار خیال کیا۔ 'روبرو: غزل اس نے چھیڑی' کے تحت تیسرے اجلاس میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر احمد محفوظ اور ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے شرکت کی۔ چوتھے اجلاس 'اردو ناول کی پھیلتی کائنات' میں ابرار مجیب، رحمان عباس اور محمد سجاد نے شرکت کی۔ پانچواں اجلاس '1857 سے پہلے کا ہندوستان، ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا' میں سید ظہیر حسین جعفری، رعنا صفوی اور ثنا عزیز نے شرکت کی۔ شام شہریاراں کے عنوان کے تحت محمود فاروقی اور دارین شاہدی نے داستان پیش کی۔ تیسرے دن کا آخری پروگرام مشاعرہ تھا جس میں گلزار دہلوی، اظہر عنایتی، فرحت احساس، ذکی طارق، شارق کیفی، نشتر امروہوی، لیاقت جعفری، شکیل جمالی، رحمان مصور، عذرا نقوی اور اظہر اقبال نے اپنے اپنے کلام پیش کیے۔

چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس 'اردو ادب کی دو صدیاں : تاریخ، تہذیب اور ادب' کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے کہا کہ اردو کے ادارے ہمارے مستقبل اور آئندہ کی تہذیب وتمدن کے ضامن ہیں۔ یہ سمینار اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ اس میں مقالات پیش نہیں کیے گئے۔ بلکہ اجتماعی مکالمے اور تبادلہ خیالات کیے گئے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ اردو ادب کی دوصدیاں : تاریخ، تہذیب اور ادب کے عنوان پر منعقد یہ سمینار کافی کامیاب رہا۔ اختتامی اجلاس میں اظہار تشکر کے دوران انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ ہم نے یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ دیگر حلقوں کے سرگرم اور متحرک افراد اور ماہرین کو بھی اس جشن میں مدعو کیا۔ ہم نے ہندوستان کے معروف پبلی کیشنز کو بھی مدعو کیا۔ اس سے قبل چوتھے روز کے پہلے اجلاس میں داستان گوئی کے احیا کی کہانی کے عنوان کے تحت منعقد پروگرام میں انوشا رضوی، پونم گردھانی نے بھی گفتگو کی۔ 'اردو میں جاسوسی ادب کی روایت' اجتماعی مکالمے میں ڈاکٹر خالد جاوید، پروفیسر انیس اشفاق اور دور درشن نیوز کے سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور لیس احمد خان نے حصہ لیا۔ آخری روز کے تیسرے اجلاس میں ہندی فلموں میں اردو کے موضوع پر دانش اقبال، منوج پنجابی، ظفر انجم، عاصم صدیقی نے مذاکرے میں شرکت کی۔ اس موقعے پر الہ آباد یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر نوشاد کامران نے اپنا مقالہ بھی پیش کیا۔ چوتھے اجلاس کا عنوان تھا 'کتابیں بولتی ہیں' جس میں ارمیلا گپتا، شیراز حسن عثمانی، ویشالی ماتھر، اروشی بھوناآلیہ، آرشیوا پریہ اور ظفر انجم نے شرکت کی۔ دراصل یہ اجلاس کتابوں، تراجم اور پینٹنگس وغیرہ کی طباعت پر گفتگو کا اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے بڑے بڑے ہندی وانگریزی پبلی شرز کے نمائندوں نے شرکت کی اور انھوں نے بتایا کہ اردو کی کن کتابوں کو وہ ترجمے اور رسم الخط تبدیل کر کے ہندی میں چھاپنے کو اہمیت دیتے ہیں۔ پانچوں اجلاس 'دلی جو اک شہر تھا' کے عنوان سے منعقد ہوا۔ جس میں بلال احمد، سہیل ہاشمی، عزیزالدین اور رعنا صفوی نے شرکت۔ شام شہر یاراں کے تحت صابری برادران نے اپنی قوالی سے سامعین کو لطف اندوز کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 و 17 مارچ، و پریس ریلیز: جاوید رحمانی، میڈیا کوآرڈی نیٹر، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، 18،19 مارچ 2018

327 طلبا وطالبات کو تقسیم اسناد

میل وشارم: سی۔ عبدالحکیم کالج (خودمختار) میل وشارم تامل ناڈو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے سنٹر میں اردو ڈپلوما کورس، عربی سرٹیفکیٹ کورس، فارسی سرٹیفکیٹ کورس، کمپیوٹر ڈپلوما کورس اور عربی ڈپلوما کورس کی تعلیم دی جاری ہے۔ امسال 64 طلبا و طالبات نے ڈپلوما اردو لینگویج اور 94 طلبا وطالبات نے سرٹیفکیٹ ان عربک اور 28 طلبا وطالبات نے ڈپلوما ان فنکشنل عربی اور 44 طلبا وطالبات نے فارسی سرٹیفکیٹ اور 39 طلبا نے کمپیوٹر ڈپلوما اور 58 طلبا وطالبات نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرانک اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، دہلی سے سی سی سی کی اسناد حاصل کیں۔

اس سلسلے میں ایک شاندار اجلاس کالج آڈیٹوریم میں بروز جمعرات 1 مارچ 2018 کو منعقد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت جناب ایس زیڈ ابرار احمد صاحب، سکریٹری وکرسپانڈنٹ، سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم نے کی۔ پرنسپل جناب ڈاکٹر ایس اے ساجد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر ایس محمد یاسر صدر، شعبۂ اردو اور کوآرڈی نیٹر، این سی پی یو ایل نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ مہمان خصوصی محترمہ ڈاکٹر یم۔ جیا شری رانی پرنسپل، کے ایم جی کالج آف آرٹس اینڈ سائنس، گڑیاتم نے خصوصی خطاب فرمایا اور مہمان اعزازی تمل ناڈو کے مشہور ومعروف تاجر اور خطیب عالی جناب پٹیل محمد یوسف صاحب نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جلسے کی نظامت جناب افتخار احمد صاحب استاد، این سی پی یو ایل نے کی۔ کامیاب طلبا وطالبات کو جناب الحاج ساہوکار نثار احمد صاحب، صدر میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی اور عالی جناب ایس ضیاء الدین احمد صاحب، جنرل سکریٹری، میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے اسناد تقسیم کیں۔ اس جلسے میں محترمہ امیر النسا کی کتاب 'منتخب خطبات' کا اجرا عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: محمد یاسر، میل وشارم، تمل ناڈو، 22 مارچ 2018

اثر لکھنوی کی شاعری وادبی خدمات

لکھنؤ: اثر لکھنوی دبستان لکھنؤ کی شاعری میں نمائندہ اور چنندہ شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے، ان کی شاعری گرچہ کلاسیکل شاعری ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا لہجہ سب سے منفرد تھا اور انھوں نے دبستان لکھنؤ سے لے کر دبستان کشمیر تک شعری فضا معطر ومنور کردی۔ ان خیالات کا اظہار اترپردیش اردو اکادمی کی چیئر پرسن پدم شری پروفیسر آصفہ زمانی نے لائف ویلفیئر سوسائٹی لکھنؤ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام گومتی نگر واقع، ہندی میڈیا سینٹر کے آڈیٹوریم میں منعقد 'مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی شاعری وادبی خدمات' کے عنوان پر سمینار میں صدارت کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی شارب ردولوی سابق صدر شعبہ اردو جے این یو نے کہا کہ اثر لکھنوی کم سنی سے ہی شعر وشاعری کا ذوق رکھتے تھے، اور بعد میں عزیز لکھنوی کی شاگردی نے آپ کے شاعرانہ شوق وفن کو بام عروج تک پہنچایا۔ اس موقعے پر سوسائٹی کے سکریٹری رضوان احمد نے اتنا شاندار پروگرام منعقد کرانے پر دلی مبارکباد دی۔ سمینار کے مہمان اعزازی کے طور پر شامل ٹلنج مشرا، رکن اترپردیش اردو اکادمی، اور آصف رضوی، ڈائرکٹر اے آر جی ایم سی نے بھی خطاب کیا۔ سمینار میں 'اثر لکھنوی' پر مقالہ پڑھتے ہوئے صحافی ضیاء اللہ صدیقی ندوی، ڈاکٹر مسیح الدین اور نثار احمد نے مقالے پڑھے۔ سمینار کی نظامت سوسائٹی کے سکریٹری عبدالنعیم قریشی نے کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 31 مارچ 2018

کل ہند اردو کانفرنس

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ملی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے زیراہتمام کل

ہند اردو کانفرنس کا انعقاد مراد آباد مسلم ڈگری کالج میں کیا گیا۔ صدارت حکیم ظل الرحمٰن نے کی، جبکہ نظامت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور سید محمد ہاشم نے مشترکہ طور پر کی۔

فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری مختار صدیقی نے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہونے کے ساتھ ہماری تہذیبی وراثت بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد ملت کے افراد کی ذہن سازی کرنا ہے اور انھیں یہ احساس دلانا ہے کہ وہ اپنی مادری زبان اور اپنی اس تہذیبی وراثت کو ہر حال میں اپنی نئی نسلوں تک پہنچانے کا انتظام کریں۔ مہمانانِ خصوصی و دیگر مقررین نے بھی کانفرنس کے عنوان اردو ہماری تہذیبی وراثت جس کی بقا ہماری ذمے داری پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ حکیم سید ظل الرحمٰن، پروفیسر شکیل صمدانی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، پروفیسر خالد محمود، سراج نقوی، اسد رضا، ڈاکٹر ایس ٹی حسن، اسد مولائی، غفران ماجد ایڈوکیٹ، حاجی نسیم احمد خاں ایڈوکیٹ، مولانا کوثر حیات خاں، مفتی محمد اعظم، ڈاکٹر شاداب علیم، یوپی اردو اکادمی کی رکن فہمیدہ بیگم وغیرہ نے خطاب کیا۔ فاؤنڈیشن کی جانب سے اس سال ملی نیشنل فخر طب ایوارڈ پدم شری حکیم سید ظل الرحمٰن علی گڑھ، ملی فخر اردو ایوارڈ، ملی وقار اردو ایوارڈ پروفیسر خالد محمود سابق استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ، ملی نیشنل محسن اردو ایوارڈ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری صدر شعبہ اردو میرٹھ یونیورسٹی، ملی رہبر اردو ایوارڈ، پروفیسر شکیل صمدانی اور اسد رضا کو ملی فخر صحافت ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مارچ 2018

اردو زبان وادب کے فروغ میں خانقاہوں کا کردار

پوری، اڑیسہ: 'اردو زبان وادب کے فروغ میں خانقاہوں کا کردار' کے عنوان سے صوبہ اڑیسہ کے ضلع پوری کے قصبہ ساکھی گوپال میں چنتامنی چیریٹیبل ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے دوروزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس سمینار کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ اسے اس علاقے میں منعقد کیا گیا جہاں اردو کا چلن نا کے برابر ہے۔ باوجود اس کے اس سمینار میں گرد ونواح کے سیکڑوں لوگوں نے حصہ لیا، اس میں نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلموں کی بھی اچھی خاصی تعداد دیکھنے کو ملی۔ اس سمینار کی دو اہم خصوصیات تھیں۔ اول تو یہ کہ اپنے نہج کا اس علاقے کا یہ پہلا سمینار تھا جس کی تشہیر پورے علاقے میں کی گئی تھی۔ اس سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر رابعہ پروین نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے کٹک کے ایس ڈی پی او شیخ عبدالکریم نے شرکت کی اور کلیدی خطبہ پیش کیا۔ نظامت مولانا نظام الدین صاحب برکاتی نے کی۔ دوسرے دن کے اجلاس کی صدارت مولانا فقیر محمد نے کی۔ اس سیشن میں کل 7 مقالات پڑھے گئے۔ روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 اپریل 2018

اکیسویں صدی میں عربی زبان کے چیلنجز اوران کا حل

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس (رجسٹرڈ) کے اشتراک سے جے این یو کے کنونشن سینٹر میں مرکز

برائے عربی و فارسی مطالعات، جے این یو کی طرف سے دوروزہ بین الاقوامی کانفرنس بعنوان 'اکیسویں صدی میں عربی زبان کے چیلنجز اور ان کا حل' منعقد ہوا۔ افتتاحیہ پروگرام کی صدارت سابق صدر شعبۂ عربی، جے این یو پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کی، جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر سعودی ثقافتی امور کے عہدے دار ڈاکٹر عبداللہ صالح الشتوی اور مصری ثقافتی کونسلر پروفیسر محمد شکرندا شریک ہوئے۔ مرکز کے صدر پروفیسر رضوان الرحمٰن نے تمام مہمانان، قومی و بین الاقوامی مقالہ نگاروں کا استقبال کیا۔ افتتاحیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سعودی ثقافتی امور کے عہدے دار ڈاکٹر عبداللہ صالح نے کہا کہ عربی زبان ایک بین الاقوامی زبان ہے اور اس کی مقبولیت دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے علما، طلبہ اور ریسرچ اسکالرس کی کوشش قابل ستائش ہے۔ مصری ثقافتی امور کے کونسلر پروفیسر محمد شکرندا نے مصر اور ہندوستان کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دونوں ملکوں میں کئی طرح کی مماثلت ہے۔ اسی موقعے پر طلبہ تنظیم 'النادی العربی' کی طرف سے نکلنے والے مجلّہ 'الجیل الجدید' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کے صدر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کہا کہ عربی زبان کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم یکسوئی سے اس میں لگ جائیں اور شکوہ و شکایت کی زبان استعمال نہ کر کے خود اس کے لیے کچھ کریں۔ افتتاحی پروگرام کی نظامت النادی العربی کے جنرل سکریٹری محبوب عالم نے کی۔ چائے کے وقفہ کے بعد کنونشن سینٹر کے کمیٹی روم اور لیکچر ہال میں کانفرنس کے دو متوازی جلسے منعقد ہوئے۔ کمیٹی روم کے جلسے کی صدارت شعبۂ عربی، جے این یو کے استاد ڈاکٹر عبیدالرحمٰن نے کی، جبکہ نظامت شعبۂ عربی، ڈی یو کے استاد ڈاکٹر نعیم الحسن نے کی۔ اس جلسے میں کانفرنس کے عنوان سے متعلق مختلف موضوعات پر سات مقالے پیش کیے گئے۔ دوسری طرف لیکچر ہال کے جلسے کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر حبیب اللہ نے کی جبکہ نظامت مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس کے استاد ڈاکٹر ثمامہ فیصل نے کی۔ اس جلسے میں 7 مقالات پیش کیے گئے۔ دوپہر بعد والے پروگرام میں دو متوازی جلسے کنونشن سینٹر کے کمیٹی روم اور لیکچر ہال میں منعقد ہوئے۔ کمیٹی روم والے جلسے کی صدارت ڈاکٹر نعیم الحسن نے کی، جبکہ جے این یو، شعبۂ عربی کے استاد ڈاکٹر محمد اکرم نواز نے نظامت کی۔ اس جلسے میں ڈاکٹر جسیم الدین، ڈاکٹر نورہ علی خلیل، ڈاکٹر عبدالحکیم، سراج الاسلام، محبوب عالم، شمشاد عالم اور فہیم احمد نے مقالات پیش کیے۔ دوسری طرف لیکچر ہال کے جلسے کی صدارت کالی کٹ یونیورسٹی کے ریٹائرڈ پروفیسر عبداللہ سلمی نے اور نظامت بنارس ہندو یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر قمر شعبان ندوی نے کی۔ اس جلسے میں 7 مقالات پیش کیے گئے۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مارچ 2018

اردو زبان وادب کا فروغ اور مدارس اسلامیہ

نئی دهلی: ہندوستان میں اردو زبان کی تدریس اور تعمیر و ارتقا کے لیے کوشش کرنے والے اداروں میں مدارس اسلامیہ کا اہم کردار ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے شاکرہ خاتون ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر نگرانی دھوبہا، سانتھا میں منعقدہ قومی سمینار بعنوان اردو زبان و ادب کا فروغ اور مدارس اسلامیہ کو خطاب کرتے ہوئے کل ہند علما بورڈ کے

'مولانا مملوک العلی کے دور میں دہلی کالج کی خدمات' کے عنوان پر منعقدہ سیمینار

ریاستی صدر مولانا فضل احمد ندوی نے کیا۔ ڈاکٹر محمد شفیق نے کہا کہ اردو زبان اس ملک میں پیدا ہوئی، اس کی رگوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی خون ہے۔ علمائے کرام نے ترسیل کے لیے ہمیشہ اردو زبان کا سہارا لیا ہے۔ ایم ایم آزاد اسکول جھوری کے منیجر مولانا برصغیر نے کہا کہ علما نے تصنیف و تالیف کا کام عموماً اردو زبان میں کیا ہے۔ اجیار وکاس منچ کے جنرل سکریٹری مولانا مجیب الرحمٰن قاسمی نے کہا کہ آج بھی اردو میں شائع مذہبی کتابوں کی تجارت منفعت بخش تجارت ہے۔ پروگرام کی نظامت مولانا غفران احمد ندوی نے کی۔ پروگرام کی صدارت دارالعلوم اسلامیہ بستی کے مہتمم مولانا ظہیر انوار احمد قاسمی نے کی۔ آخر میں سیمینار کے کنوینر اور شاکرہ خاتون ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے منیجر عبدالباقی نے سبھی حاضرین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 23 مارچ 2018

شمیم امروہوی کی شخصیت

امروهه: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے ایلیا ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام 'عظیم المرتبت عالمانہ اور شاعرانہ شخصیت حضرت شمیم امروہوی اعلی اللہ مقامہ' پر ایک روزہ سیمینار محلہ بگلہ میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت شاعر و محقق ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کی جبکہ مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد سیادت نقوی شیعہ شہر امام رہے۔ نظامت کے فرائض نوشہ امروہوی نے اپنے مخصوص انداز میں انجام دیے۔ سیمینار میں مولانا ڈاکٹر سید محمد سیادت فہمی، عالمی مرثیہ سینٹر کے چیئرمین ڈاکٹر عظیم امروہوی، آئی ایم انٹر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جمشید کمال نے حضرت شمیم امروہوی کی شاعری اور ان کی شخصیت کے حوالے سے معلوماتی مقالے پیش کیے۔ آخر میں سیمینار کے کنوینر علی کمیل نقوی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 مارچ 2018

ڈپٹی نذیر احمد کی حیات و خدمات

بجنور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی و منڈلیے وکاس سنستھان چاند پور کی جانب سے ایک سیمینار بعنوان 'ڈپٹی نذیر احمد کی حیات و خدمات' بمقام اسکائی لائن انسٹی ٹیوٹ، چاند پور میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت انجینئر محمد سمیع علیگ نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر و صحافی سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ محترمہ ڈاکٹر رباب انجم، ڈاکٹر آفتاب مہمان ذی وقار رہے۔ کلیدی خطبہ ڈاکٹر ناصر پرویز نے پیش کیا۔ الیاس انجم نے کہا کہ نذیر احمد نے ترجمے بھی کیے، درس و تدریس سے متعلق کتابیں بھی لکھیں، مذہبی تصانیف بھی ان کا سرمایہ ہیں، انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو خط بھی لکھے اور مجموعہ بے نظیر کے نام سے شعری مجموعہ بھی ترتیب دیا۔ ڈاکٹر ناصر امروہوی نے کلیدی خطبے میں کہا کہ اردو زبان و ادب سے متعلق مولانا کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ان کے ناول 'مراۃ العروس' کو اردو کا اولین ناول مانا گیا ہے۔ 'توبۃ النصوح' نذیر احمد کا وہ شاہکار ناول ہے جو اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ڈاکٹر رباب انجم نے کہا کہ نذیر احمد نے ناول نگاری کے علاوہ اردو ادب میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ قانون، انکم ٹیکس، درس و تدریس، رسم الخط، مذہب، مکاتیب اور شاعری پر مشتمل ہیں۔ ندیم راعی نے کہا کہ مراۃ العروس نہ صرف نذیر احمد کا بلکہ اردو کا پہلا ناول ہے جو نذیر احمد نے 1869 میں لکھا۔ رضا سبطین نوشی نے کہا کہ اردو ادب میں نذیر احمد کو ایک اصلاحی ناول نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے نیز اردو کا اولین ناول نگار ہونے کا شرف بھی نذیر احمد کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ خان اور ڈاکٹر شگفتہ غزل نے بھی اظہار خیال کیا۔ صدارت کررہے انجینئر محمد سمیع علیگ نے کہا کہ نذیر احمد ایک بیدار ذہن اور اصلاح پسند انسان تھے۔ انھوں نے اسلامی معاشرے میں پیر پھیلا چکی برائیوں کو نہ صرف منظر عام پر پیش کیا بلکہ اصلاح کے کارآمد نسخے بھی بتائے ہیں۔ عورتوں کی اصلاح ان کا اہم موضوع ہے۔ شاداب انجم نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 21 مارچ 2018

مولانا مملوک العلی کے دور میں دہلی کالج کی خدمات

نئی دهلی: مولانا مملوک العلی کے دور میں دہلی کالج کی خدمات کے موضوع پر الہند تعلیم جدید فاؤنڈیشن اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے باہمی اشتراک سے یک روزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں متین امروہوی کے منظوم کلام کے بعد مفتی افروز قاسمی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا جس میں انھوں نے کہا کہ دراصل آج ہم مولانا مملوک العلی کی وساطت سے تمام ان اساتذہ کے افکار و نظریات پر بات کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے مدارس سے اپنا گہرا تعلق رکھتے ہوئے عصری علوم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس کی زندہ مثال ہے۔ مہمان خصوصی سید غیور الحسن رضوی چیئرپرسن قومی اقلیتی کمیشن نے اس کے لیے مولانا مملوک العلی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے قدیم دہلی کالج کی علمی خدمات کی ستائش کی اور کہا کہ آزادی سے تقریباً سوا سو سال قبل مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہوا اور وہاں اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں کام کیا گیا اور انگریزی و سائنسی علوم کے ترجمے کرائے گئے اور ان کو اپنی مادری زبان میں طلبا کو پڑھانے کا کام انجام دیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی سید غیور الحسن رضوی، مولانا نورالحسن راشد، ڈاکٹر سید فاروق، پروفیسر شہپر رسول اور معروف صحافی فاروق ارگلی کے ہاتھوں 'سہ ماہی ادب سلسلہ' اور ماہنامہ 'نعرہ تکبیر' کا اجرا بھی کیا گیا۔ بعد ازیں پروفیسر ارتضیٰ کریم کو قمر رئیس ایوارڈ برائے تنقید، ڈاکٹر ذاکر حسین ایوارڈ پروفیسر عبدالقیوم انصاری، کو، مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کو مولانا مملوک العلی ایوارڈ، شاہ جمال ڈائرکٹر الخدم گروپ کو برائے حج و عمرہ و زیارت خدمات میں شاہ فیصل ایوارڈ، مظفر خان کو فخر قوم ایوارڈ، عتیق احمد کرناٹکی کو مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ، ندیم عباس زیدی کو فخر ملت ایوارڈ، ارشاد احمد کلکتوی کو سردار پٹیل ایوارڈ، عمارہ زینب کو سی بی ایس سی میں 98.6 فیصد مارکس لانے پر، ریحان اللہ خان ولد مشرف علی خان کرانے میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر اور ضحیٰ انجم بنت عائشہ افروز کو اسکول میں صد فیصد حاضری اور فن آرٹ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اسکول میں سیکنڈ مقام حاصل کرنے پر بہترین ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ ریسرچ اسکالرس اور مقالہ نگاروں کو توصیفی اسناد سے بھی نوازا گیا۔

اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول

نے دہلی کالج اور مولانا مملوک العلی کو قوم وملت کے لیے ایک عظیم نعمت بتایا اور کہا مولانا مملوک العلی کے وسیلے سے نہ صرف ہم مادی علوم سے آشنا ہوئے بلکہ ہمیں زندگی کو سنوارنے کا سلیقہ بھی ملا۔ ڈاکٹر امام عمیر احمد الیاسی نے کہ کہ ضرورت ہے کہ آج اس سلسلے میں فکری بیداری بڑے پیمانے پر لائی جائے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ آج میں بے حد مسرور ہوں کہ ہمارے درمیان حضرت مولانا افتخار الحسن کاندھلوی کے صاحب زادے مولانا نورالحسن راشد موجود ہیں۔ سیمینار کے اجلاس اول کی صدارت مولانا نورالحسن کاندھلوی اور معروف صحافی فاروق ارگلی نے کی۔ مولانا نورالحسن نے اپنے خطبۂ صدارت میں مولانا مملوک العلی اور دہلی کالج کے نمایاں محاسن پر اظہار خیال کیا۔ فاروق ارگلی نے اپنے مقالہ میں اساتذہ اور تلامذہ پر بامعنی گفتگو کرتے ہوئے تمام ریسرچ اسکالروں کے مقالوں کو معیاری قرار دیا۔ پروگرام کے کنوینر مفتی افروز عالم قاسمی نے کہا کہ سیمینار میں پیش کیے گئے تمام مقالوں کی اشاعت جلد عمل میں آئے گی۔ سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی اور ڈاکٹر شعیب رضا فاطمی نے کی۔ مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ علماء نے انگریزی زبان کی مخالفت کبھی نہیں کی، البتہ انگریزوں نے زبان کے ذریعے کلچر کو خلط ملط کرنے سازش ضرور کی۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 26 فروری 2018

جشن سرسید

جشن سرسید پر منعقدہ سیمینار

پونے: دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ بہ اشتراک قومی کونسل، دہلی کے تحت ادبی، تہذیبی وثقافتی ادارہ اعظم کیمپس نے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ دو روزہ جشن سرسید کا اہتمام کیا۔ اس جشن کے موقع پر اعظم کیمپس نے آل مہاراشٹر تحریری مقابلے، پوسٹر مقابلے اور پی پی ٹی مقابلے منعقد کیے۔ دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو کے تعاون سے 16، اور 17 فروری 2018 کو قومی سیمینار منعقد کیا گیا۔ سیمینار کی افتتاحی تقریب میں مہمان خصوصی شمیم طارق نے کہا کہ سرسید نے اپنی تحریک کے ذریعے ایک ذہن بنایا ہے اور اب حالات کا تقاضا ہے کہ اس تحریک کو ایک بڑے کینوس میں دیکھا جائے۔ اپنی صدارتی تقریر میں صدر دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ عابدہ انعامدار نے کہا کہ تاریکی کا ماتم نہیں کرنا چاہیے بلکہ نکلتے ہوئے سورج کا استقبال کرنا چاہیے اور کہا کہ عصر حاضر میں سرسید کی تعلیمات کو اپنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس سیمینار کے دوسرے دن فنی اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں ڈاکٹر قمر صدیقی، ممبئی، جانثار معین حیدر آباد، ڈاکٹر عبدالباری، ثمینہ پٹھان اور کوثر جہاں نے پر مغز مقالے پیش کیے۔ صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام دستگیر، ڈائرکٹر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونے نے تمام مقالوں پر تبصرہ کیا اور مقالہ نگاروں کو مبارک باد پیش کی۔

اس جشن سرسید کی اختتامی تقریب میں صدر ایم سی۔ای سوسائٹی پی۔اے انعامدار نے کہا کہ شکست خوردہ قوم کو ابھارنا اس وقت کی اہم ضرورت تھی۔ اس کام کو سرسید نے انجام دیا اور کہا کہ سرسید کی فلاسفی یہی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو احساس کمتری سے نکالا جائے۔ آخر میں مقابلوں میں انعام یافتگان کو ٹرافی اور نقد انعامات سے نوازہ گیا۔ نظامت عظمیٰ تسنیم اور عظمت دلال نے کی۔ ترانہ علی گڑھ پر دو روزہ جشن سرسید کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: رفیق اقبال، مہاراشٹر، 21 مارچ 2018

فروغ اردو پروگرام

بھوپال: بتاریخ 13 اپریل 2018 مولانا برکت اللہ بھوپالی ایجوکیشنل اینڈ سوشل سروس سوسائٹی جامعہ برکت اللہ اردو سینٹر مسلم معاشرے میں دینی وعصری اردو تعلیم کے لیے عرصہ دراز سے جدوجہد کر رہی ہے اور تعلیم کے لیے معاشرے میں ہر ممکن سہولت فراہم کرنا تنظیم کا مقصد بن چکا ہے معاشرے میں دینی تعلیم وعصری تعلیم اردو زبان کے لیے بیداری لانے کی منشا سے ایک تقریب برائے فروغ اردو زبان کا انعقاد کیا گیا جس میں جامعہ برکت اللہ اور تنظیم کے بانی اور ناظم

اعلیٰ حاجی محمد ہارون صاحب کی جانب سے دینی وعصری تعلیم اردو زبان کی فروغ کے لیے مفت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ابتدائی اردو اردو سب کے لیے کتابیں دینی رسالے اور قرآن تقسیم کیے گئے۔ تقریب میں مہمان خصوصی محمد کلیم ایڈوکیٹ کے ذریعے طالب علم اور بستی کے ضرورت مند طبقے کو قرآن اور کتابیں مفت تقسیم کی گئیں اس موقع پر موجود تنظیم کے ممبر حاجی محمد عمران نے بتایا کہ تنظیم کا مقصد تعلیم کے میدان میں معاشرے میں آرہی بنیادی رکاوٹوں کو دور کرنا ہے اور قومی کونسل کیا اردو سینٹر اور تنظیم کے ذریعے یہ کام بخوبی انجام دیا جارہا ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج کل کے اس مہنگائی کے دور میں تعلیم حاصل کرنا یا اس کے لیے جدوجہد کرنا کافی مشکل کام ہے۔ زیادہ تر طبقہ پڑھنا لکھنا چاہتا ہے یا اس کے والدین بھی اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر انجینئر حافظ عالم بنانے کی منشا رکھتے ہیں پر ان کی مالی حالت انہیں تعلیم کے میدان میں آگے آنے سے روکتی ہے۔ اسی مقصد سے قومی کونسل اردو سینٹر برکت اللہ اور کونسل کی شائع کردہ اردو ابتدائی تعلیم کی کتابیں آج مفت تقسیم وقرآن تقسیم کی تقریب کا انعقاد کیا گیا ہے تاکہ معاشرے میں دینی وعصری تعلیم کے لیے بیداری لائی جاسکے دوسرا مقصد اردو زبان کو فروغ دینا ہے۔ تقریب کا انعقاد محمد حنیف کے ذریعے کیا گیا جس میں مہمان جناب حافظ اسماعیل بیگ جناب محمد جاوید، جناب فہیم الدین، جناب مفتی رافع صاحب جناب مقصود صاحب، جناب پرویز بھائی نے شرکت کر جامعہ کے طالب علموں کی حوصلہ افزائی کی اور علم کے میدان میں جدوجہد کرنے کا پیغام دیا۔ پریس ریلیز: عمران خاں، مولانا برکت اللہ بھوپالی، ایجوکیشنل اینڈ سوشل سروس سوسائٹی، بھوپال، 13 اپریل 2018

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

اقلیتوں کی تعلیمی ترقی میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا: نقوی

ممبئی: مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور وحج مختار عباس نقوی نے کہا کہ تعلیم سے بہتر کوئی مشن نہیں ہے اور اقلیتوں کی تعلیمی ترقی میں کوئی امتیاز نہیں برتا جارہا ہے اور وزیر اعظم نریندر مودی کی یہی خواہش ہے۔ شمال مغربی علاقہ باندرہ میں واقع انجمن اسلام، ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا گرلز ہائی اسکول اور جونیر کالج میں ہوا نامی تنظیم اور ظفر سریش والا کے تعاون سے طالبات کے لیے تعمیر کیے گئے بیت الخلا کے افتتاح کی تقریب میں شریک وزیر نقوی نے کہا کہ انجمن اسلام کی قومی وملی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مختار نقوی نے مزید کہا کہ مودی حکومت سب کا ساتھ سب کا وکاس کے تحت اقلیتی فرقہ کی بھی ترقی کو یقینی بنانا چاہتی ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ ان کی اقلیتی وزارت کی کوشش ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ پرائمری سطح کی تعلیمی بہتری کو ممکن بنایا جاسکے۔ اس سے قبل انجمن اسلام ہائی اسکول کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے واضح طور پر کہا کہ انجمن اسلام گزشتہ ایک صدی سے تعلیمی اور ثقافتی سطح پر قوم وملت کی خدمت انجام دے رہی ہے اور یہ سلسلہ مستقبل میں بھی جاری رہے گا، کیونکہ ہماری ترقی وکامرانی تعلیم کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر ظہیر قاضی نے مزید کہا کہ حال میں انجمن اسلام کے لا کالج کی منظوری حکومت نے دے دی ہے جس کو سابق وزیر اعلیٰ مہاراشٹر بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر جلسے کے صدر اور ظفر سریش والا نے یقین دلایا کہ مستقبل میں بھی اس قسم کے منصوبوں پر عمل کیا جائے گا۔ اس تقریب میں سماجی رہنما، رما سنگھ، نائب صدر محمد حسین پٹیل، ڈاکٹر عبداللہ شیخ، مشتاق انتولے، یووا اَن اسٹاپ اور تعلیم وتربیت کے عہدیداران موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 مارچ 2018

مراکش خطاطی پر ایک روزہ بین الاقوامی ورکشاپ

رام پور: ملک وبیرون ملک میں نایاب کتابی ذخائر ومخطوطات میں اپنی الگ پہچان رکھنے والی رام پور رضا لائبریری میں مراکش کی خطاطی پر ایک روزہ بین الاقوامی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ حکومت ہند کے ثقافتی وزارت کے تحت منعقدہ بین الاقوامی ورکشاپ کے مہمان خصوصی مراکش کے ثقافتی وزارت کے آرٹ ڈائرکٹر منصور آکریچ تھے۔ اور مہمان ذی وقار محمد کرمد وصادق حیدری مراکش کے خطاط وحکومت ہند کے سابق خطاط جی ایس چڈا تھے۔ بین الاقوامی ورکشاپ میں آئے مہمان کا استقبال رام پور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر سید حسن عباس نے گلدستوں اور لائبریری کا مومنٹو پیش کرکے کیا۔ رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر حسن عباس نے اپنی تقریر میں سنہ 1968 سے لے کر 2018 تک کے ہندوستان اور مراکش کے درمیان تعلقات اور منظم پروگراموں کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ انھوں نے رضا لائبریری میں منعقد ورکشاپ کو بہترین قدم بتایا اور تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی منصور اکریچ نے اپنی انگلش کی تقریر میں حکومت ہند اور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر اور عملے کا مراکش کا خطاطی ورکشاپ منعقد کرنے کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ایسے پروگراموں سے باہمی تعلقات مضبوط ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر جی ایس خواجہ نے کہا کہ خطاطی جسے عربوں کا اثاثہ کہتے ہیں ہم نے 14 سو سال سے بچا کر رکھا ہے۔ رام پور رضا لائبریری کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اثاثہ یہاں محفوظ ہے۔ پروگرام کی نظامت صنم علی خان نے کی۔ دوسرے سیشن میں مراکش سے آئے خطاط صادق حیدری اور محمد کرمد نے اپنے ہنر دکھاتے ہوئے بورڈ پر خطاطی کے نمونے پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 مارچ 2018

خودنوشت: فن اور روایت

لکھنؤ: خودنوشت محض ایک فرد کی داستان حیات نہیں بلکہ ایک تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ زندگی بھی ہے اور زندگی نامہ۔ خودنوشت رحم اور خوف کا جذبہ پیدا کرتی ہے کیونکہ دوسروں پر جو کچھ گزرتی وہ ہمارے لیے سبق کا ذریعہ بنتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایچ آر ڈی سی کے ڈائرکٹر اور انگریزی ادبیات کے ممتاز اسکالر پروفیسر اے آر قدوائی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں خودنوشت فن اور روایت کے موضوع پر منعقد دوروزہ قومی سمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ کے دوران کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس پی سنگھ نے کہا کہ خودنوشت: فرد سے سماج تک کے مطالعہ کا ایک خوبصورت اظہار ہے۔ انھوں نے کہا کہ خودنوشت کی فنی اور علمی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے البتہ لکھنے والے سے کہیں زیادہ اس بات کی اہمیت ہے کہ قاری اس کا کس تناظر میں مطالعہ کرتا ہے۔ صدارتی خطاب میں ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے کہا کہ خودنوشت تاریخ اور تہذیب وثقافت کے علاوہ علمی فتوحات کا بھی ایک دائرہ بناتی ہے اور لکھنے والے کا تعلق جس شعبے سے ہوتا ہے اس کے ذہنی ارتقا کی عکاسی بھی اس میں دیکھی جاسکتی ہے۔
افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے

کی جبکہ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس پی سنگھ مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے تلاوت کلام سے کیا۔ کیمپس نے انچارج ڈاکٹر عبدالقدوس نے مہمانوں کا خیر مقدم کا۔ سیمینار کے کوآرڈی نیٹر شاہ محمد فائز نے سیمینار کا تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سرفراز احمد خاں کی کتاب 'گلہائے سودا' اور ڈاکٹر نور فاطمہ کی کتاب 'آزادی کے بعد اقبال تنقید: مسائل ومباحث' کا اجرا کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عمیر منظر نے مانو لکھنؤ کیمپس کے اساتذہ کی علمی و تحقیقی خدمات کا تعارف پیش کیا۔ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر سرفراز احمد خاں نے انجام دیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر کفیل احمد قاسمی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر شمس کمال انجم نے کی۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، پروفیسر مجیب الرحمٰن، پروفیسر عمر کمال الدین، ڈاکٹر صہیب عالم، ڈاکٹر ثناء اللہ ندوی، پروفیسر اخلاق احمد، ڈاکٹر محمد کاظم نے مقالے پڑھے۔ ظہرانے کے بعد دوسرا اجلاس پروفیسر خالد محمود کی صدارت میں ہوا۔ نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر کفیل احمد قاسمی، ڈاکٹر ارشد القادری، ڈاکٹر عبداللہ صابر، ڈاکٹر مجاہد الاسلام، ڈاکٹر صہیب عالم، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے مقالے پڑھے۔ کیمپس کے انچارج ڈاکٹر عبدالقدوس نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 14 مارچ 2018

ادب مہجر: تاریخی، ثقافتی اور معاشرتی پہلو

نئی دہلی: شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی میں 'ادب مہجر: تاریخی، ثقافتی اور معاشرتی پہلو' کے موضوع پر منعقدہ دو

روزہ بین الاقوامی سمینار کی پہلی نشست میں پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی، پروفیسر کفیل احمد قاسمی، پروفیسر ثناء اللہ ندوی اور مولانا نوشاد نوری قاسمی دیوبند نے مقالات پڑھے۔ اس نشست کی صدارت تونس یونیورسٹی کے پروفیسر توفیق بن عامر، پروفیسر حبیب اللہ خاں، اور پروفیسر مشیر حسین نے مشترکہ طور پر کی۔ شعبۂ اردو کی خواجہ

لائبریری میں منعقدہ پہلی متوازی نشست میں پروفیسر کلیم اصغر جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر احمد عبدالرحمٰن القاضی استاذ شعبۂ اردو قاہرہ یونیورسٹی، پروفیسر غلام مرسلین استاذ شعبۂ مغربی ایشیا اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر عراق رضا زیدی استاذ شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مقالات پڑھے۔ اس نشست کی صدارت ڈاکٹر محمود فیاض، پروفیسر علیم اشرف اور پروفیسر ابن کنول نے کی۔

سیمنار کی دوسری نشست میں ڈاکٹر عفان، ڈاکٹر نسیم اختر، پروفیسر صفا بطی، ڈاکٹر عواطف ملک، ڈاکٹر توفیق بن عامر، ڈاکٹر تسنیم کوثر اور ڈاکٹر جاوید ندیم نے مقالات پڑھے۔ نشست کی صدارت پروفیسر سمیع اختر صدر شعبۂ عربی اے ایم یو نے کی، جبکہ نظامت پروفیسر ایوب تاج الدین ندوی، استاذ شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ دوسری متوازی نشست میں پروفیسر مسعود عالم فلاحی، ڈاکٹر سبحان عالم، ڈاکٹر اصغر محمود، ابوتراب، ڈاکٹر زرنگار، ڈاکٹر جسیم الدین نے مقالات پڑھے۔ اس نشست کی صدارت ڈاکٹر شمس کمال انجم، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب اور ڈاکٹر فوزان احمد نے کی۔

تیسری نشست میں ڈاکٹر محمد اجمل قاسمی، ڈاکٹر ثمینہ تابش، ڈاکٹر شمس کمال انجم، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب، پروفیسر سمیع اختر، ڈاکٹر فوزان احمد اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے مقالات پڑھے۔ اس نشست کی صدارت پروفیسر رضوان الرحمٰن، چیئر پرسن سینٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز، جے این یو نے کی جبکہ نظامت پروفیسر مسعود عالم فلاحی صدر شعبۂ عروبی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ نے کی۔ تیسری متوازی نشست میں دس مقالات پڑھے گئے، اس نشست کی صدارت ڈاکٹر تسنیم کوثر نے کی اور نظامت ڈاکٹر عفان نے کی۔ اختتامی نشست کی نظامت پروفیسر ولی اختر نے کی۔ کلمات تشکر ڈاکٹر اصغر محمود نے پیش کیے۔ صدارت پروفیسر شفیع شیخ ممبئی یونیورسٹی نے کی۔ ڈاکٹر صفا بطی، ڈاکٹر عواطف ملک، ڈاکٹر توفیق بن عامر تونس یونیورسٹی، پروفیسر سمیع اختر، ڈاکٹر شمس کمال انجم، ڈاکٹر فوزان احمد، ڈاکٹر محمود مرزا، پروفیسر عبدالحق اور ڈاکٹر جاوید ندیم نے تاثرات پیش کیے۔ پروفیسر شفیع شیخ ممبئی یونیورسٹی نے منظوم تاثر پیش کیا۔ اس موقعے پر شعبہ کے اساتذہ پروفیسر محمد نعمان خان، صدر شعبۂ عربی، ڈاکٹر سید حسنین اختر (سیمنار کے کنوینر)، ڈاکٹر نعیم الحسن اثری، ڈاکٹر مجیب اختر، ڈاکٹر محمد اکرم، ڈاکٹر ظفیر الدین، ڈاکٹر عبدالملک کے علاوہ شعبہ کے طلبہ، طالبات وریسرچ اسکالرس موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 مارچ 2018

دھلی:

نادر ونایاب کتب ومخطوطات کی نمائش

نئی دھلی: دہلی کے ایوان غالب میں غالب انسٹی ٹیوٹ اور انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام گزشتہ روز سے جاری چہار روزہ بین الاقوامی کانفرنس میں جہاں ایک جانب اردو ادب کی دو صدیاں تاریخ، تہذیب اور ادب کے موضوع پر مسلسل پروگرام پیش کیے گئے ہیں دوسری جانب صحن ایوان غالب میں لگائی جانے والی خصوصی نمائش بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی۔ حسب روایت یہاں مختلف مکتبہ کی شائع کردہ کتابیں تو موجود تھیں، ساتھ ہی تقریباً دو صدیوں پرانے مخطوطات، اپنے زمانے کے معروف شعرا کے پورٹریٹ، بھگوت گیتا اور دیگر اہم اور نادر کتابوں کے علاوہ دور قدیم کے فن مصوری کا مظاہرہ کرتی ہوئی مرحوم نثار احمد بھارتی کے ہاتھ سے لی جانے والی فلمی تصویریں جن میں زیادہ تر فلموں کے پوسٹر اور سنیما ہال پر ان کی چسپاں کی جانے والی تصویریں لائق دید تھیں۔ یہاں موجود شاہ ولی اللہ لائبریری کے لائبریرین اور جنرل سکریٹری سکندر مرزا چنگیزی نے کتابیں دکھائیں۔ انھوں نے نمائندہ 'انقلاب' کو سری رام کرت مہابھارت کا نسخہ دکھایا، جس کو سری رام کایستھ ماتھر دہلوی نے عرق ریزی سے اصل نسخہ سنسکرت اور چند معتبر ٹیکون سے بڑی صحت کے ساتھ ترجمہ کیا اور منشی کشن سروپ ورما، وویا درپن واخبار انیس ہند میرٹھ سے شائع کیا تھا۔ یہ 1896 کا نسخہ ہے۔ اسی طرح شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی کی تخلیق تمدن ہند جو فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاولی بان کی فرانسیسی تصنیف ہے، بھی موجود ہے۔ اسی طرح کتاب افادت نصاب 1855 اور تزک جہانگیری جلد دوم 1290ھ محمد آباد عرف ٹونک سے شائع ہوئی ہے نمایاں کی گئی ہے۔ تاریخ اسلام کا 1919 کا نسخہ اور الیس ذاکر حسین جعفری کی تخلیق ہے اور جے اینڈ سنز پرنٹنگ ورکس دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ شمس العلما مولانا مولوی محمد

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں توسیعی خطبات

حسین آزاد جو گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر بھی رہ چکے تھے کی تخلیق دربار اکبری جس کو شیخ مبارک علی تاجر لاہور نے شائع کیا تھا یہاں موجود ہے۔ اس کے علاوہ منطق پر لکھی جانے والی کتاب، بھگوت گیتا، دیوان ظفر جیسے اہم مخطوطات جو 1855 میں لال قلعہ کے اندر ہی موجود رائل پریس سے ہی شائع ہوئے تھے، یہاں دکھائے جارہے تھے۔ اس کے علاوہ اردو رسم الخط میں پنجابی زبان اور دیگر شعرا کی تصنیفات بھی یہاں موجود تھیں۔ خاندان چشتیہ کا نادر شجرہ، تصوف پر لکھی گئی کتاب کے نادر مخطوطات سمیت تقریباً 250 مخطوطات یہاں موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 18 مارچ 2018

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں توسیعی خطبات

نئی دہلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام دو توسیعی خطبات کا انعقاد شعبہ سنسکرت کے سمینار ہال میں کیا گیا جس میں پہلا خطبہ پروفیسر عبدل بسم اللہ نے 'غالب کا محاورہ' جبکہ دوسرا خطبہ ڈاکٹر ایم سعید عالم نے 'اردو ڈراما اور اسٹیج' کے موضوع پر پیش کیا۔ خطبے کے دوران عبدل بسم اللہ نے محاوروں کی اہمیت بالخصوص شاعری میں محاوروں کے تفاعل پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ غالب نے اپنی بیشتر غزلوں میں محاوروں کا استعمال کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اردو زبان اور غالب ایسے مشکل پسند شاعر کے یہاں بیشتر محاورے ہندی الاصل ہیں۔ اردو ڈراما اور اسٹیج کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر ایم سعید عالم نے کہا کہ اردو میں ڈرامے بہت لکھے گئے لیکن ان میں سے بیشتر ڈرامے اسٹیج کے فنی تقاضوں پر پورے نہیں اترتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان ڈراموں کے بیشتر مصنفین اسٹیج ڈرامے کی فنی اور تکنیکی باریکیوں سے بہت کم واقف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم سعید عالم نے مشورہ دیا کہ ایک ایسی ورک شاپ کا انعقاد کیا جانا چاہیے جس میں اردو ڈراما لکھنے والوں کو اسٹیج کے فن کی باریکیوں اور اداکاروں کو اردو زبان کے حوالے سے تربیت دی جائے۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہپر رسول نے اپنے صدارتی خطبے میں غالب کے محاوروں کے تعلق سے عبدل بسم اللہ کے خیالات کی جہاں تائید کی وہیں ڈرامے کے فن کے حوالے سے ڈراما نگاری کے لیے اسٹیج کی نزاکتوں سے واقفیت کو ضروری قرار دیا۔ پروفیسر کوثر مظہری نے دونوں مقررین کے حوالے سے تعارفی کلمات پیش کیے نیز اس جلسے کی نظامت بھی کی۔ اظہار تشکر ڈاکٹر عمران احمد عندلیب نے کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 16 مارچ 2018

جشن نسائی ادب کا اہتمام

نئی دہلی: خواتین کی بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم بنات کی صدر اور معروف افسانہ نگار ڈاکٹر نگار عظیم نے انقلاب بیورو سے بات کرتے ہوئے جہاں ایک طرف جشن نسائی ادب پر روشنی ڈالی وہیں دوسری جانب اس پورے عمل کو ترقی پسند تحریک کی توسیع قرار دیا۔ انھوں نے بتایا کہ جشن نسائی ادب کے موقعے پر بنات نے اردو کی سینئر قلمکاروں کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مومنٹو اور شال پیش کیے۔ ممتاز شیریں نیشنل ایوارڈ برائے تنقید و تحقیق محترمہ رضیہ حامد، عصمت چغتائی نیشنل ایوارڈ برائے ادبی خدمات قمر جمالی، وداراب بانو وفا نیشنل ایوارڈ برائے شاعری بلقیس ظفیر الحسن، خصوصی لیکچر سیریز کے آغاز کے تحت ڈاکٹر علی جاوید کو ان کے خطبے بعنوان 'رضیہ سجاد ظہیر ایک عہد' کے لیے شال اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ اس یک روزہ جشن میں پہلے اجلاس کی صدارت معروف ادیب محترم رتن سنگھ اور دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے کی۔ نگار عظیم نے کہا کہ آج کے جو حالات ہیں اور خواتین کے سامنے جو مسائل ہیں اس میں ترقی پسند تحریک کو نئے انداز میں آنا ہی تھا اور کہیں نہ کہیں سے اس کی شروعات ہونی تھی۔ علاوہ ازیں جشن نسائی ادب کا پہلا اجلاس بنات کی سرپرستوں کے نام تھا جس میں قمر جمالی، رضیہ حامد اور بلقیس ظفیر الحسن نے اپنا ادبی سفرنامہ پیش کیا۔ اس اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر اور حیدر آباد سے تشریف لائیں شبینہ فرشوری نے شرکت کی۔ نظامت بنات کی جنرل سکریٹری تسنیم کوثر نے کی۔ جبکہ اظہار تشکر اتراکھنڈ ویمن کمیشن کی ممبر افسانہ نگار اور بنات کی زونل ہیڈ محترمہ افشاں ملک نے کیا۔

دوسرا اجلاس رضیہ سجاد ظہیر کے نام تھا۔ ڈاکٹر علی جاوید نے رضیہ سجاد ظہیر کی ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ اس اجلاس میں رضیہ سجاد ظہیر کی ایک شاہکار کہانی بعنوان بڑا سوداگر کون؟ ڈاکٹر افشاں ملک نے بہت دلکش انداز میں پیش کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر مولا بخش اور معروف افسانہ نگار انجم عثمانی نے اظہار خیال کیا۔ صدارتی تقریر پروفیسر فاروق بخشی نے کی۔ نظامت کے فرائض عذرا نقوی نے انجام دیے اور بنات کی صدر ڈاکٹر نگار عظیم

نے شکریہ کی رسم ادا کی۔ اس موقعے پر پہلے اجلاس میں چار کہانیاں پیش کی گئیں جن میں عرفانہ تزئین شبنم (تمل ناڈو)، شبینہ فرشوری (حیدر آباد)، سیدہ تبسم ناڈکر (ممبئی)، نصرت شمسی (رامپور) شامل تھیں۔ صدارت بنات کی نائب صدر عذرا نقوی نے کی۔ شبانہ نذیر اور شمع افروز زیدی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ نظامت کے فرائض قمر قدیر ارم نے انجام دیے۔ چشمہ فاروقی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرے دور میں رفیعہ نوشین، انجم بہار شمسی، اور آصف اظہار، بنات انٹرویو کہانی تسنیم کوثر

نے پیش کی۔ صدارت ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد اور حقانی القاسمی نے تقریر کی۔ ظہیر برنی، ڈاکٹر نفیس بانو، سلمیٰ شاہین اور معین شاداب مہمان خصوصی کی حیثیت سے جلوہ افروز تھے۔ ترنم جہاں شبنم نے نظامت کی اور نعیمہ جعفری پاشا نے شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کے آخر میں ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 مارچ 2018

شاہ ولی اللہ دہلوی یادگاری خطبہ

نئی دھلی: ہندوستان کی ہزاروں برس پرانی تاریخ سیکولرزم، پرامن بقائے باہمی اور مذہبی ولسانی رواداری سے بھری ہوئی ہے۔ اس سرزمین نے تاریخ کے کسی موڑ پر صرف ایک مذہب یا ایک زبان یا ایک تہذیب کو نہیں اپنایا ہے، بلکہ کسی خوبصورت گلدستہ کی طرح اپنے دامن میں مختلف قسم کے مذہب وذات اور زبان کی روایات کو ہمیشہ جگہ دی ہے۔ ہندوستان کی اسی پرانی سنسکرت کو ہمارے آئین نے بھی برقرار رکھا ہے اور اس میں ہر ایک کو برابر کا حق دیا گیا ہے۔" ان خیالات کا اظہار شعبۂ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر رضوان قیصر نے جے این یو کے مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات، اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز کی طرف سے منعقد پانچویں سالانہ شاہ ولی اللہ دہلوی یادگاری خطبہ میں کیا ہے۔ وہ قومی شناخت اور ہندوستان کے تکثیری سماج' کے موضوع پر کثیر تعداد میں موجود طلبہ اور اساتذہ سے خطاب کر رہے تھے۔ مرکز کے سابق صدر اور پروگرام کے کنوینر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج کا موضوع موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر رضوان قیصر نے کہا کہ اس ملک کے سیکولر تانے بانے کو برقرار رکھنے کے لیے اور اسے ترقی دینے کے لیے ہمیں جے این یو جیسے تعلیمی اداروں کو فروغ دینا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ سی ایس آئی آر اور آئی سی سی آر جیسے تعلیمی وثقافتی اداروں کے ذریعے بھی ہمارے تکثیری سماج کی خوبصوری کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم سب کی مشترکہ ذمے داری ہے کہ پرامن بقائے باہمی اقدار کو آگے بڑھائیں۔" پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر بشیر احمد جمالی نے کہا کہ موجودہ دور میں جس طرح ایک خاص نظریہ اور زبان کو دوسروں پر مسلط کیا جا رہا ہے اور اس کے ذریعے دوسری تہذیبوں اور زبانوں کو دبایا جا رہا ہے، اگر یہ سلسلہ چلتا رہا تو پھر ہمارا سماج مذہب اور ذات کے نام پر کئی حصوں میں بٹ سکتا ہے اور یہ وہ ہندوستان نہیں ہوگا جس کا خواب آزادی کے پرستاروں نے دیکھا تھا اور جس کے لیے ہمارے آبا واجداد نے ڈھیر ساری قربانیاں پیش کی تھیں۔ شاہ ولی اللہ کے افکار ونظریات کو اپنا کر ہم فرقہ پرستی اور گروہ بندی کو ختم کر سکتے ہیں۔ اس پروگرام میں مرکز کے استاد ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب، ڈاکٹر محمد قطب الدین، ڈاکٹر محمد اکرم نواز، ڈاکٹر محمد اجمل قاسمی کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبہ وطالبات شریک تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 مارچ 2018

جشن چراغاں

نئی دھلی: تہذیبوں کے ٹکراؤ اور اقدار کے بکھراؤ کے دور میں جشن چراغاں صحیح معنوں میں مثبت پہل اور نشان راہ ہے۔ مشاعرے اور شعری محفلیں جہاں ایک طرف زبان کے ارتقا میں مددگار ثابت ہوتی ہیں، وہیں آپسی میل ملاپ اور سماج میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں۔ جشن چراغاں عام ادبی تقریبات سے بھی ایک قدم آگے ہے، جہاں تخلیق کاروں، ادیبوں اور صحافیوں کے اہل خانہ بھی ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف قانون داں اور ممبر آف پارلیمنٹ مجید میمن نے روشنی اور خوشی کے ہندوستانی تہواروں کو معنون 'جشن چراغاں' مشاعرہ وکوی سمیلن سے اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ معروف سماجی و ثقافتی تنظیم آئیڈیا کمیونیکیشنس کے زیر اہتمام نیو ہورائزن اسکول میں منعقد اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے معروف وکیل اور ممبر آف پارلیمنٹ کے ٹی ایس تلسی اور مہمانان اعزازی کی حیثیت سے سماجی رہنما وسیم احمد غازی، ماہر تعلیم کلیم الحفیظ، شاعر عازم کوہلی اور قاضی نجم اسلام شریک ہوئے۔

تعارفی واستقبالیہ کلمات آئیڈیا کمیونیکیشن کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے پیش کیے، جبکہ نظامت کے فرائض معین شاداب اور راجیو ریاض پرتاپ گڑھی نے انجام دیے۔ حکومت ہند کی اردو بھوجپوری اکیڈمیز اور نیو ہورائزن اسکول کے تعاون سے منعقد 'جشن چراغاں' میں جن شعرا نے شرکت کی ان میں پروفیسر جتندر سری واستو، پروفیسر چندر دیو یادو، مہیش گرگ، متین امروہوی، امریندر ناتھ ترپاٹھی، اعجاز انصاری، معین شاداب، ولدار دہلوی، ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی، سرفراز دہلوی، اقبال فردوسی، ارشاد خان سکندر، راجیو ریاض پرتاپ گڑھی، صبا عزیز، فرمان چودھری اور ناگیندر انوج شامل ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 29 مارچ 2018

سماج کی تعمیر میں اردو اخبارات ورسائل کا کردار

نئی دھلی: دریا گنج، نئی دہلی میں اردو دنیا کے منفرد مجلّہ 'اردو بک ریویو' سال 2018 کے پہلے شمارے کا اجرا کرتے ہوئے معروف صحافی سید خالد حسین نے کہا کہ اردو اخبارات، رسائل وجرائد کا سماج کی تعمیر میں نمایاں مقام ہے۔ ہمارے گھروں میں دینی کتابوں کے علاوہ اردو اخبارات، رسائل وجرائد نہ صرف ہمارے لیے بلکہ بچوں کے لیے بھی زینت کا سامان ہوتے ہیں جس کے سبب تا عمر مطالعے کا ذوق برقرار رہتا ہے۔ انھوں نے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ اردو بک ریویو 24 سال سے تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور اپنے معیار پر قائم ہے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں 'اردو بک ریویو' کے مدیر محمد عارف اقبال، محمد اویس گورکھپوری، عدنان فہد اور محمد عمران قنوجی وغیرہ شامل ہیں۔

پریس ریلیز: ندیم عارف، منیجر، اردو بک ریویو، نئی دہلی، 12 مارچ 2018

اردو خواندگی مراکز کا سالانہ جلسہ تقسیم انعامات

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام نیشنل بال بھون میں اردو خواندگی مراکز کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات کو بہترین کارکردگی پر انعامات و اعزازات سے نوازنے کے لیے سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات کا انعقاد کیا گیا۔ اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا نے شرکت کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ آج انعامات حاصل کرنے والوں میں بڑی تعداد خواتین کی ہے۔ انھوں نے کہ اب ایک لڑکی کا تعلیم یافتہ ہونا پورے خاندان کے تعلیم یافتہ ہونے کی ضمانت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان دنوں دہلی میں جس طرح اردو کے فروغ کے لیے کام ہو رہا ہے مجھے امید ہے کہ آئندہ اردو سیکھنے اور سکھانے کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ آپسی بھائی چارے اور محبت کو فروغ دینے کے لیے اردو زبان کا سیکھنا ناگزیر ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے معلوم کر کے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ اردو اکادمی، دہلی اس اسکیم کے تحت اب تک ایک لاکھ سے زائد خواتین اور مردوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر چکی ہے۔ انھوں نے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ انعامات کی رقم میں اضافہ ہونا چاہیے۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اردو اکادمی نے گزشتہ دنوں بھی ایک بڑا اردو کا فیسٹول منعقد کیا تھا اور آج اس جلسہ تقسیم

انعامات کا انعقاد کیا جس میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین موجود ہیں۔ مزید انھوں نے یہ بھی کہا کہ نائب وزیراعلیٰ اردو زبان و ادب کی ترقی و فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ اردو صرف زبان نہیں ایک پوری تہذیب ہے اور دہلی میں اس تہذیب کی بقا اور فروغ کے لیے یہاں کی حکومت بالخصوص نائب وزیراعلیٰ کمربستہ ہیں۔

اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے مہمانِ خصوصی منیش سسودیا اور مہمانِ اعزازی پروفیسر خالد محمود کا گلدستہ پیش کرکے استقبال کیا۔ اپنے استقبالیہ کلمات میں پروفیسر شہپر رسول نے انعام یافتہ طلبہ و طالبات و اساتذہ کو مبارکباد دیتے ہوئے منیش سسودیا کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج اس جلسہ تقسیم انعامات میں ڈیڑھ سو اساتذہ و طلبہ کو انعامات سے سرفراز کیا جارہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ اس تعداد میں مزید اضافہ ہوگا۔ اس موقعے پر دہلی کی معروف قوالی فنکارہ چنچل بھارتی نے مشہور و معروف قوالیاں پیش کرکے سامعین کو جھومنے پر مجبور کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 مارچ 2018

'موت کی کتاب' کا انگریزی ترجمہ 'دی بک آف ڈیتھ'

نئی دھلی: خالد جاوید کی نثر حد درجہ تخلیقی، شاعرانہ اور تہہ دار ہے، اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ایک دشوار گزار عمل ہے، لیکن اے نصیب خان نے بہت خوش اسلوبی سے موت کی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ان خیالات کا اظہار عہد ساز ادیب و نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے راجیو گاندھی اسٹڈی سرکل کی جانب سے یونیورسٹی پالی ٹیکنک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیکچر تھیٹر میں خالد جاوید کے ناول 'موت کی کتاب' کے انگریزی ترجمہ 'The Book of Death' (اے نصیب خان) پر منعقد مذاکرے میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ مترجم نے اپنے ترجمے میں خالد جاوید کی پیچیدہ نثر اور اس کے اسلوب کو بہت حد تک پیش نظر رکھا ہے۔ اردو کے نامور نقاد پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ یہ موت کی نہیں، بلکہ زندگی کی کتاب ہے، لیکن فنکار کا بیانیہ نفی اور انکار کے ذریعے اثبات اور اعتراف تک پہنچتا ہے، مترجم نے اصل متن کی جمالیات کو ترجمے میں برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ خالد جاوید اور اے نصیب خاں دونوں ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ممتاز اور قابل فخر اساتذہ ہیں۔ پروفیسر

'موت کی کتاب' کے انگریزی ترجمہ 'دی بک آف ڈیتھ' پر مذاکرہ

اسدالدین نے ترجمے کی مشکلات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مترجم کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔ نقاد اور ترجمہ نگار باراں فاروقی نے اس کتاب کے فلسفیانہ پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انگریزی ترجمے کی اہمیت و افادیت کی وضاحت کی۔ اس موقعے پر خالد جاوید نے اپنی کتاب کے چند اقتباسات کی قرأت کی جس کا ترجمہ اے نصیب خاں نے اپنی کتاب سے پیش کیا۔ آخر میں راجیو گاندھی اسٹڈی سرکل کے کوآرڈی نیٹر ایس ایم محمود نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت قاضی فردوس اسلام نے کی۔ مذاکرے میں پروفیسر شہباز انجم، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر رحمان مصور، ڈاکٹر خالد مبشر اور رضوان عالم کے علاوہ اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات بڑی تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 مارچ 2018

فارسی متن میں نقاشی پر ایک نظر

نئی دھلی: شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے 17ویں پروفیسر ہادی حسن میموریل خطبے کا انعقاد شعبہ سنسکرت کے سیمینار ہال میں بعنوان 'فارسی متن میں نقاشی پر ایک نظر' کیا گیا۔ اس خطبے کا آغاز یاسر عباس نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ نظامت ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے کی۔ خطبے کی مقرر خاص پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی، سابق صدر شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی تھیں۔ جبکہ صدارت کے فرائض شعبہ تاریخ و ثقافت کے صدر و پروفیسر آر پی بہوگنا نے انجام دیے۔ استقبالیہ کلمات سابق صدر شعبہ فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی نے ادا کیے۔ آپ نے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ فارسی ادب کی نقاشی نے خوبصورتی کے نئے معیار بنائے تشبیہ و استعارات کی محاکاتی کیفیت پیدا کی۔ اگر صرف شاہنامے کی نقاشی پر نظر کریں تو سیمرغ جیسے پرندے کی نہایت جاذب و دلکش تصویر سے ہی زال کی اور رستم کی بہادری کا اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی نے اپنے بیان میں کہا کہ ہندوستان میں نقاشی کے ساتھ ساتھ مجسمہ سازی بھی ترقی کرتی رہی ہے۔ بنگال کے مصور 'دیمان' نے ایک نئی طرز کا آغاز کیا۔ شروع میں نقاشی کے لیے تاڑ کے پتوں کا استعمال کیا جاتا تھا جس کے شواہد آج بھی ہندوستان کی بعض لائبریریوں میں بطور مخطوطہ پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر آر پی بہوگنا نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ہندوستان میں ایرانی تہذیب و تمدن کا بہت گہرا اثر ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مغل دور میں بہت سے معروف نقاش ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ اکبری دور میں ہندوستانی و ایرانی مصوروں نے باہم مل کر لاجواب کارنامے انجام دیے۔ اس نقاشی سے اکبر کا منشا یہ تھا کہ ان نقاشیوں سے اپنی ایرانی و ہندوستانی باہمی تہذیب کو زندہ رکھا جائے۔ پروفیسر عبدالحلیم نے جامعہ انتظامیہ اور مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ فارسی ادب کا استعمال بہت وسیع معانی کے لیے کیا جاتا ہے اس میں تاریخ، نقاشی، جغرافیہ، نجوم، ریاضی وغیرہ جیسے 64 علوم شامل ہیں لہٰذا فارسی ہندوستانی تہذیب و تمدن کا منبع ہے۔ اسی طرح متن کی نقاشی بھی اہم ہے کیونکہ ان نقش و تصاویر کے ذریعے الفاظ کو جذبات و احساسات عطا کیے جاتے ہیں جس سے مفاہیم و مطالب کی جان دوبالا ہوجاتی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 مارچ 2018

اترپردیش:

غالب کی معنویت عصر حاضر میں

رام پور: رضا لائبریری کے ہال میں مولانا امتیاز علی عرشی کی یاد میں پہلا توسیعی خطبہ غالب کی معنویت کے موضوع پر پروفیسر شمیم حنفی سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پیش کیا اور پروگرام کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی سابق صدر شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی نے کی۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر خالد جاوید اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی موجود رہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے خطاب میں کہا کہ شہر رام پور اور غالب میں خاص رشتہ ہے۔ غالب کے لیے رام پور دو شہروں جیسے دہلی اور آگرہ سے زیادہ اہمیت

رکھتا ہے۔ یہ ان کے خطوں کے ذریعے باآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس وقت مرحوم امتیاز علی عرشی کی روح کو بے حد خوشی ہوگی کہ عرشی صاحب کے زمانے میں اردو تحقیق اور تنقید اپنی بلندی پر تھی اور بڑے بڑے دانشور اس دور میں ہوئے لیکن جو خوش مزاجی عرشی صاحب کی عادت میں تھی وہ کسی میں نہیں ہے۔ دو سال گزر جانے کے بعد بھی کوئی بھی شاعر غالب کی برابری نہیں کرسکتا۔ اس موقعے پر رضالائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید حسن عباس نے ہال میں موجود تمام مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ مولانا امتیاز علی عرشی اور غالب دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ان دونوں کا یہی تعلق رضالائبریری سے ہے۔ عرشی صاحب کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے جیسا ہے۔ رضالائبریری میں جو بھی تعلیمی ودیگر کام خاتمے کے دہانے پر تھے انھوں نے پھر سے شروع کیے۔ اس موقعے پر محاورات بیگمات، مجلس رنگین اور تلمیحات غالب کا اجرا ہوا۔ پروگرام کی صدارت کررہے شریف حسین قاسمی نے اپنے بیان میں کہا کہ مولانا امتیاز علی عرشی کے علمی وادبی کاموں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے غالب کی فارسی شاعری پر زیادہ زور دیا اور غالب کو اپنا موضوع بنایا۔ تلمیحات غالب کتاب ان کی دین ہے۔

اس موقعے پر پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے کی اور آخر میں موجود تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر پردیپ جین، ڈاکٹر ممتاز عرشی، ڈاکٹر نجف عرشی، پروفیسر حسن نظامی، اظہر عنایتی، نفیس صدیقی، عتیق جیلانی، ڈاکٹر کشور سلطانہ، ناصرالدین خاں، شکیل غوث، رمیش جین، احد خاں کے علاوہ کئی دانشور اور قابل شخصیتیں موجود رہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 مارچ 2018

اردو شاعری: آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد

امروہہ: اترپردیش اردو اکادمی اور کیئر ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے ایک روزہ سمینار بعنوان 'اردو شاعری آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد' امام المدارس انٹر کالج میں منعقد ہوا جس کے مہمان خصوصی مرزا ساجد حسین سابق لکچرار آئی ایم انٹر کالج رہے جبکہ مہمان ذی وقار ڈاکٹر شریف احمد قریشی پرنسپل ہیرالال کالج رامپور اور ڈاکٹر جمشید کمال پرنسپل آئی ایم انٹر کالج امروہہ رہے۔ صدارت ڈاکٹر حسن احمد نظامی سابق چیئرمین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ نے فرمائی۔

کلیدی خطبہ پروفیسر ناشر نقوی سابق صدر شعبۂ اردو پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے پیش کیا۔ انھوں نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کی اردو شاعری پر تبصرہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو زبان کی حالت زار دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اردو بولنے والے ہندی زبان کو استعمال کرتے ہیں اور اس میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بطور مہمان خصوصی مرزا ساجد حسین ساجد امروہوی نے کہا کہ آج کے دور میں غزل کے انداز بدل رہے ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کے شعرا پر اظہار خیال کیا۔ آئی ایم انٹر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جمشید کمال نے کالج میں آئے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا اور اردو شاعری پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی پرنسپل ہیرالال میموریل ڈگری کالج رامپور اور اسرار احمد منیجر سمباؤس پبلک اسکول رامپور نے کہا کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے اس طرح کے سمینار منعقد کرائے جانے چاہئیں۔ نظامت رضا سبطین نے کی۔ آخر میں کنوینر رباب انجم نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 مارچ 2018

اردو ادب میں طنز ومزاح

رام پور: مورل سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام اردو اکادمی کے اشتراک سے یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو ادب میں طنز ومزاح کی موجودہ صورتِ حال' رام پور میں منعقد ہوا۔ طنز ومزاح کے موضوع پر ہونے والا یہ رام پور میں پہلا قومی سمینار تھا۔ پروگرام کا آغاز قاری ہشام بن ملک کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور بین الاقوامی شاعر اظہر عنایتی نے نعت رسول پیش کی۔ ابتدائی کلمات پیش کرتے ہوئے پروگرام کے کنوینر ایس فضیلت نے طنز ومزاح کی زوال پذیر صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا۔ سمینار میں کلیدی خطبہ عتیق جیلانی سالک نے پیش کیا اور صدر شوکت علی خاں نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے قلمکار ادب کی اس صنف پر توجہ دیں۔ اردو ادب اپنے طنز ومزاح کے سرمایہ پر فخر کرتا ہے۔ سمینار میں اردو ادب سے وابستہ ملک کے کئی نامی دانشوران نے حصہ لیا۔ سمینار میں محترمہ ڈاکٹر قمر قدیر ارم نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ سمینار میں دو دور ہوئے۔ پہلے دور کی صدارت شوکت علی خاں ایڈووکیٹ نے اور دوسرے دور کی صدارت حاجی نسیم احمد ایڈووکیٹ قومی صدر آل انڈیا مسلم فیڈریشن نے فرمائی۔ اس کے علاوہ مہمان اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی، ڈاکٹر ممتاز عرشی، بابر خاں قومی جنرل سکریٹری مسلم فیڈریشن ایس فضیلت، ڈاکٹر شعیب رضا خاں ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر، اسرار احمد، ڈاکٹر ظہیر رحمتی، ڈاکٹر شریف قریشی، ڈاکٹر ممتاز عرشی، ناصر علی خاں علیگ، فیصل شاہ خاں، ضمیر رضوی ایڈووکیٹ، آصف خاں، ظفر سکھ نین، ڈاکٹر اطہر مسعود، ڈاکٹر نعمان غازی کے علاوہ دیگر دانشوران نے شرکت کی۔ پہلے دور میں کئی شخصیتوں نے طنز ومزاح کی موجودہ صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اسکالرس نے بھی مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض جاوید رشید عامر ایڈووکیٹ نے انجام دیے۔

روزنامہ '......'، مارچ 2018

اردو نعت گوئی اور غیر مسلم شعرا

رام پور: 'اردو نعت گوئی اور غیر مسلم شعرا' کے عنوان سے حافظ اشفاق حسین الف سنگھیک سوشل ویلفیئر سوسائٹی رسولپور واقع بھیم پور تحصیل سوار میں اردو اکادمی کے تعاون سے یک روزہ اردو سمینار ستارہ ڈگری کالج میں منعقد ہوا۔ سمینار کا آغاز مرادآباد مسلم پی جی کالج کے شعبہ اردو کے ڈاکٹر شاکر اصلاحی نے نعت رسولؐ سے کیا۔ سمینار میں مہمان خصوصی رضا ڈگری کالج کے سابق شعبہ اردو کے پروفیسر شریف احمد قریشی نے کہا کہ اردو شیریں زبان ہے جس کی مٹھاس سے ہر کوئی لطف اندوز ہوتا ہے اگر اس کی خدمت میر تقی میر، مرزا غالب، جگر مرادآبادی جیسے غزل کے شعرا نے کی ہے تو نعت کے میدان میں احمد رضا خاں، احسن رضا خاں، محسن کاکوروی جیسے باکمال شعرا کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہیں غیر مسلم شعرا کی بہت بڑی تعداد ہے جنھوں نے نعت کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ نعت رسول کا دنیا میں بہت بڑا مقام ہے۔ اس وقت ہزاروں شعرا نعت گوئی سے بھی اسلام کی خدمت کررہے ہیں۔ ڈاکٹر افتخار حسین نے کہا کہ اردو نعت گوئی میں غیر مسلموں کا ہمیشہ تعاون رہا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر شاکر حسین اصلاحی (مرادآباد)، ڈاکٹر اعجاز نعیم (دہلی)، ڈاکٹر گلشن جہاں (علی گڑھ)، ڈاکٹر نازمین (بریلی)، ڈاکٹر اجے کمار، ڈاکٹر مکیش کمار، ڈاکٹر قربان علی، ڈاکٹر افتخار حسین، ڈاکٹر ایس ایم معروف، ڈاکٹر شہپر نے بھی مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں باذوق سامعین موجود تھے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 22 مارچ 2018

مسلم لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم میں حصہ داری

امروھہ: حکیم مہتاب الدین ہاشمی کالج آف لا میں قومی خواتین کمیشن دہلی کے اشتراک سے سماجی تنظیم مانسوی کے زیر اہتمام ایک روزہ سمینار بعنوان مسلم لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم میں حصہ داری منعقد ہوا۔ سمینار میں صوبہ بھر کے مختلف نامور تعلیمی اداروں کے اساتذہ کے علاوہ ماہرین وکلا قانونی طلبا گرام پردھان پرائمری اساتذہ اور نیم سرکاری وغیر سرکاری تنظیموں سے وابستہ سیکڑوں افراد نے شرکت کی۔ سمینار کے آغاز میں مانسوی این جی او کی صدر ارچنا سکسینہ نے سمینار کے اغراض ومقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی اور خواتین کے حقوق میں این جی او کے ذریعے جاری کاموں سے حاضرین کو روشناس کرایا۔ پرنسپل ہاشمی کالج آف لا رعنا پروین نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ مسلم لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کو بڑھاوا دینے کے لیے سماج کو بیداری کی ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ دیگر مقررین نے بھی لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی حصول یابی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ لڑکیوں کی تعلیم روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ لہٰذا مسلم سماج کو اس سمت سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم میں شراکت کو آسان بنانا ہوگا جس سے آنے والی نسلوں کے لیے ایک صاف وشفاف تعلیمی ماحول تیار ہوسکے۔ مقررین نے کہا کہ تمام مذاہب بالخصوص اسلام نے حصول تعلیم پر خاص زور دیا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 مارچ 2018

بہار:

اردو کے فروغ کے لیے ورکشاپ

چھپرہ: اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ کی ہدایت کی روشنی میں کلکٹریٹ آڈیٹوریم میں ضلع اقلیتی فلاح دفتر کے زیر اہتمام فروغ اردو سمینار، مشاعرہ اور ورک شاپ تقریب کا افتتاح سارن کے کلکٹر ہری ہر پرساد اور سینئر ڈپٹی کلکٹر محمد عمیر نے مشترکہ طور پر شمع روشن کرکے کیا۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ملک کی تمام زبانوں میں اردو کی اہمیت بالکل مختلف ہے۔ یہ زبان عوام میں توانائی پیدا کرتی ہے۔ اردو زبان کا اثر ملکی اور بیرونی فلموں کو کامیاب بنانے میں کیا جاتا ہے۔ اس زبان کے فروغ کے لیے مشترکہ طور پر کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے اس ورک شاپ کی کامیابی کے لیے ضلع اقلیتی فلاح کے افسر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے اہتمام سے ہم لوگ اردو کے فروغ میں مزید اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ تحریک آزادی میں اردو زبان کی نمائندگی اہم رہی ہے۔ انھوں نے اردو کی ترقی کے لیے عوام کے استعمال پر مزید زور دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ کسی زبان کی مخالفت درست نہیں ہے۔ اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے اس طرح کے ورک شاپ بے حد ضروری ہیں۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے ڈی ڈی سی روشن کشواہا نے کہا کہ اردو کے ایسے پروگراموں سے ہم لوگوں کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ ہم تمام لوگوں کو چاہیے کہ اردو کے لیے کوشاں رہیں تاکہ اردو کتابوں تک محدود نہ رہ جائیں۔ صدر کے ایس ڈی او چیت نارائن رائے نے اردو کے فروغ کے نقطہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کا استعمال روزمرہ کی بولی کے ساتھ کرنا چاہیے۔ انجمن ترقی اردو سارن کے ضلع صدر حاجی وزیر احمد نے کہا کہ اردو کی بقا کے لیے محبین اردو کو آگے آنا ہوگا۔ کسی زبان کو مذہب کے ساتھ منسلک کرنا درست نہیں ہے۔ سینئر صحافی ڈاکٹر لال بابو یادو، آر جے ڈی کے ضلع صدر جیلانی مبین، رابطہ کمیٹی کے سکریٹری افضل حسین، شاعر عین البرولوی گوپال گنج، سنیل کمار تنگ عنایت پوری، خورشید ساحل، ڈاکٹر معظم عزم، شمیم احمد شمیم، شمیم احمد، سماجی رضاکار دیوش ناتھ، روی رنجن، محمد ایوب وغیرہ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب کی صدارت اردو زبان سیل کے انچارج افسر و سینئر ڈپٹی کلکٹر محمد عمیر نے کی اور ضلع اقلیتی فلاح کے افسر اوپندر کمار یادو نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 مارچ 2018

کلیم عاجز: شخصیت اور شاعری

کلیم عاجز: شخصیت اور شاعری پر منعقدہ سمینار

مظفرپور: اردو زبان گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار ہی نہیں بلکہ اس زبان کو جنم دینے والی ہے۔ یہ باتیں پروفیسر عبدالواسع سابق صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی نے یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں منعقدہ سمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ عالمی افق پر اردو کے نامور شاعر و ادیب 'کلیم عاجز: شخصیت اور شاعری' کے موضوع پر بہار یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالواسع نے کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو کو ہم بھی سینے سے لگا کر رکھیں تو یہ زبان مٹ نہیں سکتی اور وہ زبان جس کا عوام کے ساتھ رشتہ برقرار ہے وہ باقی ہے اور جس کا رشتہ عوام سے منقطع ہوگیا وہ زبانیں ناپید ہوگئیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں میر کا انداز اختیار کیا تھا اور اس کی وجہ بھی انھوں نے بیان کی ہے۔ سمینار کا افتتاح بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر امریندر نارائن یادو نے کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں شعبۂ اردو بالخصوص صدر شعبہ پروفیسر توقیر عالم کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اردو، فارسی، سنسکرت، میتھلی، بھوجپوری کے طلبا کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سائنسی ترقی، موبائل اور کمپیوٹر سے آئی انقلابی تبدیلی کی وجہ سے اب کوئی بھی اپنی تحریر اپنی شاعری، غزل کو پوری دنیا میں مشتہر کرسکتا ہے اور جس کے شعر و ادب یا تحریر میں دم ہوگا۔ مشہور رسائل و جرائد، اخبار میں اس کے مضامین شائع ہوسکتے ہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر نجم الہدیٰ نے کلیم عاجز کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "آنے والی نسل تم پر وجد کرے گی۔ نجم الہدیٰ، تم نے عاجز کلیم کا عہد جوانی دیکھا تھا؟ انھوں نے کہا کہ کلیم عاجز ان کے ہم عصروں میں سے تھے۔ ان کی شاعری میں میر کا انداز موجود تھا جس سے محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر درد کا سمندر موجزن ہے۔ وہیں صحافی ریحان غنی نے کہا کہ کلیم عاجز کے زمانے میں ملک کے حالات اس قدر تبدیل ہوئے کہ وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور انھوں نے اپنے عہد کا منظرنامہ اپنی شاعری میں پیش کیا۔ اس میں دخنجر پہ کوئی داغ نہ دامن پہ کوئی چھینٹ۔ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو' میں گہرائی بھی تھی اور گیرائی بھی۔ پروفیسر ابوذر کمال الدین نے اپنے خطاب میں کلیم عاجز کے اشعار سے ہی اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور کہا کہ نظیر اکبر آبادی کے بعد سے بہار میں کلیم عاجز ہی خالص عوامی شاعر کے طور پر پہچانے اور جانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ انھیں آفاقی اور

لاثانی بناتی ہے اور انھوں نے جو الفاظ استعمال کیے وہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ ممبر اقبال محمد سمیع نے کہا کہ گذشتہ روز سنڈیکیٹ کی نشست میں اتفاق رائے سے یہ طے پایا ہے کہ یونیورسٹی کے تمام تر شعبوں اور کالجوں میں اردو کے سائن بورڈ لگائے جائیں، جس کی تائید وائس چانسلر نے کردی ہے اور 23 مارچ کے بعد سے اسے عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ انھوں نے کلیم عاجز کے متعلق کہا کہ ان کی آواز اور شاعری میں درد ضرور تھا لیکن نفرت نہیں تھی وہ محبت کا پیغام دیتے تھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ناظر صدیقی سابق ڈین نے کی جس میں اساتذہ کے علاوہ طلبا و طالبات وریسرچ اسکالر نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اخیر میں صدر شعبہ اردو بہار یونیورسٹی پروفیسر توقیر عالم نے مہمانان کے ساتھ شرکا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کی مدت کار میں یہ تیسرا سمینار ہے اور اس سلسلے کو وہ مزید آگے بڑھائیں گے۔ انھوں نے وی سی سے بھی اردو کے فروغ اور اس کی ترویج واشاعت میں معاونت کرنے کی اپیل کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ممتاز عالم خان نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 مارچ 2018

تلنگانہ:

فن شاعری

حیدرآباد: جوں جوں اساتذہ فن دنیا سے رخصت ہوتے جارہے ہیں ادب کا تخلیقی آئینہ بھی دھندلا ہوتا جارہا ہے، فی زمانہ شاعری تو بہت ہورہی ہے لیکن ایسے اہل فن انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جنھیں رموز شاعری سے قابل لحاظ حد تک آگاہی ہو، دور تک بے ثمر درختوں کی قطار نظر آتی ہے، شاعری کے حسن وقبح کا گہرا درک رکھنے والے لوگ کم سے کم ہوتے جارہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شہر حیدرآباد کے مشہور شاعر سردار سلیم نے تنظیم ادب گاہ کے زیر اہتمام منعقدہ تیئسویں ورکشاپ کو مخاطب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مفرد اور مرکب بحروں کی تفصیل کے ساتھ ساتھ تقطیع کے مسائل اور معائب سخن کے بارے میں بھی سیر حاصل گفتگو کی۔

بعد ازاں شعری نشست بھی ہوئی۔ شرکا میں مسز وحید پاشاہ قادری، ڈاکٹر معین افروز، ایڈوکیٹ سلطان محمود، مفتی اختر ضیا، لطیف الدین لطیف، ساجدہ سنجیدہ، عبدالعلی، مکرم فیضان، امام قادری، اسمٰعیل قدیر، ظفر محی الدین کے علاوہ دیگر شرکا بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 23 مارچ 2018

شعبۂ فارسی مانو میں دو روزہ قومی سمینار

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں 27 اور 28 فروری 2018 کو فارسی زبان وادب، علوم وفنون اور فرہنگ میں خواتین کے حصہ کے عنوان سے دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاحی اجلاس سید حامد لائبریری آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ صدارت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے کی۔ اس سمینار میں ملک اور بیرون ملک کے کئی پروفیسران نے شرکت کی جن میں بنگلہ دیش ڈھاکہ یونیورسٹی سے پروفیسر کلثوم بشر، آل انڈیا ریڈیو دہلی سے جناب شمس الہدی شروانی، حیدرآباد سے ممتاز محقق اور ماہر دکنیات ڈاکٹر اودیش رانی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر آزرمیدخت صفوی وغیرہ شامل ہیں۔

اس موقعے پر شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سمینار کے عنوان کے انتخاب اور انعقاد پر شعبۂ فارسی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ خواتین کی ادبی خدمات میرا سب سے پسندیدہ موضوع رہا ہے اور اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ تحقیقی کام ہونا چاہیے۔ ایسے پروگراموں کے انعقاد سے دور حاضر کی خواتین کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس اعتبار سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ پروگرام کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا اور اس کے بعد ڈائرکٹر سمینار ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور سمینار کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد پروفیسر آزرمیدخت صفوی سابق ڈائرکٹر پرشین انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ ڈاکٹر اودیش رانی نے بطور مہمان خصوصی اپنے خطاب میں دکن میں فارسی ثقافت وفرہنگ کے فروغ میں حیات بخشی بیگم، ماہ لقا بائی چندا کی خدمات کا جائزہ لیا اور سماجی برائیوں جیسے جہیز اور دیگر بے جا رسومات کے خلاف آواز بلند کرنے کی ترغیب دی۔ پروفیسر کلثوم بشر سابق صدر شعبہ فارسی ڈھاکا یونیورسٹی و مادر فارسی در بنگلہ دیش نے بحیثیت مہمان اعزازی بنگلہ دیش میں فارسی ادبیات وعلوم وفنون کے فروغ میں خواتین کی خدمات کا جائزہ لیا۔ مہمان اعزازی جناب شمس الہدی شروانی صاحب نے اپنے خطاب میں سمینار کے عنوان سے متعلق نہایت فصیح انداز میں ہندوستان اور ایران میں فارسی کی نفاست ونزاکت اور تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ فارسی میں علوم وفنون اور صحافت اور سائنس کا احاطہ کیا۔ دو دن تک کل چھ ادبی اجلاس ہوئے جن میں تقریباً ساٹھ مقالے مختلف موضوعات پر پڑھے گئے۔

اس موقعے پر جن شخصیات نے شرکت فرمائی ان میں دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ فارسی پروفیسر چندر شیکھر، رایزن فرہنگی جمہوریہ ایران ممبئی جناب مہدی زادہ بی عیب، پروفیسر حسن عباس ڈائرکٹر رضا لائبریری رام پور، ڈاکٹر زرینہ پروین ڈائرکٹر آرکائوز حیدرآباد، پروفیسر آزرمیدخت صفوی اڈوائزر پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز: جنید احمد، مانو، شعبۂ فارسی، حیدرآباد، 19 مارچ 2018

ادبی سنگم اردو ہندی مشاعرہ

حیدرآباد: تنظیم ادب کا دوسرا شاندار ادبی سنگم اردو ہندی مشاعرہ اردو مسکن حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ ابتدا میں تمام مہمانان کا استقبال کیا اور مہمانان کو شہ نشین پر مدعو کیا۔ صدر تنظیم ادب سردار سلیم نے تنظیم کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہماری تنظیم کا مقصد تمام مکاتب فکر کے شعرا وادبا کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی ہر ممکن کوشش کرنا ہے۔ تنظیم کے عزائم پر روشنی ڈالتے ہوئے ماہر تعلیم فاروق طاہر نے کہا کہ سردار سلیم نے کہا کہ اس پر آشوب دور میں ادب کے نئے عزائم اور ان کے مقاصد کتنے بلند اور کتنے نیک ہیں جس کا ثبوت حیدرآباد اور اضلاع کے شعرا کی کثیر تعداد اور باذوق سامعین کا یہ ہجوم ہے۔ مسٹر مضطر مجاز صاحب کی صدارت میں تنظیم ادب کا دوسرا باوقار ادبی سنگم شروع ہوا جس میں ملک کے نامور اردو ہندی شعرا نے کلام سنایا۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے جناب ششی نارائن سوادھین، جلیل نظامی نے شرکت کی جبکہ مہمانان اعزازی کی حیثیت سے عارف الدین (حج کمیٹی ممبر)، رحیم اللہ نازی، ایڈوکیٹ اعجاز علی قریشی، محمد عبدالمقیت چندا اور درگا راج پٹن نے شرکت کی۔ نامور شعرا مضطر مجاز صلاح الدین نیر، ڈاکٹر محسن جلگانوی، حلیم بابر، جلیل نظامی (دوحہ قطر)، شکیل ظہیرآبادی، انور سلیم، قاضی اسد ثنائی، انجام شافعی، ڈاکٹر سلیم عابدی، درخشاں انجم (کلکتہ)، تسنیم جوہر، ارجمند بانو، سنیلا للا، بصیر افضل، تمجید حیدر، ممتاز لکھنوی، وحید پاشاہ قادری، فرید سحر، مسعود مرزا محشر (ورنگل)، نجیب احمد نجیب، انیس فاروقی شکیل حیدر ہریانوی، ساجدہ سنجیدہ محمد بن احمد باوزیر اور ڈاکٹر معین افروز نے اپنی خوبصورت شاعری سے سامعین کا دل موہ لیا۔ اسمٰعیل قدیر کی نعت سے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ محبوب خاں اصغر نے نظامت کی۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 12 مارچ 2018

مہاراشٹر:

قومی سائنس دن منایا گیا

سولا پور: معروف سائنس داں سی وی رمن نے 28 فروری 1928 کا ’رمن اثر‘ کی دریافت کی تھی۔ اسی مناسبت سے 28 فروری 1987 سے یہ دن ’قومی یوم سائنس‘ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ سوشل اردو ہائی اسکول میں قومی سائنس دن تزک واحتشام کے ساتھ منایا گیا۔ اس موقعے پر طلبا نے ڈرامائی انداز میں سائنسی مکالمے پیش کیے اور طلبا نے تقاریر کیں۔ ریحان ڈرگ، ابوبکر، ازکی ملا، عاکف مدیل، صاحیہ تنگھر، عافیہ ڈنڈوتی، ردارابین، نے پرجوش حصہ لیا۔ کنوینر وسائنسی قلم کار جنید شیخ نے اسی دن کی مناسبت سے طلبا کی رہنمائی کی۔ صدر جلسہ پرنسپل عبدالجبار شیخ نے طلبا کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ایسے سائنسی پروگرام منعقد کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر نائب صدر مدرس نظام سگری، سید سمیر، صادق بخشی، حاجی عثمان جمعدار، سید اظہر الدین، شعیب انگور، و دیگر اساتذہ وطلبا کثیر تعداد میں شریک تھے۔ پروگرام کو کامیاب کرنے کے لیے جنید شیخ، سلطان اختر، محمد حسین تامبولی، نے اہم کردار ادا کیا۔

پریس ریلیز: جنید، سولا پور، مہاراشٹر، 1 مارچ 2018

رسالہ ’ہندوستانی زبان‘ کے 50 سال مکمل

ممبئی: ہندوستانی پرچار سبھا کے زیر اہتمام جاری رسالہ ’ہندوستانی زبان‘ اپنے 50 سال مکمل کر رہا ہے۔ اس موقعے پر گزشتہ دنوں ہندوستانی پرچار سبھا، واقع مہاتما گاندھی میموریل بلڈنگ، چرنی روڈ پر منعقد ایک شاندار پروگرام میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے برصغیر کی مایہ ناز ادیبہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے کہا کہ ”یہ رسالہ ہندستانی زبان نہ صرف ایک ادبی رسالہ ہے بلکہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا دیرینہ ترجمان بھی ہے۔ اس کے 50 سال مکمل کرنے پر ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔“ واضح رہے کہ خود ہندوستانی پرچار سبھا نے حال ہی میں اپنے 75 سال مکمل کیے ہیں۔ جدید طرز سے منعقد کیے گئے اس پروگرام میں شہر واطراف کے ہندی اور اردو ادبا و شعرا نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ مہمانان خصوصی میں گریش پنکج نے ہندی اور اردو زبان کے میل جول پر گفتگو کی۔ انھوں نے پرچار سبھا کی سرگرمیوں کو خوب سراہا جبکہ سینئر ادیب اور مدیر پروفیسر یونس اگاسکر نے اس ادارے سے اپنی دیرینہ وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی یادوں

سے محفل کا رنگ دوچند کر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ یہاں سے بحیثیت ریسرچ فیلو اپنی شروعات کر چکے ہیں اسی لیے اس ادارے سے ان کی قلبی وابستگی ہے جو وقت کے ساتھ مزید مضبوط ہوگئی ہے۔ سکریٹری فیروز پیچ نے اگلے عزائم اگلے پروجیکٹ کی بات کہی۔

روزنامہ ’خبریں‘ دہلی، 27 مارچ 2018

اعزاز و اکرام:

185 اہم شخصیات پدم ایوارڈ سے سرفراز

نئی دہلی: کلاسیکی گلوکار غلام مصطفی، معروف موسیقار الیا راجہ، ٹینس کھلاڑی سوم دیو ورمن، معروف کہانی کار

مالتی جوشی، بیڈمنٹن کھلاڑی کدامبی سری کانت اور ہندوتوا مفکر پی رامیشورم سمیت 185 اہم شخصیات کو صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند منگل کو 2018 کے پدم ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈ یافتگان میں کیرلہ کے پادری فلیپوس مار کرائسو سٹوم بھی شامل ہیں۔ راشٹرپتی بھون کے تاریخی دربار ہال میں منعقدہ اس شاندار تقریب میں صدر جمہوریہ کے علاوہ نائب صدر وینکیا نائیڈو اور وزیر اعظم نریندر مودی سمیت حکومت کے تمام اہم عہدے دار موجود تھے۔ صدر رام ناتھ کووند نے 3 ہستیوں کو پدم وبھوشن، 9 کو پدم بھوشن اور 72 کو پدم شری ایوارڈ سے نوازا۔ اس میں ایک ایوارڈ 2 افراد کو مشترکہ طور پر دیا گیا۔ ایوارڈ یافتگان کا انتخاب وزارت داخلہ نے کیا ہے جس میں کرکٹر ایم ایس دھونی بھی شامل ہیں۔ آر ایس ایس کے سینئر نظریہ ساز 91 سالہ پی رامیشورم کو اس سے پہلے واجپئی حکومت پدم شری ایوارڈ سے نواز چکی ہے۔ منگل کو صدر کووند نے انھیں پدم وبھوشن ایوارڈ تفویض کیا۔ کووند نے منگل کو جن لوگوں کو ایوارڈ سے نوازا ان میں ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر رام چندرن ناگ سوامی، ادبی حلقہ کی معروف ہستی پروفیسر وید پرکاش نندا اور استاد ولایت خاں کے سینئر شاگردوں میں شمار ہونے والے پنڈت اروند پاریکھ شامل ہیں جنھیں پدم بھوشن سے نوازا گیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 31 مارچ 2018

پروفیسر اختر الواسع

نئی دہلی: معروف اسلامی اسکالر پروفیسر اختر الواسع کو انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے ساتویں آئی او ایس لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ جامعہ ملیہ

اسلامیہ نئی دہلی کے آڈیٹوریم میں منعقدہ اس تقریب میں پروفیسر اختر الواسع کو کشمیر کے سابق وزیر اعلی فاروق عبداللہ کے ہاتھوں اسکرول پیش کیا گیا۔ سابق چیف جسٹس آف سپریم کورٹ اے ایم احمدی نے مومنٹو پیش کیا جبکہ آئی او ایس کے چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم اور سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر شکیل احمد نے ایک لاکھ روپے کا چیک اپنے ہاتھوں سے دیا۔ آئی او ایس کی ساتویں ایوارڈ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے کہا کہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹو اسٹڈیز کی جانب سے شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے بعد لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کا سلسلہ شروع کرنے کا مقصد نوجوان کو ابھارنا اور ان میں امنگ پیدا کرنا تھا، انھوں نے کہا کہ یہ بچے مستقبل کے معمار ہیں اس لیے ہم نے صحیح راستہ دکھانے کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا تاکہ وہ قوم وملت کی خاطر نمایاں کارنامہ انجام دینے کے لیے اپنے اندر جذبہ وجنون پیدا کریں۔ مہمان خصوصی فاروق عبداللہ سابق وزیر اعلی کشمیر نے پروفیسر اختر الواسع کو ایوارڈ سے سرفراز کیے جانے پر مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ مسلمان اپنی تباہی کے لیے خود ذمے دار ہیں کیونکہ دین پر عمل کرنا انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر شکیل احمد نے آئی او ایس کے کاموں کی تعریف کی اور پروفیسر اختر الواسع کو ساتویں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے سرفراز کیے جانے پر مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 31 مارچ 2018

ڈاکٹر عبدالباری

پونا: اردو کے ادبی رسالہ ’اسباق پبلی کیشنز، پونے اور پونا کالج آف آرٹس، سائنس اور کامرس کے زیر اہتمام 10 مارچ 2018 کو منعقدہ ”اسباق ادبی ایوارڈ“ تقریب

میں اردو کے ادیب و نقاد ڈاکٹر عبدالباری اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو پونا کالج، پونے مہاراشٹر کو ان کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں سال 18-2017 کا ادبی ایوارڈ اعلی جناب منور پیر بھائی سابق صدر اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونے اور ممتاز شاعر و صحافی جناب نذیر فتح پوری کے ہاتھوں دیا گیا۔ ایوارڈ تقریب میں مقامی و بیرونی ادبا، شعرا کے علاوہ اساتذہ کرام کی کثیر تعداد موجود تھی۔

ڈاکٹر عبدالباری پچھلی دو دہائیوں سے زائد اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ موصوف ان دنوں انجمن خیرالاسلام پونا کالج آف آرٹس، سائنس اور کامرس، شعبۂ اردو میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالباری کو ادبی ایوارڈ دیے جانے پر شہر و بیرونی علمی و ادبی شخصیتوں کے علاوہ دوست احباب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے دلی مبارکباد پیش کی۔

پریس ریلیز: محمد محسن محمد رفیع خان، پونے، 11 مارچ 2018

شاہد علی خان

نئی دھلی: شاعر اور پیشے سے معالج ڈاکٹر حنیف ترین نے شاہد علی خان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ شاہد علی خان کی شخصیت قطب مینار سے زیادہ بلند نظر آتی

ہے اور ان کا قد ادب میں ہمالیہ سے اونچا ہے۔ انھوں نے یہ بات مرکز عالمی اردو مجلس کی ایک شام خادم اردو شاہد علی خان کے ساتھ کے پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی نشو و نما میں نول کشور پریس کے بعد سب سے بڑا ہاتھ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کا شاہد علی خان کی زیر سرپرستی رہا ہے۔ یہ ادارہ ان کی زندگی کا مشن تھا جو آج نئی کتاب پبلی کیشنز کی کرائے کی دوکان میں سمٹ گیا ہے۔ موصوف نے یہ بھی کہا کہ وہ نہ محقق، نہ نقاد اور نہ تخلیق کار ہیں لیکن انھوں نے تخلیق کار ضرور پیدا کیے۔ پروفیسر خالد محمود نے شاہد علی خان کے بارے میں کہا کہ میں شاہد علی خان کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ مکتبہ جامعہ کے لمیٹڈ، کے جنرل منیجر ہوا کرتے تھے۔ انھیں ایمانداری، ایثار پسندی اور رزق حلال پر اصرار جیسی نعمتیں وراثت میں ملی گئی تھیں۔ بزم کے ایک اہم مقرر حقانی القاسمی نے شاہد علی خان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ شاہد علی خان محبت کا جلی عنوان ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ اردو کے ایک ایسے خاموش خدمت گزار ہیں جنھوں نے پوری زندگی کسی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر اردو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کے لیے وقف کردی۔ مکتبہ جامعہ ان کی جد و جہد کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ پروفیسر توقیر احمد خان نے شاہد علی خان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ موصوف ایک وسیع النظر ادب نواز ہیں جنھوں نے مکتبہ جامعہ کو پورے ہندوستان میں متعارف کرایا اور یہی وجہ ہے کہ آج مکتبہ جامعہ کی شاخیں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں ہیں۔ شعیب رضا خان نے کہا کہ شاہد علی خان نے ہندوستان کو کئی استاد دیے، کئی پروفیسر پیدا کیے اور کئی تخلیق کار و ناقدین کو آگے لائے۔ آخر میں اظہار تشکر کے طور پر شاہد علی خان نے تمام مہمانوں، مقررین اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آج کی محفل کسی شاعر، ادیب، نقاد کے لیے نہیں ہے یہ محفل ایک معمولی اردو کے خدمت گار کے لیے ہے۔ اس موقعے پر شاہد علی خان صاحب کی خدمت میں مومنٹو، گلدستہ اور اعزازی سرٹیفکٹ پیش کیا گیا۔ مزید سنبھل سے آئے ہوئے مہمان سلطان کلیم سنبھلی کو بھی مومنٹو اور گلدستہ دے کر عزت دی گئی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 مارچ 2018

پروفیسر وفایزداں منش

علی گڑھ: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تہران یونیورسٹی (ایران) کی استاد معروف ادیبہ پروفیسر وفایزداں منش کی علی گڑھ آمد پر ایک استقبالیہ جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر محمد زاہد نے کی۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے وفایزداں منش نے ہندوستان اور ایران کے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا اور کہا کہ میں سرسید تحریک سے طالب علمی کے زمانے سے ہی متاثر ہوں۔ جس طرح سرسید تحریک نے ہندوستان میں علمی و ادبی خدمات انجام دیں ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے کوشش کی کہ ایران کے زبان و ادب اور اردو زبان و ادب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے کیونکہ دونوں میں بہت یکسانیت ہے۔ میری یہ بھی کوشش رہی کہ ایران میں جو آج کل ادب لکھا جارہا ہے اس کا تعارف کراؤں کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ جو رشتہ صدیوں سے ہندوستان اور ایران میں قائم ہے اسے آج کے تناظر میں سمجھا جائے اور وہ محفوظ رہے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آج ہمارے ملک ایران میں اردو کی اہمیت کو سمجھا جارہا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی دیگر اصناف اور کئی نامور ادیبوں کے فن پر بھی سیر حاصل گفتگو کی اور بتایا کہ منٹو اور بیدی سے نہایت متاثر ہیں۔ آزاد نظم کے حوالے سے ن م راشد نے بھی انھیں بہت متاثر کیا۔ وفایزداں منش صاحبہ نے لاہور پاکستان سے اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی تحقیق کا موضوع 'اردو غزلیات میں فارسی تلمیحات اور تراکیب کا لسانی و تحقیقی مطالعہ' رہا جو ایک بڑا کام ہے۔ انھوں نے ایران کے افسانوں کو اردو میں اور اردو کے افسانوں کو ایرانی زبان میں پیش کیا۔ پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ وفایزداں منش صاحبہ کو سن کر لگتا ہے کہ ان کا تعلق اردو سے بھی اتنا ہی ہے جتنا ان کا تعلق فارسی زبان و ادب سے ہے۔ صدر جلسہ پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد نے کہا کہ ان کی تخلیق میں جہاں ایرانی تہذیب جھلکتی ہے وہیں وہ ہندوستانی تہذیب و تمدن سے بھی متاثر ہیں۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز و طلبا طالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 مارچ 2018

ایم مبین کے اعزاز میں نشست

بھیونڈی: 2 اپریل 2018 بروز پیر صنوبر ٹریننگ ہال، نزد باغ فردوس مسجد، وی پی ناکہ میں اردو ہندی کے معروف ادیب ایم مبین کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے اعزاز میں ایک اعزازی نشست کا اہتمام بھیونڈی کی معروف ادبی تنظیم بزم توفیق الادب کے صدر خان فخر عالم نے کیا ہے۔ اس پروگرام میں ان کی 54 ویں کتاب، بچوں کے ڈراموں کے مجموعہ 'دان دھرم' کا اجرا عمل میں آیا، ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں بزم اور بھیونڈی کی سرکردہ شخصیات کا دستخط شدہ سپاس نامہ انھیں پیش کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت معروف

شاعر فہمی سہسرامی نے کی۔ معروف ناقد خلیق الزماں نصرت نے ایم مبین کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں بے غرضی کے ساتھ ہی زبان وادب کا کام کرنا ممکن ہے۔ اور جو بنا کسی مفاد اور غرض کے زبان اور ادب کا کام کرتا ہے وہی بہتر طور پر ادب کا کام کر پاتا ہے اس کی مثال آج ایم مبین کی 54 کتاب کا اجرا ہے۔ معروف صحافی اسعد قاسمی نے ایم مبین کے فن اور شخصیت پر اظہار خیال کیا اور ان کو بزم کی جانب سے]پیش کیا جانے والا سپاس نامہ پڑھ کر سنایا۔ بعد ازاں رضوان مسٹر (سینئر کانگریسی لیڈر) ارشد چنو، (سوشل ورکر) ڈاکٹر نیاز اعظمی۔ بلال گجراتی، برکت اللہ انصاری اور خان فخر عالم کے ہاتھوں یہ سپاس نامہ صاحب اعزاز ایم مبین کو پیش کیا گیا۔ ایم مبین کی 54 کتاب 'دان دھرم' بچوں کے ڈراموں کا مجموعہ کا اجرا رضوان مسٹر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس کے بعد منعقدہ مشاعرے کا آغاز سہیل اختر نے نعت کا نذرانہ پیش کر کے کیا۔ مشاعرہ کی نظامت معروف ناظم مشاعرے اسلم انوار اعظمی نے کی۔

پریس ریلیز: خان فخر عالم (صدر بزم توفیق الادب، بھیونڈی، مہاراشٹر)

3 اپریل 2018

اجرا:

چار کتابوں کا اجرا

علی گڑھ: کتابوں کی رسم اجرا بظاہر ایک روایتی چیز محسوس ہوتی ہے لیکن اس کی افادیت سے انکار مشکل ہے۔ رسم اجرا کے ذریعے مصنفین کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، کتابوں کی افادیت کو شہرت ملتی ہے اور پبلشرز کو وقعت واعتبار نصیب ہوتا ہے۔ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو تعلیم وتعلم کے علاوہ اپنے اساتذہ، ریسرچ سے وابستہ اسکالرز اور طلبا اور طالبات کی حوصلہ افزائی وقتاً فوقتاً رسم اجرا کے ذریعے کرتا رہا ہے اسی مناسبت سے دوروزہ قومی سمینار منعقدہ 11-10 مارچ 2018 کو چار کتابوں کی رسم اجرا کی تقریب منعقد ہوئی 'رحمتوں کے سفیر' از ڈاکٹر عبیداللہ فہد کا اجرا بدست مولانا سید جلال الدین عمری ہوا۔ یہ کتاب دراصل دینی و اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے۔ دوسری کتاب 'قیامت کبریٰ' کی رسم اجرا ڈاکٹر منظور عالم چیئر مین آبجکٹو اسٹڈیز دہلی نے کی۔ عالم عرب کے معروف اسکالر ڈاکٹر عمر سلیمان اشقر کی عربی تصنیف کا اردو قالب ڈاکٹر ضیاء الدین کی کاوش کا ثمرہ ہے۔ مصنف نے قرآن کی آیات اور صحیح احادیث کے حوالوں نیز عربی اشعار کی مدد سے قیامت کی منظر کشی کی ہے۔ قیامت کبریٰ مسلم یونیورسٹی کے پبلی کیشنز

چار کتابوں کا اجرا

ڈویژن سے شائع ہوچکی ہے۔ مترجم کتاب کو اس سے قبل برمنگھم کے پروفیسر محمد اسمٰعیل سورتی کی انگریزی کتاب کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا اعزاز حاصل ہوچکا ہے جو برمنگھم سے 'اسلام کا نظام قضاء مطالعات' کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے۔ تیسری کتاب 'مجلۂ علوم اسلامیہ' کے مدیر اعلیٰ پروفیسر عبیداللہ فہد ہیں جبکہ عبدالحمید فاضلی اس کے مدیر ہیں اور ڈاکٹر ضیاء الدین نے مدیر رفیق کی ذمے داری نبھائی۔ اس جریدے کی رسم اجرا معروف سیرت نگار اور سابق صدر شعبہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے کی۔ شعبہ کا انگریزی آرگن 'جزنل آف دی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز' کا 44واں ایڈیشن پوری علمی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کی رسم اجرا شیخ الجامعہ پروفیسر طارق منصور کے بدست ہوئی۔ سمینار کی مناسبت سے شیخ الجامعہ نے اسلامی میراث کی حفاظت کو سنجیدہ کوشش قرار دیتے ہوئے ان چاروں تخلیقات کا خیر مقدم کیا اور شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں ہونے والی صحت مند علمی کوششوں کو اپنا تعاون پیش کرنے کا وعدہ فرمایا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 مارچ 2018

ادبی نشیمن

لکھنؤ: اترپردیش کے گورنر رام نائک نے راج بھون میں اردو سہ ماہی 'ادبی نشیمن' کی جانب سے شائع انور جلال پوری پر خصوصی شمارے کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر گورنر کی پرنسپل سکریٹری محترمہ جوتھیکا پاٹنکر، رسالے کے ایڈیٹر ڈاکٹر سلیم احمد، ادبی صلاح کار رفعت عزمی، ڈاکٹر قدسیہ بانو، ڈاکٹر بشریٰ بانو، رفیق احمد اور حبیب الزماں موجود تھے۔ گورنر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس بات کی تکلیف ہے کہ انور جلال پوری کو پدم شری ایوارڈ دینے کا اعلان ان کے انتقال کے بعد ہوا۔ راج بھون میں پدم شری ایوارڈ سے نوازے جانے والی عظیم شخصیتوں کی مہمان نوازی کا پروگرام رکھا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انور جلال پوری سے کئی بار ملنے کا انھیں موقع ملا ہے۔ اردو رائٹرز فورم کی طرف سے کتاب چریویتی! چریویتی!! پر منعقد مباحثہ میں انور جلال پوری کو سننے کا موقع ملا تھا۔ انور جلال پوری پر خصوصی شمارے کی اشاعت کر نا ان کو حقیقی خراج عقیدت دینے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ گورنر موصوف نے کہا کہ اردو کسی خاص طبقے کی زبان نہیں ہے۔ لوگوں کو شاید پوری معلومات نہیں ہے، اردو کو فروغ دینے میں ہندو اور مسلمانوں نے مشترکہ طور سے کام کیا ہے۔ ہندی کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اردو ہے۔ تقریباً ہر ریاست میں اردو بولنے والے لوگ ملیں گے۔ گورنر نے کہا کہ انھوں نے راج بھون کے تمام گیٹ پر ہندی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں راج بھون اور گیٹ نمبر درج کرایا ہے۔ اسی کے مدنظر انھوں نے وزرا کو دلائی جانے والی حلف برداری کو بھی اردو زبان میں تیار کرایا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایک اچھی زبان ہے۔ اسے آگے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ رسم اجرا کے اس موقعے پر رسالے کے مدیر ڈاکٹر سلیم احمد نے بتایا کہ یہ جریدہ مکمل طور پر ادبی ہے جس کا یہ شمارہ مشہور ناظم مرحوم انور جلال پوری پر مرکوز ہے جس میں ملک کے نامور قلمکاروں کے مضمون شامل کیے گئے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 مارچ 2018

ہندوستانی اشاراتی زبان کی پہلی لغت

نئی دہلی: سماجی انصاف اور تفویض اختیارات کے مرکزی وزیر تھاور چند گہلوت نے ایک تقریب میں 3000 الفاظ پر مشتمل ہندوستانی اشاراتی زبان کی پہلی لغت کا اجرا کیا۔ یہ لغت سماجی انصاف اور تفویض اختیارات کی وزارت کے تحت معذور افراد کو با اختیار بنانے کے محکمے (ڈی ای پی ڈبلیو ڈی) کے اشاراتی زبان کی تحقیق اور تربیت کے ہندوستانی مرکز (آئی ایس ایل آر اینڈ ٹی سی) نے تیار کی ہے۔ سماجی انصاف اور تفویض اختیارات کے وزیر مملکت کرشن پال گوجر اور رام داس اٹھاؤلے اور کرشن پال گورجر بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے تھاور چند گہلوت نے

کہا کہ آئی ایس ایل لغت تیار کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ گونگے اور بہروں کی برادریوں کے درمیان مواصلاتی رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ جیسا کہ اس بات پر توجہ دی گئی ہے کہ ہندوستانی اشاراتی زبان کی مزید معلومات فراہم کی جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ سماعت سے معذور افراد کو اظہار رائے کی آزادی کے آئینی حقوق دیے جائیں اور انھیں سماج کے اصل دھارے میں شامل کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ جلد ہی اس لغت میں نئے الفاظ بھی شامل کیے جائیں گے۔ آئی ایس ایل ڈکشنری میں ہندوستانی اشاراتی زبان کی مزید معلومات فراہم کرنے پر توجہ دی گئی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ اس لغت کو زیادہ سے زیادہ لوگ استعمال کریں گے اور ہندوستانی اشاراتی زبان سیکھنے کا فائدہ اٹھائیں گے۔ آئی ایس ایل آر اینڈ ٹی سی پچھلے ڈیڑھ سال سے ہندوستانی اشاراتی زبان کی لغت تیار کرنے کے پروجیکٹ پر کام کر رہی ہے جو ایک خواب تھا۔ سال 2011 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں 50,71,007 سماعت سے معذور افراد اور 19,98,535 افراد بولنے سے معذور ہیں۔ آئی ایس ایل آر اینڈ ٹی سی نے نئی دہلی میں صورت حال کی گہرائی اور عام بات چیت میں سماعت سے معذور افراد کی بڑی تعداد کو درپیش ان معاملات کو سمجھا۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 مارچ 2018

آزادمیل ڈاٹ کام کا اجرا

آزادمیل ڈاٹ کام کا اجرا

لکھنؤ: 4اپریل،خبروں کو سچائی اور غیر جانبداری سے پیش کرنا صحافت کا اولین مقصد ہونا چاہیے۔ عوامی مسائل کو اٹھانا اور انسانیت کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دینا ہی اصل صحافت ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز ناقد پروفیسر شارب ردولوی نے مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن میں آزادمیل میڈیا گروپ کے اردو-ہندی نیوز پورٹل آزادمیل ڈاٹ کام کے افتتاح کے موقعے پر منعقد مذاکرہ بعنوان 'عصر حاضر میں میڈیا کا کردار' پر خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس سے پہلے قاری شہاب اللہ صدیقی نے تلاوت کلام سے پروگرام کا آغاز کیا۔ نظامت کے فرائض صحافی و ادیب ڈاکٹر ہارون رشید نے انجام دیے۔ پورٹل کا افتتاح کرنے کے بعد پروفیسر شارب نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ 'آزادمیل' صحافت میں نیا قدم ہے اور اس کے ارباب حل وعقد قابل مبارکباد ہیں کہ وہ زمانہ کے قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غیر جانبدار پورٹل ہی عوام کے جذبات کی سچی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ اسلامی قانون کے ماہر اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی دارالقضا کمیٹی کے کنوینر مفتی عتیق احمد قاسمی بستوی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آزادمیل نیوز پورٹل کا افتتاح ایک خوش آئند قدم ہے۔ منکامیشور مندر کی مہنت محترمہ دیویہ گری نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پرنٹ میڈیا کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ آپ اخبار کا تراشہ کئی نسلوں تک محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میڈیا کا رول ہر زمانے میں اہم رہا ہے۔ ہمارے مجاہدین آزادی نے جیلوں سے صحافت کے ذریعے آزادی کی جنگ لڑی ہے۔ آج اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ سینئر صحافی رضوان چنچل نے کلیدی خطبہ میڈیا کے مختلف روپ پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خصوصیات بیان کیں۔

'آزادمیل ڈاٹ کام' کے ایڈیٹر محمد وصی اللہ حسینی نے ادارے کے اغراض ومقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آزادمیڈ میڈیا گروپ کا اردو-ہندی نیوز پورٹ، آزاد میل ڈاٹ کام بھی ویب جرنلزم کا ایک حصہ ہے۔ وقت کی آواز پر ہم نے یہ قدم اٹھایا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ یہ ایک آزاد پلیٹ فارم ہے جہاں سب کو اپنی بات رکھنے کا موقع دیا جائے گا۔ بس شرط یہ ہوگی کہ ان کی تحریریں زبان وبیان کے لحاظ سے معیاری ہوں اور ان سے کسی فرد، ذات، مذہب، مسلک، سماج، فرقے اور طبقے کی توہین اور دل آزاری نہ ہوتی ہو۔ نفرت انگیز، اشتعال انگیز، جذباتی، فحش اور غیر اخلاقی مواد کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ پورٹل کے جوائنٹ ایڈیٹر اعجاز احمد ندوی نے کلمات تشکر ادا کیے۔

روزنامہ'اودھ نامہ' لکھنؤ، 5اپریل 2018

دلی والی

نئی دھلی: عالمی یوم شاعری کے موقعے پر معروف شاعرہ ومصنفہ بشریٰ علوی رزاق کی تحریر کردہ کتاب 'دلی والی' دہلی کی خواتین کا شاعری کے ذریعے جشن، کی رسم اجرا تقریب نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد کی گئی جس میں متعدد شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ شخصیات موجود تھیں۔ کتاب کا اجرا معروف مورخ رخشندہ جلیل، معروف مصنفہ رعنا صفوی، مشہور سائنٹسٹ گوہر رضا، آئی آئی سی سی آر کے سابق ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر امریندر کھتوا، امت رنجن، اجیتا پرسورام کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ آتھرز پریس کے ذریعے اشاعتی کتاب کی رسم تقریب کی نظامت جرنلسٹ لبنیٰ عرفان نے کی۔ اہم شرکا میں دہلی ہائی کورٹ کے جج نجمی وسیری، سماجی کارکن شبنم ہاشمی، حکیم ام الفضل، پروفیسر عذرا، مسز ایم آشا، سدرشن کیچری ودیگر کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 مارچ 2018

مظہرامام

دربھنگہ: الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ گنگوارہ، دربھنگہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتاب 'مظہرامام' کی رسم اجرا اور تقریب رونمائی پروفیسر سید منظر امام (سابق صدر شعبۂ اردو گرونانک کالج دھنباد) کے دست مبارک سے انجام پائی۔ اس تقریب کی صدارت معروف شاعر و ادیب پروفیسر شاکر خلیق (سابق صدر شعبۂ اردو متھلا یونیورسٹی دربھنگہ) نے کی اور پروفیسر رئیس انور، پروفیسر ایم نہال اور ڈاکٹر نجیب اختر مہمانان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ اس موقعے پر شرکائے تقریب نے کتاب کے مشمولات ومواد اور مظہر امام مرحوم کی شخصیت ان کے فکر و فن اور شعری وادبی خدمات پر ناقدانہ گفتگو کی۔ سب سے پہلے مرتب کتاب ڈاکٹر امام اعظم نے کتاب کا مبسوط انداز میں تعارف کرایا اور مظہر امام کے ساتھ وابستہ اپنی نجی یادوں، خاندانی مراسم اور مظہر امام کی ادبی زندگی کے مختلف مرحلوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اتر پردیش اردو اکادمی اور اس کے کارکنان وعہدے داران کا شکریہ ادا کرنا ہم تمام افراد خصوصاً باشندگان ریاست بہار کا اخلاقی فریضہ ہے کہ انھوں نے مظہر امام مرحوم کی شخصیت اور فکر و فن پر اس مونوگراف کی اشاعت کو اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ابرار اجراوی نے کتاب اور مظہر امام صاحب کے فکر وفن اور شاعری وشخصیت پر اپنے مختصر تاثرات پیش کیے۔ اس موقعے پر اظہار خیال

کرتے ہوئے فخرالدین علی احمد ٹیچرس ٹریننگ کالج کے ڈائرکٹر، ماہر تعلیم اور ادیب ڈاکٹر نجیب اختر نے کہا کہ مظہرامام کے ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں، انھوں نے شاعری یا نثرنگاری کسی نمود ونمائش کے لیے نہیں، بلکہ زبان وادب کی خدمت سمجھ کر کی۔ انھوں نے صلے اور ستائش کی پروا کیے بغیر بہار سے لے کر کلکتہ اور کشمیر تک اردو زبان وادب کی تشہیر وترویج کی، اس لیے انھیں زبان وادب کے ہر حلقے میں پذیرائی ملی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 مارچ 2018

وفیات:

پروفیسر سید محمود الحسن رضوی

لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر سید محمود الحسن رضوی کا 10 مارچ کو کمانڈ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کچھ دنوں سے بیمار چل رہے

تھے۔ بعد نماز مغرب کربلا امداد حسین میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ مولانا کلب عباس نے ادا کی۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ مرحوم کے بیٹے فوج میں میجر اور اہلیہ کانپور میں ڈگری کالج میں تدریس سے وابستہ تھیں۔ مرحوم نے الہ آباد یونیورسٹی اور بی ایچ یو کے شعبہ اردو میں بحیثیت لکچرر تدریسی خدمات انجام دی تھیں۔ آل انڈیا کیفی اکادمی میں پروفیسر محمود الحسن کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ اکادمی کے جنرل سکریٹری ثروت مہدی کی صدارت میں ہوا جس میں مرحوم کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کی گئی۔ کیفی اکادمی کی سرپرست مشہور فلم اداکارہ شبانہ اعظمی نے پروفیسر محمود الحسن کے انتقال کی خبر سن کر کنیڈا سے ٹیلی فون کے ذریعے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ یہ اردو ادب اور کیفی اکادمی کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 مارچ 2018

جعفر ساہنی

کولکاتا: اردو کے ممتاز شاعر جناب جعفری ساہنی کا 11 مارچ کو کولکاتا میں انتقال ہوگیا۔ جعفر ساہنی 5 جنوری 1941 کو لکھمنیاں (بیگوسرائے) میں پیدا ہوئے۔ البتہ انھوں

نے زندگی کے زیادہ تر ایام شہر نشاط کلکتہ ہی میں گزارے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی انھوں نے کلکتہ ہی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ادھر کافی دنوں سے معذوری بڑھ گئی تھی، یہاں تک کہ جمعہ کی نماز کے لیے بھی مسجد جانا مشکل ہوگیا تھا۔ پسماندگان میں تین بیٹوں کے علاوہ دو بیٹیاں بھی ہیں، اہلیہ پچھلے سال انتقال کرچکی تھیں۔ ان کے دو شعری مجموعے 'ہوا کے شامیانے میں' اور 'شاید' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے ذریعے بالترتیب 2010 اور 2012 میں شائع ہوئے۔ دونوں ہی مجموعے ادب نواز حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 12 مارچ 2018

معروف سائنس داں اسٹیفن ہاکنگ

لندن: آئن اسٹائن کے بعد دنیا کے دوسرے مشہور ترین سائنس داں قرار دیے جانے والے اسٹیفن ڈبلیو ہاکنگ 76 برس کی عمر میں انتقال کرگئے۔ ہاکنگ کے خاندانی

ترجمان نے ان کے انتقال کی تصدیق کردی ہے۔ عالمی شہرت یافتہ سائنس داں اسٹیفن ہاکنگ 8 جنوری 1942 کو برطانوی شہر آکسفورڈ میں پیدا ہوئے۔ 1963 میں ہاکنگ موٹر نیورون بیماری کا شکار ہوئے جس کی وجہ سے نہ تو وہ حرکت کرسکتے تھے اور نہ ہی بول سکتے تھے، لیکن دماغی طور پر صحت مند تھے۔ 1988 میں اپنی تصنیف 'اے بریف ہسٹری آف ٹائم' سے ساری دنیا میں مقبولیت حاصل کی اور بیسویں صدی میں آئن اسٹائن کے بعد دوسرے مقبول ترین سائنس داں کا اعزاز حاصل کیا۔ ہاکنگ نے ایک چیلنج دنیائے طبعیات کو بھی دیا۔ انھوں نے وقت میں سفر (ٹائم ٹریول) کے روکنے کے لیے قوانین طبعیات کی روشنی میں ایک نظریہ 'تحفظ تقویم' پیش کیا تھا، تاکہ گزرے ہوئے وقت (تاریخ) کو دخل اندازی سے بچاتے ہوئے حال کا تحفظ کیا جاسکے۔ بلیک ہول اور ٹائم مشین، دو ایسے پیچیدہ ریاضیاتی موضوعات ہیں، جن پر تحقیق سے اسٹیفن ہاکنگ نے دنیا بھر میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ اسٹیفن ہاکنگ نے کونیات (کوسمولوجی) کے بارے میں جدید ترین سائنسی تحقیقات پہلی بار 1988 میں اپنی تصنیف 'اے بریف ہسٹری آف ٹائم' کی شکل میں پیش کیں، جو انتہائی عام فہم زبان میں تھی اور جس نے سائنسی کتابوں میں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔

بعد ازاں 2006 میں 'اے بریف ہسٹری آف ٹائم' نامی کتاب میں انھوں نے اکیسویں صدی کی ابتدا تک کونیات کے دقیق شعبوں میں ہونے والی تحقیق کو ایک بار پھر انتہائی آسان فہم انداز میں پیش کیا، جسے بلاشبہ 'بریف ہسٹری آف ٹائم' کا دوسرا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ برس برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کی جانب سے اسٹیفن ہاکنگ کا 1966 میں لکھا گیا پی ایچ ڈی کا مقالہ جاری کیا گیا، جس نے چند ہی دن میں مطالعے کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 مارچ 2018

کیدارناتھ سنگھ

نئی دھلی: ہندی کے سینئر شاعر کیدارناتھ سنگھ 19 مارچ کا دہلی میں انتقال ہوگیا۔ پیٹ میں انفیکشن کی شکایت کے بعد انھیں ایمس میں داخل کرایا گیا تھا، جہاں انھوں نے رات پونے نو بجے آخری سانس لی۔ وہ 85 سال کے تھے۔ ان کی 20 مارچ کو دہلی کے لودھی روڈ پر واقع شمشان گھاٹ میں آخری رسم ادا کی گئی۔ کیدارناتھ سنگھ کی پیدائش 1934 میں اترپردیش کے بلیا ضلع کے چکیا گاؤں میں ہوئی

تھی۔ انھوں نے کاشی ہندو یونیورسٹی سے 1956 میں ہندی میں ایم اے اور 1964 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے انتقال سے ادبی دنیا سوگوار ہوگئی ہے۔ گورکھپور میں انھوں نے کچھ دن ہندی پڑھائی تھی اور جواہر لعل یونیورسٹی سے انگریزی زبان کے سیکشن کے صدر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے۔ انھیں کئی ممتاز اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مارچ 2018

خراج عقیدت:

محمد ابوالفضل فاروقی

نئی دہلی: عالمی یوم اردو آرگنائزنگ کمیٹی کی جانب سے جامعہ نگر، نئی دہلی میں واقع ابوالفضل انکلیو اور ابوالفضل اپارٹمنٹ

کے بانی محمد ابوالفضل فاروقی (پیدائش 26 اگست 1940 — وفات 24 مارچ 2018) کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست کا اہتمام دریا گنج، نئی دہلی میں کیا گیا۔ اظہار تعزیت کرتے ہوئے عالمی یوم اردو آرگنائزنگ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ وہ ہماری تحریک کے سرپرستوں میں شامل تھے۔ مرحوم انتہائی ملنسار، مخیر اور خداترس انسان تھے۔ عام طور سے سماجی اور رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری اور اس کے حصول کے لیے آخری دم تک کوشاں رہے۔ انھوں نے اپنی سوانح حیات 'نشیب و فراز' کے نام سے جنوری 2000 میں شائع کرائی تھی جسے اردو بک ریویو کے ایڈیٹر محمد عارف اقبال نے ایڈٹ کیا تھا۔ انھوں نے اس کتاب میں سوانح عمری کے علاوہ کاروباری زندگی، تلخ و شیریں واقعات، تجربات و احساسات کو بحسن و خوبی بیان کیا ہے، نیز پراپرٹی خرید و فروخت کرنے والوں کے لیے بھی اہم معلومات کو شامل کیا ہے۔ معروف صحافی سید منصور آغا نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ محمد ابوالفضل فاروقی مرحوم جیسے افراد بہت کم نظر آتے ہیں جن کی بدولت دہلی کے جامعہ نگر علاقے میں مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی قائم ہوگئی جس میں بے شمار تعلیمی ادارے اور مدارس کے علاوہ 35 سے زیادہ مساجد ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 مارچ 2018

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر........................... بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام: ....

پتہ: ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

دستخط

پانچویں عالمی کانفرنس کی تصویری جھلکیاں

URDU DUNIYA Monthly, May-2018, Vol.20, Issue:05
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/04/2018
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025